سخنورانِ گجرات

سید ظہیر الدین مدنی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

Sukhanwaran-e-Gujrat

By : Syed Zaheeruddin Madani

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت :

پہلا اڈیشن : 1981

دوسرا اڈیشن : 1999 تعداد 1100

قیمت : -/77

سلسلۂ مطبوعات : 238

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم،
نئی دہلی-110066

طابع : میکاف پرنٹرس، ترکمان گیٹ، دہلی-006 110

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

اظہار ممنونیت

اس موقع پر والدین، اساتذہ اور چند مخلص احباب کے احسانوں کی یاد میرے جذبۂ احسان شناسی کے لئے باعث تسکین ہوگی۔ میرا ذہنی ارتقاء ان سب کے خلوص و محبت کا نتیجہ ہے۔ والدین نے میری پرورش و پرداخت میں جو زحمت اٹھائی اس کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ میری تربیت میں بطور خاص دونوں نے دلچسپی لی اور ہر موقع محل سے انسانیت کی بلندیوں، عمل پیہم کی اہمیت اور اکتساب علم کی ضرورت اور برکتوں کو اس طرح ذہن نشین کراتے رہے کہ میرے حوصلے کبھی پست نہ ہونے پائے۔ ابتدائی دور میں میرے ادبی شعور کو تربیت کرنے میں انہیں دونوں کا بڑا حصہ ہے۔ اولاد کے لئے والدین کی نصیحتوں کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں سب سے اہم نصیحت یہ کی گئی کہ کسی بھی شعبۂ حیات میں دوسروں کی خدمت کرنے کا چھوٹے سے چھوٹا موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ دینا اسی میں انسانی عظمت کا راز پنہاں ہے۔ اگرچہ میں نے ہمیشہ ان کی پسند اور ان کے حکم و ارادہ کو اپنی رضا و رغبت پر ترجیح دینا اپنا شعار بنالیا تھا تاہم دل کہتا ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ ان دونوں نے اونچے اونچے ہاتھ کرکے دامن پھیلا پھیلا کر اور سر بسجود ہوکر اللہ سے میرے لئے جو کچھ مانگا وہ سب کچھ مجھے ملا۔

مجھے اپنے اساتذہ کے خلوص و محبت کی بے شمار برکتیں حاصل ہوئیں۔ بعض اساتذہ نے مجھے میری ہمت و حوصلہ کے عین مطابق عطا کیا اور بعضوں نے مجھے اتنا نوازنا چاہا کہ میں کوتاہیٔ دامن کو روتا رہا۔ پرائمری منزل کے مدرسین میں سے جناب شرف الدین صاحب اکثر یاد آتے

ہیں۔ وہ عالم وادیب نہیں تھے لیکن مجھے عالم وادیب دیکھنے کے آرزومند تھے ثانوی اسکول کے اساتذہ میں سے فارسی کے استاد مسٹر فرام جی مستری اور ابتدائی درجوں میں انگریزی کے استاد مسٹر سٹیپونسن کی شفقتیں اور نصیحتیں یاد آتی ہیں۔ جب کبھی ان اساتذہ کو مجھ میں کسی قسم کی بے راہ روی یا حصول علم میں کوتاہی نظر آتی تو محبت، نصیحت اور ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیتے اور میرے خاندان کا لیبل دکھا کر غیرت دلاتے۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے عموماً چار سال کا دور مقرر کیا جاتا ہے لیکن میں چالیس سال سے اب تک اسی دور میں چکر لگا رہا ہوں۔ اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں پروفیسر تفضل حسین صاحب شمسی کا نام سرفہرست ہے۔ شمسی صاحب بوہرہ جماعت کے ایک معزز عالم خاندان کے فرد تھے۔ عربی ان کا خاص مضمون تھا لیکن دلی میں اُردو کی تعلیم حاصل کی تھی۔ موصوف شاعر بھی تھے۔ آغا شاعر دہلوی سے تلمذ حاصل تھا۔ سورت کے ایم۔ ٹی۔ بی کالج میں اعزازی طور پر عربی پڑھاتے تھے۔ کالج میں اُردو مضمون پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ۱۹۲۵ء میں شمسی صاحب اور راقم کی جدوجہد سے بی۔ اے کے نصاب میں اُردو مضمون کا اضافہ کیا گیا۔ اس پاک تحریک کے سلسلہ میں مخالفین کی تیغ زبان کے بہت چرکے سہے ان کی غضب آلود نظروں نے خوب جھلسا لیکن خوش ہوتے رہے کہ ایک مبارک کام انجام پا گیا۔ اس کالج کا اُردو میں پہلا گریجویٹ ہونے کا فخر راقم کو حاصل ہے۔

جہاں تک پی۔ ایچ ڈی کے مقالہ کا تعلق ہے ڈاکٹر بدل الرحمٰن پرنسپل اسماعیل یوسف کالج بمبئی، پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی اور پروفیسر محمد ابراہیم صاحب ڈار کا مرہون منت ہوں۔ ڈاکٹر رحمٰن صاحب اور ندوی صاحب کے نیازمندوں میں ۱۹۳۲ء سے شامل رہا۔ ۱۹۳۹ء میں ایم۔ اے کا نتیجہ نکلنے کے بعد سلام و نیاز کی غرض سے کالج پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب نے دیکھتے ہی فرمایا چلئے! اب پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے فارم بھر دیجئے۔ تقریباً دو گھنٹے تک میں اپنی بے بضاعتی و کم مائیگی کا اظہار کرتا رہا اور موصوف کبھی بزرگانہ اور کبھی دوستانہ طریقہ پر اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے رہے اور جب میں نے حکم کی تعمیل کا وعدہ کر لیا تو مجھے جانے کی اجازت دی۔

اگرچہ ندوی صاحب یونیورسٹی کی جانب سے میرے کام کے لئے نگراں مقرر کئے گئے تھے لیکن نگراں کے فرائض ڈاکٹر رحمٰن انجام دے رہے تھے۔ اگر یہ کہوں تو بجا نہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب

میرے ہی نہیں بلکہ ندوی صاحب کے بھی نگراں تھے۔ مجھے ہر ماہ اپنے کام کی رپورٹ ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کرنی ہوتی تھی۔ ندوی صاحب لغوی معنوں میں نگراں تھے۔ وہ دور سے دیکھتے رہتے کہ میں کیا کرتا ہوں مختلف کمیٹیوں کی رکنیت اور آئے دن کی میٹنگوں کی مصروفیت نے انہیں علمی ادبی کام کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ افسوس ہوتا ہے کہ ایک صاحب فکر ونظر کی صلاحیتوں سے اردو زبان وادب محروم رہے۔ بہر حال بمبئی یونیورسٹی میں اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا پہلا نگراں ہونے کا انہیں اور پہلا پی۔ ایچ ڈی ہونے کا فخر مجھے حاصل ہے۔ پروفیسر محمد ابراہیم صاحب ڈار سے پہلی مرتبہ ۱۹۴۶ء میں نیاز حاصل ہوا جب موصوف اسماعیل کالج سے احمد آباد کالج تشریف لائے ڈار صاحب میرے ہمدرد اور مخلص دوست تھے۔ میں انہیں اپنا استاد گردانتا ہوں۔ میرے ادبی کاموں میں موصوف بطور خاص دلچسپی لیتے تھے۔ مجھے اپنی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ انہیں سکھایا۔

بعض فنون میں بھی چند ماہر فن استادوں سے تربیت پانے کا موقع ملا ہے۔ ۱۹۴۰ء سے شعرگوئی کی طرف میری طبیعت مائل ہوئی تھی۔ سورت کے ایک استاد شاعر محمد صادق صاحب زار والے التخلص صادق سے مشورۂ سخن کرتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ شوق ماحول کے اثر سے ابھر آیا تھا یا فطرت کے کسی گوشہ میں صلاحیت چھپی ہوئی تھی جو ماحول کے اثر سے اوپر آگئی کیونکہ میدان عمل کے بدلنے کے ساتھ یہ شوق ماند پڑگیا۔ اس شعرگوئی کی عمر صرف پندرہ سال قرار دی جا سکتی ہے۔ گویا جوان ہونے بھی نہ پائی تھی کہ مرگئی۔ اس کی ناگہانی موت پر افسوس نہ ہوا کیونکہ یہ کچھ ایسی ہونہار بھی نہ تھی۔ فن موسیقی کا شوق فطرت میں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ اس فن میں تین استادوں کے زیر احسان ہوں۔ جناب صادق شعرگوئی کے علاوہ موسیقی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان سے ساز کی تعلیم لی۔ ایک مراثی استاد جناب مشتاق نے طبلہ نوازی کی مشق کرائی اور ایک مشہور گانک طوائف عیدن بائی نے گانا سکھلایا۔ عیدن بائی ماہرین فن میں شمار کی جاتی تھیں۔ خاں صاحب عبدالکریم خاں اور خاں صاحب نصیر الدین خان جیسے استادوں سے داد فن حاصل کر چکی تھیں۔ ایک مدت تک بین کار عبدالعزیز خاں پٹیالے والے بائی کے ساتھ سارنگی پر سنگت کرتے رہے۔ بدقسمتی سے عیدن بائی اپنی بیٹی کے انتقال کی وجہ سے مرض جنون وخفقان میں مبتلا ہوگئی تھیں اور جب عبدالعزیز خان کو بائی کے اچھے ہونے کی امید نظر نہ آئی تو یہ کہہ کر اپنی سارنگی توڑ دی کہ یہ بجتی تو عیدن ہی کی سنگت میں بجتی اس کے بعد سورت کو خیر باد کہدیا۔ کئی سال کے بعد عیدن بائی نے مرض سے نجات پائی تھی۔ مانگرول ریاست (کاٹھیاواڑ) کے نواب حسین میاں صاحب موسیقی میں ید طولیٰ

رکھتے تھے۔ موصوف نے نامی گرامی استادانِ فن کو جمع کر رکھا تھا۔ عیدن بائی بھی سولہ سال کی عمر سے ان کے دربار سے منسلک تھی۔ انہیں نے بائی کو موسیقی میں اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ عیدن بائی کا آخری زمانہ بڑی عسرت میں گذرا۔ تقریباً اسی سال کی عمر میں بمقام سورت وفات پائی۔ دس گیارہ سال کی عمر میں راقم نے بانا، بنوٹ، چھڑی پٹا وغیرہ کی تعلیم حاصل کر کے یہ شوق بھی پورا کیا۔ اس فن میں سورت کے ایک بنارسی استاد نامر بھیّو کا مجھ پر احسان ہے۔ میری ذہنی تربیت میں مذکورہ بالا تمام بزرگوں کا اہم حصہ ہے۔ یہ سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اللہ ان کی قبریں ٹھنڈی رکھے آمین۔

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب، جناب قاضی عبدالودود بار ایٹ لا اور مولانا میر محمد شہاب مالیر کوٹلوی مرحوم نے بھی مختلف طریقوں پر اپنی ادبی اعانت سے راقم کے دل و دماغ کے تاریک گوشوں کو روشن کر کے بڑا احسان کیا ہے۔ ان بزرگوں کے علمی ادبی ذوق و شوق اور انہماک سے میں ہمیشہ متاثر رہا ہوں۔ بابائے اردو سے پہلی بار ۱۹۳۹ء میں نیاز حاصل ہوا موصوف کے پاکستان چلے جانے کے بعد بھی ان کے خلوص و محبت میں فرق نہ آنے پایا اور راقم کی ادبی رہبری میں کبھی پہلو تہی نہ کی۔ قاضی عبدالودود صاحب کے نیاز مندوں میں ۱۹۵۰ء سے شامل ہوں۔ قاضی صاحب کے مشورے اور تلاش و تحقیق کے نکات کی تعلیم میرے لئے ہمیشہ مشعل راہ بنے رہے۔ قاضی صاحب ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء میں بمبئی تشریف لائے تھے۔ ایک ماہ سے اوپر قیام فرمایا تھا۔ میں نے اس زریں موقع سے بہت فیض اٹھایا۔ مولانا شہاب مرحوم سے اپنے ثانوی تعلیم کے عہد سے نیاز مندی کے موقع ملتے رہے تھے۔ مولانا کے فضل و کمال سے میں نے اکثر فیض اٹھایا ہے۔ ان کی بزرگانہ شفقت اکثر یاد آتی ہے۔

احباب میں مرحوم ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر نورالحسن صاحب ہاشمی، سید مطیع اللہ راشد برہانپوری، جناب عبدالقادر نورالدین منیجر حکیم جی جی فارسی سورت، جناب عبدالرزاق صاحب قریشی ریسرچ اسسٹنٹ بمبئی وغیرہ کے ادبی مشورے اور حوصلہ افزائی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ راقم اور ڈاکٹر زور کے درمیان ولی کی ولدیت کے بارے میں اختلاف رائے تھا لیکن یہ اختلاف ادب و تحقیق تک محدود تھا۔ مرحوم میرے ایک مخلص دوست تھے۔ موصوف جب بھی بمبئی تشریف لائے تو میرے ہی غریب خانہ پر قیام فرمایا۔ وہ ایسے بے تکلف دوست تھے کہ گنج کی باتیں بھی

کبھی مجھ سے پوشیدہ نہیں رکھتے تھے۔ ڈاکٹر ہاشمی صاحب سے تقریباً پچیس سال سے متعارف ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ ایک مہذب شریف الطبع انسان جس کی تعریف بیان سے باہر ہے میرا محسب ہے۔ علمی ادبی اعانت کے علاوہ میرے ہر دکھ درد میں موصوف کی ہمدردیاں اور مشورے میرے لئے تسلی و تشفی کا باعث ثابت ہوئے عبدالقادر صاحب اور قریشی صاحب میرے مخلص بہی خواہوں میں سے ہیں۔ ادبی کاموں میں ان احباب کے صائب مشورے بہت مفید ثابت ہوئے ہیں ٭

دیباچہ

گجرات کی صوبائی زبان گجراتی ہے۔ گجراتی کے بعد اس صوبے میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان اُردو ہے۔ ہندوؤں کی زبان گجراتی ہے اور مسلمانوں کی مادری، مذہبی اور تہذیبی زبان اُردو ہے۔ اگرچہ ہندو گجراتی بولتے ہیں مگر یہ لوگ اُردو بخوبی سمجھ لیتے ہیں اور بوقت ضرورت بول بھی لیتے ہیں بمعزز اور تعلیم یافتہ مسلم طبقہ کے لوگ صاف اُردو بولتے ہیں جو اہل زبان کی اُردو سے زیادہ مختلف نہیں۔ لب ولہجہ کی وجہ سے گجراتیت نمایاں ہوتی ہے۔ سورت، بھروچ، بڑودہ، احمد آباد سوراشٹر وغیرہ میں اُردو وہاں کی علاقائی گجراتی کے محاورے اور لہجہ سے متاثر پائی جاتی ہے۔ گجرات میں بولی جانے والی اُردو ہر چند اہل زبان کے لب ولہجہ سے قدرے مختلف سہی لیکن اس کو اُردو ہی کہا جائے گا۔ جس طرح داؤدی بوہرا جماعت میں عربی آمیز گجراتی رائج ہے اور پارسی قوم میں فارسی آمیز گجراتی بولی جاتی ہے مگر دونوں کو گجراتی یا گجراتی کی مختلف شاخیں کہا جاتا ہے۔

اُردو زبان کی تاریخ کے سلسلہ میں شواہد سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گجرات میں ایک مخلوط بولی کا آغاز آٹھویں صدی عیسوی سے ہو چکا تھا اور یہ گمان غالب ہے کہ بعد میں پنجاب، دہلی اور گجرات کی مخلوط بازاری بولیوں نے سیاسی، تجارتی اور سماجی اسباب کی بنا پر لوگوں کے آپس میں میل ملاپ کی وجہ سے ایک مخلوط بولی کی شکل اختیار کر لی جو ارتقائی مدارج طے کر کے اُردو کے نام سے مشہور ہو گئی۔ اس مخلوط بولی (اردو) کو اس کے ابتدائی زمانہ میں سب سے زیادہ مقبولیت گجرات میں حاصل رہی گجرات میں یہ اتنی عام ہو چکی تھی کہ پندرھویں صدی میں اس بولی کو ادبی شکل

دیدی گئی۔ ادب کی اس اولیں منزل میں چند صوفیائے گجرات نے مستقل تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔

گجرات میں اُردو ادب کی نشاندہی پندرھویں صدی کے نصف آخر سے کی جاتی ہے۔ اس اولین دور میں چند مقدس ہستیوں نے عام مخلوط بولی کو اپنے رشحات قلم سے ادبی شکل میں پیش کیا اور اس کے لئے گجری نام تجویز کیا۔ ۱۵۷۲ء میں جب گجرات میں اکبری فتح کا ڈنکا بجا تو افرا تفری پھیلنے کی وجہ سے ادیبوں، شاعروں اور صوفیوں وغیرہ میں سے بعض نے عافیت کی کھوج میں دکن کا رخ کیا اور بعض اصحاب کمال تاجداران دکن کی دعوت پر گجرات سے دکن گئے۔

سترھویں صدی کے اواخر میں گجرات کے ادبی افق پر ولی نمودار ہوا۔ اس مجتہد العصر شاعر نے غزل کا ایک اچھوتا آہنگ پیش کیا اور اپنے اجتہادی کرشمہ سے جنوب و شمال میں لسانی معدت قائم کرکے اُردو کے لئے راہیں کھول دیں۔ ۱۷۰۹ء میں ولی نے وفات پائی۔ اس کے بعد اس کے شاگردوں اور ہمعصروں نے ایک مدت تک گجرات و دکن میں شعر و سخن کی محفلیں گرم رکھیں۔

ولی کے بعد سورت کے میر عبدالولی عزلت ایک بلند پایہ شاعر گذرے ہیں۔ عزلت میں گجرات سے حیدر آباد چلے گئے اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ عزلت کے بعد انیسویں صدی کے اواخر میں سورت کے میاں بھو، میاں منظور، میاں داد خاں سیاح اور احمد آباد کے حسن استاد شاعروں کے دم قدم سے گجرات کی ادبی محفلوں میں چراغ روشن رہے۔ اس دور کے بعض شاعروں کو دہلی کے اساتذۂ فن سے مشورۂ سخن کا فخر حاصل ہے۔ گجرات کے بیشتر رؤسا، و امراء کی سرپرستی کی وجہ سے بھی شعر و سخن کا چرچا قائم رہا۔ یہ لوگ شاعر بھی تھے اور شاعر نواز بھی۔ سورت، سچین، بھروچ، بڑودہ، مانگرول کے نواب خاندانوں نے بہت کشادہ دلی سے اُردو کی سرپرستی کی۔ اسی طرح امرا میں سورت کے بخشی، عمدۃ التجار عبدالغفور، عمدۃ التجار شیخ فاضل، نصیر الدین سورتی جمعدار، انکلیشور کے انعامدار، بھروچ کے قاضی، بڑودہ کے میر صاحب کے خاندانوں کو بھی اُردو کی سرپرستی کا فخر حاصل ہے۔

گجری ادب سے دلچسپی رکھنے والے محققین میں ڈاکٹر عبدالحق بابائے اُردو، پروفیسر حافظ محمود شیرانی، مولوی شمس اللہ قادری، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور وغیرہ کے نام کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ ان بزرگوں کے تحقیقی کارنامے اس میدان میں آنے والوں کے لئے مشعل راہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ گجری ادب پر کام کرنا اس اعتبار سے مشکل ہو جاتا ہے کہ گجرات کے قدیم شہ پارے یا تو پردۂ خفا میں ہیں یا پھر ان کا عدم و وجود برابر ہو چکا ہے۔ اب تک کی تحقیق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پانسو سال کے طویل عرصہ میں سینکڑوں ادبی کارنامے تصنیف کئے گئے ہوں گے اور سینکڑوں شاعر

گذرے ہوں گے لیکن اب تک ان میں سے معدودے چند کا پتہ چل سکا ہے۔ آج سے بیس سال قبل گجرات کے چند گنے چنے مثنوی نگاروں تک ہماری معلومات محدود تھیں لیکن جب اس طرف توجہ کی گئی تو بیسیوں مثنویاں منظرِ عام پر آگئیں۔ اب تک گجرات کے شعرا پر مخزن شعرا کے نام سے صرف ایک تذکرہ ملتا ہے جو ۱۱۶۸ھ کے آس پاس مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں ایک سو گیارہ شاعروں کا ترجمہ ہے اور اس کے مرتب قاضی نورالدین شیرازی غائق ہیں۔ قاضی صاحب نے اپنے بیشتر ہم عصروں کا ذکر کیا ہے جو مستند ہے۔ قاضی صاحب کو شعرا اور ان کے کلام سے دلچسپی نہیں تھی۔ بعض قدیم شعرا کے کلام پر اصلاح دے کر کلام کی قدر و قیمت گھٹا دی ہے۔ تذکرہ مرتب کرنے سے قاضی صاحب کا مقصد اپنی فارسی دانی پر داد و تحسین حاصل کرنا تھا جو انہیں تذکرہ پر غالب کی تقریظ سے حاصل ہوگئی۔ تذکرہ کے علاوہ قاضی صاحب نے ایک قابلِ قدر خدمت یہ انجام دی ہے کہ رسالہ نورالمعرفت کی ایک نقل منظرِ عام پر لے آئے۔ مخزن شعرا کے علاوہ تاریخ کی ایک کتاب حدیقۂ احمدی مرتبہ شیخ بہادر سرخیزی (عمدۃ التجار کا خاندان) میں چند شعرا کا تذکرہ مل جاتا ہے۔ شیخ موصوف نے نام کے ساتھ ایک ایک شعر دیدیا ہے۔ سید جیوا میاں عیدروس کی ایک تصنیف تاریخ سورت کے نام سے ہے اس میں میاں مجبو منظور کے دور کے تیس شاعروں کا حال ملتا ہے۔

مقالہ سخنوران گجرات پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے لکھا گیا تھا۔ مرحوم پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی بمبئی یونیورسٹی کی طرف سے نگراں مقرر کئے گئے تھے۔ ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۲ء مختصر مدت میں مقالہ تیار کر لیا گیا تھا لیکن جب کبھی اس کے کسی حصے پر نظر پڑی تو تشنہ ہی پایا جاتا۔ ۱۹۴۴ء میں مرحوم پروفیسر محمد ابراہیم صاحب ڈار نے مقالہ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد بعض مقامات کی طرف میری توجہ مبذول کرائی۔ ۱۹۴۴ء کے اواخر میں مقالہ یونیورسٹی کو پیش کیا گیا اور ۱۹۴۸ء میں مجھے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند کے لئے مستحق قرار دیا گیا۔ چند سال قبل جب مقالہ کی اشاعت کا ارادہ کیا تو نظرِ ثانی کی گئی۔ نظرِ ثانی میں اتنی کتر بیونت عمل میں آئی کہ مقالہ نے نئی شکل اختیار کر لی ہے۔

سخنوران گجرات گجرات کے سلسلۂ اردو ادب کی ایک کڑی ہے۔ بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دیا گیا ہے اور بس۔ اس کی افادیت کا اندازہ قاری کے زاویۂ نظر پر موقوف ہے۔ اس حقیر ادبی کاوش کو پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اللہ کرے کسی قابل ثابت ہو۔

سخنوران گجرات مقدمہ، چار باب اور تین ضمیموں پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں گجرات کی مختصر تاریخ

تاجروں اور صوفیوں کے ورود، اُردو زبان سے متعلق مختلف نظریوں اُردو کی ادبی تشکیل اور اُردو کے قدیم نام گجری پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ پہلا باب صوفیا کے مستقل کارناموں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس باب کا زمانہ ۱۳۵۰ء تا ۱۶۵۰ء متعین کیا گیا ہے۔ دوسرا باب ۱۶۵۰ء تا ۱۷۵۰ء ولی اور اس کے ہم عصروں سے تعلق رکھتا ہے۔ تیسرا باب ۱۷۵۰ء تا ۱۸۵۰ء دورِ عزلت قرار دیا گیا ہے اور چوتھا باب ۱۸۵۰ء تا ۱۹۵۰ء کے شعرا سے متعلق ہے۔ ہر باب میں سیاسی سماجی پس منظر، تذکرہ، تبصرہ اور نمونۂ کلام پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں تین ضمیمے اضافہ کئے گئے ہیں۔ پہلا ضمیمہ گجرات کے چند معزز خاندانوں کے حالات اور ان کی علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی خدمات پر مشتمل ہے۔ دوسرے ضمیمے میں گجرات کے چند دستیاب نثری کارناموں سے متعلق معلومات ہیں اور تیسرے میں مختلف کتابوں سے لئے گئے شعرا کی فہرستیں درج کی گئی ہیں۔

مقدمہ

عہد قدیم سے ملک گجرات کو کئی حیثیتوں سے اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس خطے کے نام اور حکام ضرور بدلتے رہے مگر اس کی اہمیت و شہرت ہمیشہ برقرار رہی۔ یہ ملک اپنی تجارت، تمول، شادابی، بندرگاہوں وغیرہ کی وجہ سے ہمیشہ بیرونی و اندرونی اقوام و اصحاب سیف و قلم کے لئے باعث کشش رہا ہے۔ تقریباً سنہ ۲۰۰۰ ق م بلکہ اس کے بھی قبل سے ۱۶۰۰ء تک دنیا کی مختلف قومیں یہاں آئیں جن میں سیاسی فاتح بھی ہیں اور روحانی پیشوا بھی، تاجر بھی۔ ہندوستان کے آخری حکمران انگریز بھی سب سے پہلے گجرات ہی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئے تھے۔ اور اہل ہند کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر رفتہ رفتہ پورے ملک پر تسلط پاکر تاجر سے تاجدار بن گئے۔ ملک گجرات کروڑپتیوں کا ملک ہے۔ صدیوں پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ اس کی سلطنت کا مدار بر لولو و مرجان رہا ہے اور آج بھی اس کا مدار برگندم و جو نہیں ہے۔ یہ ملک مختلف مذاہب کے مرکز کی حیثیت سے اور اپنی زیارت گاہوں نیز مقدس ندیوں کی وجہ سے بھی دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں کسی طرح کم شہرت کا مالک نہیں ہے کرشن جی کو اس خطہ سے مخصوص تعلق رہا ہے۔ ایک زمانہ میں بدھوں کے لئے بھی اگرچہ پیش اہمیت رکھتا تھا۔ جینوں کی زیارت گاہوں کے لئے گجرات مشہور ہے۔ سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض تابعین و تبع تابعین نے بھی سب سے پہلے اسی سرزمین پر اپنے مبارک قدم رکھے[1]۔ اسماعیلیوں نے بھی تبلیغ کا کام سب سے پہلے گجرات ہی میں شروع کیا۔

موجودہ گجرات کی مشرقی شمالی سرحد کو اراولی اور بندھیاچل پہاڑوں کی قطاروں پر ختم ہوتی ہے اس سرحد پر مالوہ، میواڑ، مارواڑ وغیرہ سے گجرات علیحدہ ہوتا ہے۔ اس کی مغربی اور شمالی مغربی سرحد پر کچھ (ک چ ھ) کا رن واقع ہے۔ جنوبی سرحد تھانہ (بمبئی) اور ڈانگ کے جنگلوں تک

---

[1] تاریخ گجرات ابوظفر ندوی

ہے اور اس کے جنوب اور جنوب مغرب میں بحرِ عرب اور خلیج کھمبائت ہے۔ عہدِ قدیم میں سیاسی اُلٹ پھیر کے ساتھ ساتھ اس کی سیاسی حدود بدلتی رہیں کبھی تو یہ سمٹ کر موجودہ گجرات اور سوراشٹر رہ جاتا اور کبھی یہ بمبئی سے جودھپور تک پھیل جاتا۔ شمالی بمبئی کا علاقہ کبھی تو گجرات کے زیرِ نگیں ہوتا اور کبھی اس پر کرناٹک کے راجاؤں کا پرچم لہراتا۔ گرجروں کے عہدِ حکومت میں یہ علاقہ تین حصوں میں منقسم تھا۔ ایک زمانہ میں یہ دراوڑ قوم کا بھی تجارتی مرکز رہا ہے۔ اس عہد میں اس کا کیا نام تھا اس سے ہم لاعلم ہیں مگر جب آریوں نے ہندوستان میں قدم رکھے اور مختلف علاقوں میں پھیل گئے تو گجرات میں بھی آباد ہوئے۔ اس وقت کونکن، سندھ، گجرات اور دوسرے قریبی علاقوں کے مجموعہ کو ایرتا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ آریوں نے بعد میں اس ملک کو راسٹ رسیدھا، مہذب، نام دیا اور جس جگہ غیر مہذب لوگ آباد تھے اس کو آرنی کہنے لگے۔ جب گرجروں کی حکومت گجرات و دکن میں قائم ہو گئی تو انھوں نے دکن کو مہاراٹ اور گجرات نام دیا جو آگے چل کر مہاراشٹر، گجراٹھ اور سوراشٹر ہو گئے۔ مہابھارت پران میں گجرات کے حصوں کے ایرتا اور لاٹا نام ملتے ہیں۔ ایرتا (ایرت) شمالی گجرات کو کہتے تھے۔ اس میں سوراشٹر بھی شامل تھا۔ گجرات کا جنوبی حصہ لاٹا (لاٹ) کے نام سے مشہور تھا۔ لاٹا کو ٹالیمی سیاح کے ہاں ۰۱۵ ب م لاریکا یا لارک کہا گیا ہے۔ غرض راسٹ سے لاٹا، لاٹ لاریکا، لارین گیا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں کے ہاں اس علاقہ کا نام لاردیس خصوصیت کے ساتھ آتا ہے۔ عرب اس کی زبان کو لاری کہتے تھے۔ بمبئی کے بعض حصے اسی لاردیس میں شامل تھے۔

اس وقت گجرات کی کل آبادی ۲۶،۶۶۱،۰۰۰ ہے۔ اس کا طول و عرض پورب پچھم اتر دکھن بھی تقریباً یہی ہے۔ گجرات ساحلی علاقہ ہونے کی وجہ سے بندرگاہوں کا ملک ہے۔ دراوڑوں اور آریوں کے زمانہ میں معلوم نہیں کتنی بندرگاہیں تھیں۔ سلاطینِ گجرات کے عہد میں چوراسی بندرگاہوں کا پتہ چلتا ہے۔ بمبئی کے بندرگاہ بننے کے بعد ان کی اہمیت کم ہو گئی۔ اس وقت گجرات میں پندرہ بندرگاہیں ہیں۔

گجرات میں دریاؤں کے چھ سلسلے ہیں۔ ان میں دریائے نربدا اور دریائے تپتی (تاپتی) کو مذہبی اور تجارتی نقطۂ نظر سے اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح گجرات پہاڑوں اور جنگلوں کے خزانوں سے بھی مالامال ہے۔ صنعت و حرفت میں بھی اس کا درجہ کم نہیں۔ سوتی اور ریشمی کپڑے، ہاتھی دانت کی صنعت کاری، مینا کاری، زردوزی وغیرہ کے لئے گجرات شہرت رکھتا ہے۔

گجرات گزشتہ دنوں میں مختلف اقوام کے لئے مرکزِ توجہ رہا ہے۔ جادو یونانی بیکٹریئنس، پارتھینس

ہتھینس، عرب، ایرانی، مکرانی، افریقی اور اقوام مغرب کے فاتحوں کے لئے میدان کارزار، پناہ گزینوں کے لئے جائے پناہ اور تاجروں کے لئے زبردست منڈی ثابت ہوا ہے۔

گجرات ہندوستان میں گرجر قوم کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے چھٹی صدی تک لفظ گرجر نہ تو قوم کے لئے استعمال ہوا ہے اور نہ کسی علاقہ کا نام پایا جاتا ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ یہ لوگ گرجستان (جارجیہ) کے باشندے تھے[10]۔ سنہ عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں یہ لوگ ہند میں وارد ہوئے اور سب سے پہلے انھوں نے مدھیہ دیش میں سکونت اختیار کی۔ گپتوں کے عہد حکومت میں اس قوم کے افراد حکومت کے فوجی اور غیر فوجی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ ۲۰۰ ب م عہدیداروں کی حیثیت سے یہ لوگ راجپوتانہ، مالوہ، گجرات وغیرہ میں آئے اور جب گپتوں کی حکومت میں ضعف آگیا تو سنہ ۴۹۵ عیسوی میں یہ خود مختار ہوگئے اور ان کے مختلف خاندانوں نے دکن اور گجرات میں چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم کرلیں۔ دکن کے علاوہ سنہ ۶۴۱ میں علاقہ گجرات میں ان کی ایک عظیم الشان سلطنت پائی جاتی ہے جو بلساڑ (قریب سورت) سے جودھپور اور دوارکا (کاٹھیاواڑ) سے بھیلسا تک پھیلی ہوئی تھی اور راجپوتانہ، مالوہ، سوراشٹر، گجرات وغیرہ اس کے بڑے بڑے حصے تھے۔ یہ گرجر دیش کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور اس دیش کی تہذیب و تمدن اور زبان و ادب میں بڑی حد تک وحدت تھی۔ سنہ ۱۲۰۰ء میں اسی علاقہ کی گرجر اپبھرنش سے گجراتی، مارواڑی، جودھپوری وغیرہ دیسی زبانیں وجود میں آئیں۔ اسی قوم کے چار خاندان چالوکیہ، چوہان، پرمار، پرتی ہار مشہور ہیں جن کی حکومتیں دکن، گجرات اور شمال میں صدیوں تک قائم رہیں۔ گجرات میں اس عہد میں بعض غیر گرجروں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ ایک دور ایسا بھی آیا کہ گرجر ریاستیں آپس میں ٹکرا کر ایک دوسرے پر غالب آتی رہیں۔ ان سلطنتوں کی چار پانچ راجدھانیاں مشہور ہیں۔ شمال میں بھیلمان، آجین، گجرات میں ولبھی پور (قریب بھاؤنگر) بھروچ، انہل واڑ (نہروالا) اور دکن میں کلیانی (بیدر) نام اکثر دیکھے جاتے ہیں[11]۔

گجرات کی قدیم تاریخ ہنوز محتاج تلاش و تحقیق ہے۔ سیاسی تاریخ کا ایک دھندلا سا نقش سامنے آگیا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی عہد میں دو دو خاندانوں کی حکومت کا پایا جانا مغالطہ میں ڈال دیتا ہے۔ گجرات کی سیاسی تاریخ جادووں سے شروع کی جاسکتی ہے۔ جادو خاندان گجرات پر حکمران رہا اور اس کا صدر مقام دوارکا تھا۔ کرشن جی اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور گجرات کے حکمران بھی رہ چکے تھے۔ ارجن ان کے بہنوئی تھے۔ جادووں کے بعد ۳۰۰ ق م گجرات پر موریہ خاندان کا پرچم لہرایا۔ بعض شواہد سے گجرات میں یونانیوں کی حکومت کا بھی پتہ چلتا ہے[12]۔ موریہ دور میں ۲۰۰ ق م

یہ لوگ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ ایک زمانہ میں ان لوگوں نے بھروچ اور جوناگڑھ (کاٹھیاواڑ) میں خود مختار حکومتیں قائم کرلی تھیں۔ گجرات پر ایک شترپ خاندان بھی حکمرانی کرچکا ہے۔ شترپ سیستان (ایران) کے رہنے والے تھے۔ ٹیکسیلا، متھرا وغیرہ میں ان کی حکومتیں قائم تھیں۔ ان کی سلطنت یا ریاستوں کا دائرہ جنوبی راجپوتانہ، سوراشٹر، گجرات اور پونا تک پھیلا ہوا تھا۔ اس خاندان نے تقریباً چار سو سال حکومت کی۔ سنہ ۳۹۵ ب م میں گپتوں نے ان کا تختہ اُلٹ دیا۔ گجرات پر ایک تری کوٹک خاندان نے بھی حکمرانی کی تھی۔ سنہ ۲۵۰ تا سنہ ۴۵۰ ب م ان کا سکہ چلتا رہا۔ ان کا صدر مقام بھروچ تھا۔ سنہ ۳۹۵ء تا سنہ ۴۸۰ء گپتوں کی گجرات میں حکومت رہی۔ اس کے بعد حکومت گرجر خاندان میں منتقل ہوگئی۔

گجرات و دکن میں کئی گرجر خاندان حکمران گذرے ہیں۔ ان میں سے ولبھی خاندان رجالوکیہ نے گجرات میں ایک طاقتور سلطنت قائم کرلی تھی۔ یہ خاندان سنہ ۴۸۰ء تا سنہ ۷۷۰ء برسر اقتدار رہا۔ ان کی راجدھانی ولبھی پور کے نام سے مشہور تھی۔ اس عہد میں گجرات ایک ترقی یافتہ ریاست تھی۔ اس کے ایک شہر میں تقریباً ایک سو کروڑپتی پائے جاتے تھے کہ چینی اور عرب سیاحوں نے گجرات کی دولت مندی کی تعریف کی ہے۔ ولبھیوں کے بعد سنہ ۷۷۰ء میں دکن کا راشٹر کوٹ خاندان گجرات پر قابض ہوگیا۔ اس خاندان کا تعلق تقریباً دو سو سال رہا۔ سنہ ۷۷۰ سے ۸۰۸ء تک گجرات دکن کے ایک صوبہ کی حیثیت سے راشٹر کوٹوں کے زیرنگیں رہا۔ سنہ ۸۰۸ء تا سنہ ۸۸۸ء یہاں آزاد حکومت رہی اور سنہ ۸۸۸ء کے بعد سنہ ۹۷۴ء تک پھر دکن کے صوبہ کی حیثیت رہی۔ راشٹر کوٹ راجاؤں کا لقب ولبھ رائے تھا۔ اس خاندان کے بعض راجا مسلمانوں کے بڑے خیرخواہ اور دوست گذرے ہیں۔ انہیں کے عہد حکومت میں عرب تاجر اور مہاجر گجرات میں ہزاروں کی تعداد میں آئے اور مستقل اقامت اختیار کرلی۔ جب گجرات میں بدنظمی پھیلی تو گرجروں کی ایک شاخ سولنکی کے ایک فرد مول راج نے چاوڑا (گرجر) خاندان کے راجہ سامنت سنگھ (مول راج کا ماموں) کو قتل کرکے اقتدار حاصل کرلیا۔ اس عہد میں گجرات بہت ترقی یافتہ ریاست تھی گجرات کو سرسوتی منڈل کہا جاتا تھا۔ اس کے حدود راجپوتانہ اور مالوہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس خاندان میں کئی راجہ گذرے ہیں جن میں راجہ سدھ راج جے سنگھ (سنہ ۱۰۹۴ء تا سنہ ۱۱۴۳ء) بہت مشہور ہے۔ مشہور و معروف نحوی ہیم چندر اسی کے دربار سے منسلک تھا۔ یہ خاندان سنہ ۱۲۴۴ء تک برسر اقتدار رہا۔ اس عہد میں گجرات کے ایک حصہ میں باگھیلا گرجروں کی حکومت بھی قائم تھی۔ جب سولنکیوں کا زوال ہوا تو باگھیلا خاندان پورے گجرات پر قابض

ہوگیا۔ باگھیلے سنہ ۱۳۰۴ء تک حکمراں رہے۔ سنہ ۱۲۹۶ء میں اس خاندان کا ایک راجہ کرن نامی تخت پر بیٹھا۔ اس کے عہد میں مادھو اور کیشو دو ناگر بھائی اس کے مشیر کار تھے۔ مادھو کی بیوی بہت حسین تھی۔ راجہ نے اس حسینہ کو زبردستی محل میں ڈال لیا۔ اس کا انتقام لینے کے لئے مادھو نے دلی جاکر علاؤالدین خلجی کو گجرات پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ علاؤالدین نے اپنے سپہ سالار الغ خان کی سپہ سالاری میں گجرات میں فوج بھیجی۔ الغ خان نے گجرات کو فتح کرکے ہمیشہ کے لئے گرجیروں کی حکومت کا خاتمہ کردیا۔

علاؤالدین خلجی کی فتح گجرات سے قبل گجرات میں مسلمان فوجیں کئی بار چکر لگا گئی تھیں گجرات پر سندھ کے خلیفوں کے حملے کے علاوہ سنہ ۱۰۲۱ء میں محمود غزنوی کا حملہ سومنات (کاٹھیاواڑ) سنہ ۱۱۷۸ء میں معزالدین سام (غوری) کا حملہ (بعہد مول راج)، سنہ ۱۱۹۴ء میں قطب الدین کا حملہ سرسری گذرجانے سے زیادہ نہ تھے۔ یہ لوگ آئے، فتح کیا، مال غنیمت لیا اور محکوم حاکموں میں سے کسی کو گورنر مقرر کرکے چلے گئے۔ مگر علاؤالدین کی فتح کے بعد گجرات سلطنت دہلی کا ایک صوبہ قرار پایا اس طرح شمال وجنوب کے سیاسی سماجی تعلقات قائم ہوگئے ۵ یہ تعلقات تہذیب، زبان وادب اور ذہنی تغیر کے نقطۂ نظر سے بہت اہم ثابت ہوئے۔ سنہ ۱۲۹۶ء سے سنہ ۱۳۹۸ء تک دہلی سے ناظم آتے رہے۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں گجرات کے ناظم ظفر خاں نے اپنی خودمختار حکومت قائم کرلی۔ ظفر خاں سے سلاطین گجرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ انھوں نے ۱۸۴ سال گجرات پر حکمرانی کی۔ سنہ ۱۵۷۲ء میں اکبر نے گجرات کو فتح کرکے دوبارہ اس کو سلطنت دہلی کا ایک صوبہ قرار دے دیا۔ سنہ ۱۷۵۸ء تک گجرات مغلوں کے زیر نگیں رہا۔ اس کے بعد گجرات مرہٹوں، انگریزوں اور مسلمانوں میں بٹتا رہا اور آخر کار سنہ ۱۸۵۰ء میں انگریز اس کے مالک کل بن گئے۔

اردو کے جنم بھوم کے متعلق عرصۂ دراز سے تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر تک یہ مانا جاتا تھا کہ اردو اکبر وشاہجہاں کے عہد میں دہلی میں مختلف زبانیں بولنے والوں کے میل جول کی وجہ سے وجود میں آئی۔ مستشرقین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اردو کی پیدائش کا زمانہ ہند میں مسلمانوں کی آمد کا زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ بیسویں صدی میں اس مسئلہ پر زیادہ سائنٹیفک طریقہ پر تحقیق کا کام ہوا ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی نے پنجاب کو اردو کا پہلا وطن قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اردو کو دوآبہ گنگ وجمن کی پیداوار بتایا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے سرسری طور پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اردو مخلوط بولی کی حیثیت سے سب سے پہلے سندھ میں وجود میں آئی۔ محققین نے نے اپنے اپنے نظریے کی وضاحت کے لئے سیاسی، سماجی، تجارتی اسباب کو بنیاد قرار دیا ہے اور علم

۵۔ تجارتی تعلقات پہلے سے قائم ہوں گے

لسانیات کی روشنی میں جانچ پڑتال کی گئی ہے۔

سیاسی، تجارتی، معاشرتی مذہبی نقطۂ نظر سے غیر زبانیں بولنے والوں کا ہند میں پہلا مرکز سندھ ہے یا اپنی بندرگاہوں کی وجہ سے اہمیت رکھتا تھا۔ بحری اور بری راستوں سے بیرونی ممالک سے سوداگر یہاں مال لے کر آتے تھے۔ بغداد، بصرہ، ایران کی بندرگاہوں سے جہازات چلتے تو سندھ ہوتے ہوئے گجرات آتے اور گجرات سے مالابار کی طرف بڑھ جاتے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو سنہ ۷۱۱ء میں محمد بن قاسم کے حملے کے بعد سندھ میں عربوں کی سلطنت قائم ہو گئی۔ اس سے پہلے بھی غیر زبانیں بولنے والوں کے اختلاط کا ایک سبب یہ تھا کہ کبھی تو شاہانِ ایران مکران سے سندھ تک اپنا قبضہ جما لیتے اور کبھی سندھ کے راجہ بلوچستان اور مکران پر اپنا پرچم لہرا دیتے اس طرح فارسی بولنے والوں کا سندھ کی وادی میں کافی عمل دخل رہا۔ اس بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے مقالہ "ہندوستان میں ہندوستانی" میں مفصل اظہار خیال کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"عربی فارسی بولنے والے تاجر پہلے سندھ کی بندرگاہوں پر دم لیتے تھے۔ سنہ ۷۱۱ء میں مسلمانوں نے سندھ پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ سندھ کے پنڈتوں نے بغداد جا کر ہندی سے عربی زبان میں کتابوں کے ترجمے کے کام میں حصہ لیا۔ سندھ میں مسلم حکومت تین سو سال قائم رہی۔ نیز تاجروں اور مسافروں کی آمد و رفت کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ مقامی بولیوں میں عربی، فارسی کا میل ہونے سے ایک نئی زبان وجود میں آئے اور آخر میں یہی سندھی، ملتانی، پنجابی بولیاں دہلی کی زبان سے مل کر ایک معیاری زبان بن گئی اور اس کے بعد مختلف صوبوں میں پھیل گئی۔"

سندھ کی زبانوں کے متعلق بعض عرب سیاحوں کے بیانات ملاحظہ کیجئے:

مسعودی سنہ ۹۱۵ء/ ۳۰۳ھ

"سندھ کی زبان خاص ہے ہندوستان سے الگ ہے۔"

اصطخری سنہ ۹۵۱ء/ ۳۴۰ھ

"منصورہ اور ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہے اور مکران والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہے۔"[1]

ابن حوقل سنہ ۹۶۸ء/ ۳۵۸ھ

"منصورہ اور ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہے۔"

---

1. تقریظ صفحہ ۴۲

بشاری مقدسی سنہ ۹۸۵ء / ۳۷۵ھ

" اور یہاں (ملتان) فارسی بھی جاتی ہے "

" دیبل (ٹھٹھہ) کے حال میں لکھتا ہے "

" ان کی زبان سندھی اور عربی ہے "

مذکورہ بالا بیانات سے ظاہر ہے کہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں کا سندھ میں اچھا خاصا چلن تھا۔ عربی فارسی سندھی کے میل سے بازاری بولی بھی ضرور وجود رکھتی ہوگی جو آگے چل کر پنپ نہ سکی لیکن تاجر اس کو پنجاب کی منڈیوں میں اپنے کاروبار میں ضرور کام میں لاتے رہے ہوں گے جب عربی فارسی کے اثر سے سندھی کا رسم خط نسخ قرار پاجاتا ہے تو ایک بازاری بولی کے وجود میں نہ آنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

پنجاب میں بھی سیاسی سماجی حالات ایک بازاری بولی کے متقاضی تھے۔ سنہ ۱۰۲۱ء/ ۴۱۲ھ میں محمود غزنوی نے پنجاب کو فتح کرکے اسے غزنی کے ایک صوبہ کی حیثیت دیدی تھی۔ اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد سیاسی محکمے، عملے، فوجیں، عہدیدار، تاجر، اہل حرفہ بھی پنجاب میں وارد ہوئے اور بیشتر نے اس کو اپنا وطن بنالیا ہوگا۔ تاریخ اس بات کی بھی شاہد ہے کہ غزنوی فوجوں میں مختلف زبانیں بولنے والے موجود تھے۔ اس میں افغانی، خراسانی، ہندی ہر قوم و ملک کے لوگ تھے لیکن لشکر میں تقریباً تمام فیلبان ہندی تھے۔ ہندی کے ترجمانوں کی ایک جماعت غزنہ میں موجود تھی سیکڑوں کی تعداد میں سندھی غزنہ میں بغرض ملازمت اور تجارت رہتے تھے۔ پنجاب میں حکومت قائم ہونے کے بعد سماجی حیثیت سے بھی لوگوں کے آپس کے میل جول سے ایک مخلوط بولی کے رائج ہونے کے امکانات کم نہ تھے۔ غیر زبانیں بولنے والوں نے پنجاب کی مقامی رائج الوقت زبان ضرور اختیار کرلی ہوگی تاہم مخلوط زبان کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مذہبی نقطہ نظر سے بھی صوفیا کا ورود مخلوط بولی کے ابھرنے کے امکانات میں اضافہ کرتا ہے۔ حضرت علی ہجویری پہلے صوفی و عالم ہیں جنھوں نے لاہور میں مستقل سکونت اختیار کی اور سنہ ۱۰۷۲ء/ ۴۶۶ھ میں وہیں پیوند خاک ہوئے۔ پنجاب میں دوسری مقتدر ہستی حضرت بابا فرید گنج شکر کی تھی۔ مخلوط زبان میں آپ کا کلام بھی ملتا ہے۔

غرض اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پنجاب میں کوئی مخلوط بولی وجود میں آئی مگر سلطنت دہلی کے قیام کے بعد جو سیاسی و سماجی انقلاب آیا اس سے اس مخلوط بولی کی ترقی ماند پڑگئی اور یہ دہلی کی مخلوط بولی کی معاون ہوکر رہ گئی۔

اُردو کے سلسلے میں سلطنت دہلی کا قیام و استحکام بہت اہمیت رکھتا ہے ۔ سنہ ۱۱۹۶ء میں معزالدین سام (محمد غوری) نے دہلی کو فتح کر کے قطب الدین ایبک کو اپنا نائب مقرر کیا اور خود غزنہ لوٹ گیا۔ سنہ ۱۲۰۶ء میں معزالدین کی وفات پر قطب الدین دہلی کا پہلا خود مختار بادشاہ بنا۔ مسلم حکومت قائم ہونے کے بعد یکے بعد دیگرے کئی خاندان برسر اقتدار آئے ۔ سب سے آخر میں سنہ ۱۵۲۶ء سے مغلیہ خاندان کا دور شروع ہوا جس کی آخری شمع سنہ ۱۸۵۷ء میں گل ہو گئی ۔

مسلمانوں کی سلطنت کے قیام کے بعد دہلی میں صوفیا کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا حضرت قطب الدین بختیار کاکی ، حضرت نظام الدین اولیا ، حضرت نصیر چراغ دہلی وغیرہ وہ مقدس بندے تھے جن کے پرتو اور توجہ سے ہزاروں دل نور الٰہی سے معمور ہو گئے اور انہیں کی توجہ خاص سے مخلوط بولی بھی پنپنے لگی ۔

دہلی صدر مقام تھا ۔ ہندوستان کے ہر علاقے سے تاجر اپنی اشیائے تجارت لے کر یہاں آتے اور اپنی اپنی مخلوط بولیوں سے دہلی کی مخلوط بولی کو بھی متاثر کرتے رہے ۔ ان بولیوں میں عربی فارسی عنصر مشترک تھا پھر پاس پڑوس کے ناتے سے مقامی زبانوں کا بھی تھوڑا عنصر ضرور مشترک رہا ہوگا ۔ اس دہلی کی مخلوط بولی کو ابھرنے میں دیر نہ لگی ۔

دہلی میں مخلوط بولی کی داغ بیل تو اسی روز پڑ چکی تھی جب وہاں حکومت کی داغ بیل پڑی ۔ تیرھویں صدی ، ہند کی اپ بھرنش زبانوں کا آخری دور تھا اور جدید ہند آریائی زبانوں کے روپ ابھر آ رہے تھے ۔ سیاسی الٹ پھیر میں لسانی نقطۂ نظر سے عربی ، فارسی ، ترکی کا عنصر ایک اضافی چیز ہوئی ۔ مقامی زبانوں میں مل ملا کر اس عنصر نے ایک نئی بولی کا روپ لے لیا ۔ اس کو کھڑی کا نام دیجئے یا ہریانی کے غالب عنصر کی وجہ سے ہریانی کہئے ، اسی کو بعد میں دہلوی نام عطا کیا گیا ۔

مخلوط روپ صوفیا کے اقوال اور فقروں کی شکل میں ملتا ہے ۔ اسی طرح کتب تواریخ اور لغات کی مدد سے اس کی نشاندہی کی جا سکتی ہے ۔ اس کی ایک شکل بھگتی تحریک کے شاعروں میں بھی مل جاتی ہے ۔ یہ روپ ، پنجابی اور ہریانی سے بہت متاثر ہوا ۔ غرض ایک مخلوط بولی دہلی میں تیزی سے ترقی کر گئی ۔

مذکورہ بالا نظریوں میں بڑی حد تک اصلیت و حقیقت کی جھلک پائی جاتی ہے ۔ محققین نے جو طرز استدلال اختیار کیا ہے اور نظریہ کو پرکھنے کے لئے جو کسوٹی تیار کی ہے اس کسوٹی پر اگر گجرات کے دعوے کو بھی پرکھا جائے تو وہی نتائج برآمد ہوں گے جو دوسرے نظریوں کے سلسلہ میں سامنے

آئے ہیں۔ اگر تجارتی، سیاسی، سماجی نقطۂ نظر سے غیر زبانیں بولنے والوں کے گجرات میں اجتماع، گجرات میں پارسی قوم اور ایرانی تاجروں کی آمد، گرجر دیش کی متحدہ تہذیب اور لسانی وحدت، گرجر اپ بھرنش اور شورسینی اپ بھرنش میں مماثلت، قدیم دور کے دکنی و گرجر و راشٹر کوٹ خاندانوں کی حکومت اور ان کا زبانوں کو متاثر کرنا، مسلم دور میں گجرات و دکن کے تعلقات، گجرات اور شمال کے تعلقات، راجستھان اور گجرات کی زبانوں میں مماثلت اور لسانی اشتراک وغیرہ پر غور کیا جائے تو گجرات کا بھی اردو جنم بھوم ہونے کا دعویٰ معقول نظر آئے گا۔ آیئے گجرات کے نظریہ کی تفصیلات پر ایک نظر ڈالیں۔

گجرات میں تجارتی، مذہبی اور سیاسی اسباب کی بنا پر ایک مخلوط بولی وجود میں آئی۔ یہ وہی اسباب ہیں جن کے پیش نظر پنجاب اور دہلی میں مخلوط بولیوں کا وجود میں آنا ثابت ہے۔ مخلوط بولی میں مقامی زبانوں اور غیر زبانوں کے عناصر قابل لحاظ ہیں۔ ان دو کے امتزاج ہی سے مخلوط بولی کا خمیر تیار ہوتا ہے اور ایک مزاج پا کر بولی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ہندوستان میں چھٹی صدی عیسوی سے چودھویں صدی تک اپبھرنش زبانوں کا دور تھا۔ اسی دور میں ایک ہزار عیسوی سے جدید ہند آریائی زبانوں کا چلن شروع ہو چکا تھا۔ گجرات میں ناگر اپبھرنش اور اپ ناگر اپبھرنش زبانیں رائج تھیں۔ اس عہد میں عرب اور ایرانی تجارت کے سلسلہ میں گجرات آتے رہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں تو ایرانی ہند کی منڈیوں کے شاہ کہلاتے تھے[19]۔ عرب مالابار کے علاقہ میں ظہور اسلام کے پہلے سے پائے جاتے ہیں۔ ادھر سندھ میں تو عربوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی لہٰذا یہ لوگ ہندوستان کے تمام ساحلی علاقوں میں آباد تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں ہزاروں کی تعداد میں عرب کھمبایت، راندیر، تھانہ، سوپالا میں آباد تھے۔ وہ ان کے قضیے فیصل کرنے کے لئے راجا انہیں میں سے ایک شخص کو قاضی مقرر کرتا تھا۔ گجرات کے وبھی راجہ عربوں سے رعایتی سلوک کرتے تھے[20]۔

ہندو مذاہب کے پیش نظر اگرچہ کاشی، پریاگ، گیا اور دکن کے مقدس مقامات کو اہمیت حاصل ہے لیکن گجرات کے عبادت خانے، زیارت گاہیں، ندیاں، آبشار وغیرہ بھی کسی طرح تقدس کے اعتبار سے کم اہم نہیں ہیں۔ جینی مذہب نے اگرچہ مگدھ دیش میں جنم لیا مگر اسے فروغ گجرات میں حاصل ہوا۔ اس کے مندر شترنجیا، پالیتانہ، (راجستھان)، نیم ناتھ، گوری پارس ناتھ وغیرہ گجرات میں مرجع خلائق ہیں۔ کرشن جی نے متھرا سے نکل کر کاٹھیاواڑ، گجرات کے شہر دوارکا میں اقامت

اختیار کی وشنومت اور شیومت کے متبرک مقامات دوارکا، ڈاکور، دامودر، رنچھوڑجی، بٹھاسرا، سرانگر، سومناتھ، بھیم ناتھ، گوپ ناتھ، کالکا بھوانی، انبھا بھوانی، باگیری بھوانی وغیرہ کی زیارت کو ان متوں کے پیرو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ بدھ مت کی تاریخ بھی یہ واضح کرتی ہے کہ بدھوں کے لئے گجرات ایک عہد میں جائے پناہ تھی۔ اس خطہ میں ان لوگوں نے اپنے مت کی تبلیغ زور وشور سے کی۔ گجرات میں اشوک کے کتبے اس کے گواہ ہیں۔ سوامی نرائن مت کا بڑا مرکز سورت ہے۔ پرنامی (معراج پنتھی) اور جین مت نامی فرقے کے بھی بڑے مندر سورت میں واقع ہیں۔

ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں پنجاب، اترپردیش، راجستھان، بہار وغیرہ سے زائرین گجرات کے مختلف حصوں میں آتے رہتے ہیں۔ اس طرح مختلف صوبوں کی بولیاں بولنے والے جمع ہو جاتے ہیں۔

گجرات میں نفوس قدسیہ کی آمد ساتویں صدی عیسوی (پہلی صدی ہجری) سے پائی جاتی ہے ہجری کے ابتدائی برسوں میں جو عرب بیڑے بھروچ، بھاڑبھوج، کنبھار وغیرہ کے ساحلوں پر لنگرانداز ہوئے ان میں تابعین اور تبع تابعین بھی تشریف لائے تھے۔ سورت کے مقابل "راندیر" ایک زمانہ میں اہم بندرگاہ تھی۔ راندیر میں ایک تبع تابعی کے مزار کی نشاندہی بھی کی جاتی ہے۔ خلیفہ سفاح عباسی سنہ ۷۴۹ء کے عہد میں کوفہ سے ایک مومن قبیلہ راندیر آیا تھا۔ ان لوگوں نے راندیر میں اشاعت اسلام کی خدمت انجام دی تھی۔ سنہ ۱۱۵۶ء میں وہاں ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی۔ وہ اب تک موجود ہے۔

سنہ ۱۱۲۹ء میں جب سلطان صلاح الدین نے مصر پر قبضہ کرلیا تو وہاں کے بعض اسماعیلیوں نے گجرات میں پناہ لی تھی[21]۔ ایک شخص نورالدین ستاگر نامی سات اماموں کی تبلیغ کرتا تھا گیارھویں صدی میں گجرات میں تبلیغ میں مصروف پایا جاتا ہے[22]۔ اس نے سنہ ۱۰۹۴ء میں وفات پائی۔ امام مستنصر باللہ ۱۰۹۴ء کے عہد میں احمد نامی ایک شخص کو بغرض تبلیغ گجرات بھیجا گیا تھا[23]۔ اس وقت گجرات میں راجہ سدھ راج جے سنگھ حکمران تھا۔ گجرات میں صوفیا کی آمد کا سلسلہ راجہ سدھ راج کے باپ راجہ کرن سولنکی سنہ ۱۰۷۲ء تا سنہ ۱۰۹۴ء کے عہد سے پایا جاتا ہے۔ حضرت حاجی بود اولین بزرگ ہیں جنھوں نے نہروالا پٹن میں سکونت اختیار کی اور سنہ ۱۱۴۱ء میں وہیں وفات پائی۔ شیخ احمد عرفانی متوفی سنہ ۱۲۴۷ء بابا حاجی متوفی ۱۲۷۱ء شیخ احمد دہلوی المعروف بہ بابا دھلیا، خلیفہ شیخ محی الدین علوی دہلوی، متوفی سنہ ۱۱۶۰ء، حضرت قاضی محمود دریائی کے جد اعلیٰ شاہ علی سرمست اور دیگر نے گجرات کو اپنا وطن ثانی بنالیا اور رشد و ہدایت کی خدمت انجام دی۔ سنہ ۱۲۹۶ء میں خلجی کی فتح

گجرات کے بعد بیشمار صوفیا گجرات تشریف لائے۔ ان میں حضرت نظام الدین اولیا کے خلفا خصوصیت رکھتے ہیں۔ ان خلفا میں سے مخدوم سید حسین نے ۱۳۲۹ء میں گجرات کو شرف بخشا اور سنہ ۱۳۹۵ء میں یہیں وفات پائی حضرت شیخ حسام الدین فاروقی ملتانی نے سنہ ۱۳۲۵ء میں گجرات میں مستقل اقامت اختیار کرلی۔ بابا فرید گنج شکر کے نبیرہ شیخ رکن الدین نے بھی اوچھ سے سنہ ۱۳۹۴ء میں گجرات کا رخ کیا اور نہروالا پٹن میں اقامت اختیار کی سنہ ۱۴۳۸ء میں وفات پائی۔ سلاطین گجرات کے دور میں بھی صوفیا کا ورود پایا جاتا ہے۔ ان میں حضرت قطب عالم متوفی سنہ ۱۴۵۳ء اور آپکے فرزند شاہ عالم متوفی سنہ ۱۴۷۵ء حضرت شیخ احمد کھٹو قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ ظاہر ہے کہ گجرات میں عربی فارسی عنصر علاءالدین کی فتح کے قبل ہی سے موجود تھا۔ زبان وادب کی تاریخ سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ بارھویں صدی عیسوی کی گجراتی تخلیقات اور جینیوں کی مذہبی کتابوں میں عربی فارسی الفاظ کا عمل دخل شروع ہوچکا تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی کے سنسکرت کتبوں میں بھی فارسی الفاظ پائے جاتے ہیں پندرھویں صدی میں تو گجراتی میں فارسی دخیل الفاظ کی کثیر تعداد ملتی ہے گلہ

غرض یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ گجرات میں بھی ایک مخلوط بولی رونما ہوئی جس کی بنیاد کوئی مقامی زبان ہی ہوگی اور جو صدیوں تک بازاروں میں بولی جاتی رہی ہوگی اور رفتہ رفتہ اس کو سماجی اہمیت بھی حاصل ہوگئی۔

اُردو کی پیدائش سے متعلق مختلف نظریوں کے جائزہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مقامی زبان کے عنصر اور عربی۔ فارسی، ترکی زبانوں کے عنصر کے اختلاط کی وجہ سے مخلوط بولیاں بعض علاقوں میں وجود میں آئیں۔ ان میں غیر زبانوں کا عنصر مشترک ہے اور مقامی زبانوں کے عنصر میں بھی تھوڑا تھوڑا اشتراک اور قدرے مماثلت ضرور ہے۔ گمان غالب ہے کہ دہلی میں کھڑی بولی کا روپ ابھرا تو پنجاب کی مخلوط بولی اس میں ضم ہوگئی اسی طرح علاءالدین کی فتح گجرات کے بعد شمال سے گجرات کے سیاسی، تجارتی، سماجی تعلقات گہرے ہوگئے اس وجہ سے عربی فارسی عنصر کا گجرات کی مخلوط بولی میں اور بھی اضافہ ہوا اور آگے چل کر مخلوط دہلوی بھی آگئی دہلوی اور گجری کے لسانی عناصر میں بہت زیادہ مماثلت تھی لہذا ان دو کے اختلاط کی وجہ سے ایک بولی نے ایک نئی شکل اختیار کرلی جس نے ارتقائی مدارج طے کرکے اُردو کے نام سے ہندوستان کی ایک موقر زبان کا درجہ حاصل کرلیا۔

گجرات کے بارے میں اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ تحقیق طلب ہے۔ اس بارے میں ماہرین لسانیات کی رائے دلچسپ بھی جاسکتی ہے۔

اگرچہ مخلوط بولی یا بولیاں کسی نہ کسی شکل میں رواج پارہی تھیں بزرگوں کے ملفوظات میں ان لوگوں کے اقوال۔ ‏ س کے وجود میں آنے کی نشاندہی کی جاسکتی ہے لیکن پندرھویں صدی

کے اوائل تک زبان کا کوئی صاف نقش نہیں دیکھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دور کے صوفیاء نے اپنی مقدس خدمات انجام دینے کے لئے علاقائی زبانوں کو اپنا لیا تھا اتنا ہی نہیں بلکہ دوسرے ہندوستانی تہذیبی باتوں کو بھی اختیار کر لیا تھا۔ موسیقی ہندوستان کی تہذیب کا ایک اہم جزو ہے۔ امیر خسرو اور ان کے بعد حضرت بہاء الدین برناوی، حضرت زکریا ملتانی وغیرہ نے ہندوستانی موسیقی میں جو جدتیں دکھلائیں ان سے شمالی ہند کی موسیقی کے نام سے ایک نیا ڈھنگ وجود میں آگیا۔ ان بزرگوں نے ہندی فلسفوں کو اپنایا۔ صوفیا کے متصوفانہ کلام میں متھرا، گوکل، گوپی، کرشن، رام، اترن وغیرہ کو اصطلاحاً، تشبیہاً استعارۃً استعمال کر کے یگانگت و یک جہتی کا ایک درس پیش کیا۔ ہندستانی رہن سہن اختیار کر لیا۔ ناموں میں مٹھن، جوجن، چھجو، بڈھن اختیار کر کے دوئی کو مٹانے کی کوشش کی۔ ادب میں ہندی طرز تخیل اختیار کیا۔ ان تمام باتوں سے اس دور کے ذہن کا پتہ چلتا ہے اور اسی ذہن نے بولی کو مخلوط روپ دیا اور جب اس بولی میں توانائی پیدا ہو گئی تو اس کو اپنے نیک مقاصد کے لئے اختیار کر لیا اس طرح اس کی ادبی تشکیل ہونے لگی۔ اس زبان کے ادبی نمونے پندرھویں صدی سے ملنا شروع ہوتے ہیں۔

یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ اردو کی ادبی تشکیل کب اور کہاں سب سے پہلے عمل میں آئی۔ اب تک تلاش و تحقیق سے کئی ابتدائی کارنامے منظر عام پر آچکے ہیں مثلاً امیر خسرو سے منسوب اردو کلام حضرت بابا گنج شکر سے منسوب اردو کلام، جہانگیر سمنانی کا رسالہ، حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز کا رسالہ معراج العاشقین وغیرہ اردو کے اولین نمونے خیال کئے جاتے ہیں لیکن لسانی نقطۂ نظر سے یا کسی دوسرے وجوہ کی بنا پر ان کے اصل ہونے میں شبہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔

اردو کی ادبی تشکیل کے سلسلے میں ایک شہادت بحر الفضائل سے ملتی ہے۔ اس کے مصنف مولانا محمد فضل الدین بلخی کڑئی شارح مخزن اسرار نظامی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا موصوف نے گجرات کے ایک قصبہ کڑی نامی میں مستقل اقامت اختیار کر لی ہوگی اس لئے نام کے آخر میں لفظ کڑئی لکھا گیا ہے۔

اس کتاب کا کاتب ظریف محمد بن عبد اللطیف قریشی الاسدی نڑیاد (گجرات) کا رہنے والا تھا۔ یہ کتاب سنہ ۳۴۳ء/۸۳۸ھ کی تالیف ہے۔ اس کے آخری باب کے متعلق مولانا فضل الدین محمد لکھتے ہیں:

"باب چہارم در بعض الفاظ ہندوی کہ در نظم ہندوی استعمال کنند۔" شلے

شیرانی صاحب بحرالفضائل کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"ان امور سے واضح ہے کہ گجرات میں ان ایام میں یعنی فرہنگ بحرالفضائل کی تالیف کے وقت ہندی یعنی اُردو میں عام طور پر کافی دلچسپی کا اظہار کیا جاتا تھا"[16]

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :۔

"گجرات میں ہندی نظم کے ابتدائی حامیوں کے نام اور حالات سے ہم قطعاً تاریکی میں ہیں۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ نظم وہاں موجود تھی"[17]

شیرانی صاحب گجرات کے بارے میں اپنے مقالہ میں یہ بھی فرماتے ہیں :۔

"موجودہ معلومات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اُردو زبان کو ادبی شکل سب سے پہلے صوبۂ گجرات میں ملتی ہے"۔[18]

ایک اور مقام پر شیرانی صاحب فرماتے ہیں :۔

"قرائن اور آثار سے پایا جاتا ہے کہ گجرات میں شروع ہی سے مسلمان اُردو بولتے رہے ہیں"۔[19]

ادبی تشکیل کے سلسلہ میں ڈاکٹر سید محی الدین زور صاحب اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں :۔

"گجرات کی اُردو کے قدیم مخطوطے ہنوز محفوظ ہیں اگرچہ بالکل ادبی رنگ کے نہیں مگر ان سے ثابت ہوتا ہے کہ گجرات میں یہ زبان اس قدر ترقی کر گئی تھی کہ اس کا مقصد استعمال یقیناً ادبی بھی ہوگا"۔[20]

گجرات میں مستقل تصانیف کا سلسلہ پندرھویں صدی عیسوی سے پایا جاتا ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس سے پہلے ہی یہ سلسلہ شروع ہوچکا ہوگا۔ گجری ادب کے بارے میں ابھی تحقیقی کام خاطر خواہ نہیں ہو پایا ہے ممکن ہے آیندہ پوشیدہ کارنامے منظر عام پر آجائیں۔

گجرات میں اُردو کی ادبی تشکیل کے لئے حالات بہت سازگار تھے۔ سنہ ۱۲۹۶/۶۹۶ھ سے دہلی اور گجرات کے سیاسی تعلقات نے دو مخلوط بولیوں کو آپس میں بغلگیر ہونے کا موقع دیدیا تھا۔ سنہ ۱۳۹۸/۸۰۱ھ میں تیموری حملہ نے دہلی سے علماء، شرفا اور دوسرے لوگوں کو ہجرت کر کے گجرات آنے پر مجبور کر دیا تھا ان لوگوں کی آمد سے مخلوط زبان کو اور بھی تقویت مل گئی۔ اُردو کو برتنے اور ادبی زبان بنانے میں صوفیا کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ اس زمانے میں تقریباً تمام خانوادوں کے نمائندے اپنے نیک مقاصد کو انجام دینے میں سرگرم عمل تھے۔ سنہ ۱۴۰۶/۸۱۰ھ میں گجرات

میں خود مختار مسلم حکومت کا قیام عمل میں آگیا تھا۔ یہ سلاطین گجرات ہندی نژاد تھے اور انہیں اُردو سے دلی لگاؤ تھا۔

سلاطین گجرات کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ یگانگت و یک جہتی ان کا مطمع نظر رہا ہے۔ ان کے دورِ حکومت کی تہذیب و تمدن کو کسی بھی زاویۂ نظر سے دیکھا جائے ان کی ہندستانیت واضح ہوگی ان کا یہ رجحان اُردو کے پنپنے میں بہت معاون ثابت ہوا۔ ان سلاطین نے اپنی اُردو دوستی کے کئی عملی ثبوت بھی دئے ہیں۔ دہلی سے ظفر خان (بانئ سلطنت گجرات) کو گورنر مقرر کر کے گجرات بھیجا گیا۔ اس وقت راستی خان گجرات میں گورنر کے عہدہ پر فائز تھا۔ ظفر خان کو راستی خان سے جنگ کر کے گجرات کا قبضہ لینا پڑا تھا جس مقام پر راستی خان کو شکست دی گئی تھی اس کو جیت پور نام دیا گیا حالانکہ اس کو فتح پور بھی کہا جا سکتا تھا۔ سلطان محمود بیگڑا کے نام میں لفظ بیگڑا ہندوستانیت کا شاہد ہے۔ گجراتی زبان میں بیگڑو اس بیل کو کہتے ہیں جس کے دونوں سینگ اندر کی طرف مڑے ہوئے ہوتے ہیں چونکہ محمود اپنی لمبی مونچھوں کو اسی طرح اوپر چڑھا کر باندھتا تھا اس لئے اس کو بیگڑو اور بیگڑا کہتے تھے۔ ایک دفعہ ایک سنار محمود کے لئے سر صبح ستار یا کوئی ساز لے جارہا تھا۔ راستہ سے قاضی نجم الدین قاضی شہر کی سواری جارہی تھی۔ قاضی صاحب نے ستار اسی وقت تڑوا دیا۔ سنار نے سلطان سے ماجرا بیان کیا اس پر سلطان نے بگڑ کر کہا "نیچی بیری ہر کوئی جھوڑے" سلطان قطب الدین نے ایک حوض بنوایا تھا۔ اس کا نام کانکریا تلاؤ ہے۔ اس تالاب کے اطراف گرد شاہی محلات تھے ان کو گھٹا منڈل نام دیا گیا تھا۔ عہد سلاطین میں بندر دیو کے گورنر ملک ایاز نے دیو بندر پر جہازوں کا بلا اجازت داخلہ روکنے کے لئے پانی میں اندر اور اوپر موٹی موٹی زنجیریں ڈلوادی تھیں جس کو سنکل کوٹ کہا جاتا تھا۔ اُردو کی ہر دلعزیزی کی ایک شہادت ایک مسجد کے اُردو کتبہ سے بھی ملتی ہے۔ احمد آباد کے محلہ رائے کھڑ کی ایک مسجد میں اس کی تعمیر کی تاریخ کا کتبہ اس طرح ہے۔

فنا دیں سبھا نگر باندے شاجی پال
بانو مسجد کے تیں بھیجیں ملک جلال
تاریخ اس بیت کی ہوئی سو یوں مشہور
مسجد جامع کے بیچ ڈھایا ہے نور

۹۶۳ھ

یہ کتبہ گجرات میں اُردو کی مقبولیت کا غماز ہے۔ اُردو زبان میں اس کتبہ کو اولیت کا فخر حاصل ہے۔ غرض پندرھویں صدی کے نصف آخر میں اُردو ادبی شکل اختیار کر چکی تھی اور سولھویں صدی کے اوائل سے گجرات میں مستقل تصانیف کا سلسلہ پایا جاتا ہے۔ اس ابتدائی دور کے مصنفین میں شاہ بہاؤ الدین باجن، قاضی محمود دریائی، علی جیوگام دھنی، خوب محمد چشتی کے نام اور ان کے ادبی کارنامے منظر عام پر آ چکے ہیں۔

اُردو کئی ناموں سے یاد کی گئی۔ مثلاً ہندی، ہندوی، ہندوستانی، زبان ہندوستان، ریختہ زبان اردوے معلی وغیرہ۔ علاقائی مناسبت سے اُردو کے نام گجری اور دکنی سب سے زیادہ قدیم ہیں۔

زبان کا نام گجری سنسکرت ذہن گجری یعنی بازار کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ شاید یہ زبان اپنی مخلوط بولی کی منزل میں بازاروں میں بولی جاتی تھی اس وجہ سے زبان گجری کی بجائے نام گجری قرار پایا ہوگا۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ گجرات خصوصاً احمد آباد، خاندیس، مدھیہ پردیس اور شاید دکن کے کچھ حصوں میں بھی ہفتہ وار بازار کو عام اصطلاح میں گجری کہا جاتا ہے۔ برہانپور میں ایک محلہ کا نام تانا گجری ہے۔ ممکن ہے ایک زمانہ میں وہاں تانا بانا کا بازار لگتا ہو کیونکہ یہ شہر عہد قدیم سے آج تک کپڑے کی صنعت کے لئے خصوصیت رکھتا ہے۔ گجراتی زبان میں گجری اس گڑیا کو کہتے ہیں جس کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک دیا ہوتا ہے۔ اگرچہ مخلوط بولی کو پہلے پہل بازاروں ہی سے گہرا تعلق رہا ہی اور بازاروں ہی میں اس کا روپ نکھرا ہے اسی طرح ہندوستانی زبانوں اور عربی فارسی کے عناصر کو دو دیے قرار دیا جا سکتا ہے اور اس طرح لفظ گجری کی وجہ تسمیہ بیان کرنے میں قیاسات کو بہت کچھ دخل دیا جا سکتا ہے تاہم اس خیال کو ماننے میں تامل ہوتا ہے۔ درحقیقت گجری نام گجرات کی مناسبت سے دیا گیا ہے اور یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس بارے میں خوب محمد چشتی کے بعض اشعار سے یقین ہو جاتا ہے۔ اشعار آگے نظر سے گذریں گے۔

مخلوط زبان اُردو کے نام سے مشہور ہوئی اس سے قبل اس کو ہندی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ہندی نام مغالطہ میں ڈال دیتا ہے سنسکرت کے لئے بھی باہر سے آنے والوں یا فارسی دانوں نے لفظ ہندی اور مقامی رائج الوقت زبانوں کے لئے ہندی اور ہندوی دونوں نام استعمال کئے ہیں اسی طرح صوفیوں کے ہاں مخلوط بولی کے لئے بھی ہندوستان کی مناسبت سے نام ہندی ملتا ہے اردو کے لئے میر تقی وغیرہ کے عہد تک ہندی نام ملتا ہے۔ صوفیا نے ہندی یعنی علاقائی رائج الوقت زبانوں کو اپنایا تھا اور زبانوں کو ہندی ہی کہتے تھے۔ جب اُردو کا چلن بڑھتا گیا تو صوفیا نے اس کو بھی اپنا لیا۔ اس بارے میں ذیل کا اقتباس

کافی ہوگا :

"گمان نکنند کہ ہیچ اولیا بہ زبان ہندی تکلم نکردہ زیراکہ اوّل از جمیع اولیا قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والملتہ والدین قدس سرہ بدیں زبان سخن فرمودہ بعد ازآں حضرت گنج شکر قدس اللہ سرہ و حضرت خواجہ گنج شکر در زبان ہندی و پنجابی بعضے از اشعار نظم فرمودہ چنانکہ در مردم مشہور اند"

ایسی کئی شہادتیں ملتی ہیں کہ صوفیا درس و تدریس میں بھی مخلوط زبان کو استعمال کرتے تھے۔

اب تک کی تحقیقات کی روشنی میں دیکھا جائے تو گجرات کے ایک بزرگ شیخ بہاء الدین باجن کی تخلیقات کو اولیت کا فخر حاصل ہے۔ باجن اپنی ایک نظم کو حسب ذیل سرخی دیتے ہیں:

"ایں مناجات بہ زبان ہندوی گفتہ شدہ است:"

تیرے پنتھ کوئی چل نہ سکے ۔ جو چلے سو چل چل تھکے
پڑھ پنڈت پوتھی دھویاں سب جان سدھ بدھ کھویاں
سب جوگیوں جوگ بسارے سبھ نپٹی تپ بکارے (وغیرہ)

باجن اپنی ایک دوسری نظم کو یہ سرخی دیتے ہیں :۔

"مناقب حضرت ایشاں بہ زبان دہلوی نبشتہ شدہ است" (شیرانی صاحب)

مناقب ہ
جب راوت جھوجھن جاوۂ تب توں آگیں ہووا جائیں
جھوجھ کر باہر جاوۂ تب توں پچھیں ہووا آئیں
باجن برو وہی جو خدا فرمایا محمد کی کا فرنہ سوں ونڈ لایا

مذکورہ بالا اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ باجن نے جس زبان کو ہندوی کہا ہے وہ مخلوط بولی کا روپ ہے اور جس کو دہلوی زبان کہا گیا ہے وہ دہلی کی رائج الوقت ہندی زبان معلوم ہوتی ہے۔ خزانۂ رحمت کا جو نسخہ برہانپور میں دستیاب ہے اس میں دو نظموں پر لفظ گوجری لکھا ہوا ہے اور اس میں لفظ دہلوی کسی نظم پر درج نہیں ہے۔

پہلے پہل ہندی اور گجری دونوں نام مخلوط بولی کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ احمدآباد کے دور اوّل کے بزرگ علی جیو گام دھنی کے کلام جواہر اسرار اللہ کے شارح گام دھنی کے کلام کی زبان کو گجری کہتے ہیں لیکن (تاریخ گجرات) مرآت احمدی کا مصنف گام دھنی کے سلسلہ میں لکھتا ہے :

"دیوانے دارد بہندی زبان در روش و معنی برابر دیوان شیخ مغربی است"

قاضی محمود دریائی (بیرپور گجرات) کی زبان کے متعلق مجموعۂ ملفوظات تحفۃ النصاری میں گجری اور ہندی دونوں نام ملتے ہیں اور مرأت احمدی میں ان کی زبان کے لئے لفظ ہندی استعمال کیا گیا ہے۔

گجرات کے ایک بزرگ خوب محمد چشتی (۱۰۲۳ھ) کا ایک شعر ہے:

جیوں میری بولی منہ بات   عرب عجم مل ایک سنگات

اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

"من بزبان گجرات کہ الفاظ عربی و عجمی آمیز است گفتہ"

اپنے ایک رسالہ بھاؤ بھید میں فرماتے ہیں:

"صنائع بدائع را بزبان گجرات از جہت یادداشت می گویم۔"

خوب صاحب کا ایک اور شعر ہے:

جیوں دل عرب عجم کی بات   سن بولے بولی گجرات

دور اول یعنی سنہ ۱۰۲۳ء تک کے صوفیا کے بعد تیرھویں صدی تک گجرات میں شعراء نے اپنی زبان کو زیادہ تر گجری ہی کہا ہے۔ بعض جگہ اس زبان کے لئے نام ہندی بھی نظر سے گذرتا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک تو یہ کہ مخلوط بولی اپنے ارتقائی مدارج طے کر کے سب سے پہلے گجرات میں ادبی شکل اختیار کرتی ہے۔ دوسرے اس میں عربی فارسی کے ساتھ گجراتی عنصر بھی شامل ہے۔ تیسرے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پندرھویں صدی میں جب قدیم گجراتی سے جدید گجراتی کا روپ ابھر رہا تھا اس انقلاب سے متاثر ہو کر اردو کی مخلوط بولی میں بھی پہلے کی بہ نسبت عربی فارسی عنصر کے زیادہ ہونے کے باعث گجراتی کے ساتھ ساتھ اردو کا روپ بھی ابھر کر الگ حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس عہد میں عربی فارسی کے عنصر کا اضافہ سلاطین کے عہد کے عربی علوم اور فارسی کی ادبی تحریکوں کا سبب ہے دوسری طرف صوفیا کو بھی اپنے مقاصد کی برآری میں ایسی ہی زبان کا تقاضا تھا جس میں مذہب و تصوف کی اصطلاحیں خوش اسلوبی سے استعمال کی جا سکیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ گجری کا حلقۂ اثر دکن تک وسیع تھا اگرچہ دکنی کی مخلوط بولی زبان کی منزل تک پہنچ چکی تھی۔ عبدالقادر سروری، شیخ عین الدین گنج العلم سنہ ۱۳۰۶/۷۰۶ء تا سنہ ۷۹۶-۱۳۹۹ء کے متعلق لکھتے ہوئے علی گڑھ تاریخ ادب اردو (۱۵۱) میں فرماتے ہیں کہ:

اُردو (۱۹۵۱ء) میں فرماتے ہیں کہ

"قرائن سے پایا جاتا ہے کہ دکنی زبان حضرت شیخ عین الدین کے زمانہ تک مشخص اور متعین ہو چکی تھی اور اس نام سے موسوم کی جانے لگی تھی"

اس کے باوجود حضرت شمس العشاق میراں جی کے فرزند حضرت برھان الدین جانم اپنی تخلیقات کی زبان کو جگہ جگہ گجری کہتے ہیں۔ مثلاً

"سبب" یو زبان گجری نام ایں کتاب کلمۃ الحقائق (کلمۃ الحقائق)

جیسے ہوویں گیان بچاری — نہ دیکھیں بھا کا گجری (حجۃ البقا)

یہ سب گجری زبان — کر یہ آئینہ دیا نما (ارشاد نامہ)

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ایک ادبی ذریعہ اظہار کی حیثیت سے گجری کا حلقہ اثر اچھا خاصا وسیع ہوگا۔

الغرض گجری کا ابتدائی روپ وہ ہے جو سب سے پہلے گجرات کی رائج الوقت زبان کی بنیاد پر ہندوستانی اور غیر ہندوستانی عناصر کے امتزاج اور تحلیل سے ابھرتا ہے اور بعد میں دہلوی روپ اور گجری روپ اپنے خمیر اور مزاج کی یکسانیت کی وجہ سے بغلگیر ہو کر کثرت میں وحدت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس اتحاد سے اس میں توانائی آجاتی ہے جس کو بعض صوفیائے گجرات اپنے تصوفی مقاصد کی برآوری کی غرض سے ادبی صورت بخش دیتے ہیں۔ اگرچہ کچھ مدت تک تغیری دور سے گذرتے ہوئے یہ دہلی میں دہلوی، گجرات میں گجری اور دکن میں دکنی کے نام سے یاد کی جاتی ہے مگر مجتہد العصر ولی اپنے اجتہاد سے کام لیتا ہے اور اس تفریق کو مٹا کر شمال و جنوب کے لئے واحد ادبی زبان کو رواج دیتا ہے۔ اسی وجہ سے ولی اپنی زبان کو گجری نہیں کہتا بلکہ کہیں ہندی کہتا ہے اور کہیں ریختہ نام دیتا ہے۔

حوالے

۱۔ راندیر قدیم آبادی ہے۔ وہاں ایک تبع تابعین کے مزار کی نشان دہی کی جاتی ہے عربوں کے بحری بیڑوں کے ساتھ بمقام بھروچ بعض صحابہ بھی تشریف لائے تھے (عرب و ہند کے تعلقات)

۲۔ مجالس سینیہ۔ ابوظفر ندوی

۳۔ پنجاب میں گجران والا، ضلع گجرات گرجروں کی یادگاریں ہیں (کاہی سیرٹ اور ٹی)

(۴) تاریخ گجرات۔ ابوظفر ندوی (۵) کامی سیریٹ۔ فنشی (۶) کامی سیریٹ۔ (۷) عرب وہند کے تعلقات (۸) کامی سیریٹ (۹) کامی سیریٹ۔ یادایام (۱۰) کامی سیریٹ (۱۱) کامی سیریٹ۔ ابوظفر۔ (۱۲) کامی سیریٹ۔ کہا جاتا ہے کہ کاٹھیاواڑ گجرات کے چرواہوں کی قوم میر رم۔ ی۔ ر۔ یونانی النسل ہے۔ (۱۳) بحوالہ کامی سیریٹ۔ (۱۴) کامی سیریٹ (۱۵) تجارتی تعلقات پہلے سے قائم ہوں گے (۱۶) نقوش سلیمانی۔ مولانا ندوی (۱۷) نقوش سلیمانی۔ مولانا ندوی (۱۸) نقوش سلیمانی۔ مولانا ندوی (۱۹) انعلوئنس آف اسلام۔ ڈاکٹر تارا چند (۲۰) عرب وہند کے تعلقات (۲۱) تاریخ گجرات۔ ابوظفر (۲۲) تاریخ گجرات ابوظفر (۲۳) تاریخ گجرات۔ ابوظفر (۲۴) گجراتی پر فارسی کا اثر۔ گجراتی۔ ڈاکٹر چھوٹو بھائی نائک۔
25 26 - ۲۷ - ۲۸ - ۲۹ - مقالات شیرانی (۳۰) ہندوستانی لسانیات۔ سید محی الدین قادری (۳۱) کامی سیریٹ (۳۲) رسالہ اُردو اپریل ۱۹۳۸ء مولوی عبدالحق (۳۳) اُردو کی نشوونما میں صوفیہ کرام۔ مولوی عبدالحق۔ (۳۴) برہانپوری نسخہ میں اس نظم پر لفظ ہندی لکھا ہوا ہے۔ (۳۵) برہانپوری نسخہ میں اس پر لفظ دہلوی نہیں ہے۔

تمام تاریخیں ارکالاجیکل سروے سے لی گئی ہیں

وہ ہندوستان میں سیاسی فاتحین کی حیثیت سے مسلمانوں کی آمد سے قبل عرب اور ایرانی تاجروں کی حیثیت سے آباد تھے بلکہ بعضوں نے گجرات کو اپنا وطن ثانی بنایا تھا اور وہ یہیں پیوند خاک بھی ہوئے۔ ان کی زبانوں یعنی عربی اور فارسی سے یہاں کے لوگ مانوس تھے۔ اس جگہ مسجدوں اور مزاروں کے کتبوں کی چند شہادتیں ملاحظہ کیجئے!

۱۔ تعمیر مسجد بمقام سومناتھ پٹن (کاٹھیاواڑ) سنہ ۶۶۲ھ مطابق ۱۲۶۴ء

۲۔ کتبۂ تاریخ وفات تاجر شمس الدولت والدین حسن بن محمود بن علی العراقی بمقام سومناتھ پٹن ۶۹۰ھ/ ۱۲۹۹ء

۳۔ کتبۂ تاریخ وفات معلم ابن حسن کھنباتی بمقام راندیر ۶۳۲ھ مطابق ۱۲۳۶ء

۴۔ تاسیس مسجد بمقام جوناگڑھ ۶۸۵ھ مطابق ۱۲۸۶ء

۵۔ کتبۂ تاریخ وفات فخر الدین ابراہیم بن عبدالملک بن صدیق شہرزوری ۶۸۱ مطابق ۱۲۸۲ء (کھنبایت)

۶۔ " " " زین الدین بن سالار ۶۸۵ھ مطابق ۱۲۸۶ء کھنبایت۔

۷ ۔ کتبۂ تاریخ وفات ملک التجار حاجی ابراہیم بن محمد علی الاربلی المعروف بہ نتولیا۔ ۶۹۰ھ مطابق (۱۲۹۱ء۔ کھنبایت)

۸ ۔ " " " شمس الدین محمد بن علی بن یحییٰ الزجری ۔ ۷۰۷ھ مطابق ۱۳۰۷ء کھنبایت

۹ ۔ " " " مصباح آزاد غلام زین الدین بن ظفر الملازوری۔ ۷۰۹ھ مطابق ۱۳۰۹ء کھنبایت ۔

۱۰ ۔ " " " امین الدین کافور آزاد غلام مرحوم شرف الدین مہدی بن محمد الہمدانی ۷۱۴ھ مطابق (۱۳۱۴ء کھنبایت)

۱۱ ۔ تعمیر مسجد از ملک شمس الدین ۔ ۷۱۸ھ مطابق ۱۳۱۸ء مقام دھولکا ۔ احمد آباد ۔ ضلع

۱۲ ۔ کتبۂ تاریخ وفات زین الدین علی بن نجیب الخنوری ۷۳۱ھ مطابق ۱۳۳۱ء ۔ کھنبایت

۱۳ ۔ " " " حسن بن ابوبکر علی گر ۷۳۳ھ مطابق ۱۳۳۲ء کھنبایت

پہلا باب

سیاسی سماجی پس منظر

۱۴۰۰ء / ۸۰۴ھ تا ۱۶۵۰ء / ۱۰۶۰ھ

۱۲۹۶ء/ ۶۹۶ھ میں علاءالدین خلجی کی فتح گجرات کے بعد سے ۱۴۰۰ء/ ۸۰۴ھ تک گجرات کے لئے سلطنت دہلی کا مقرر کردہ ناظم آتا رہا۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک سو سال قائم رہا۔ فیروز تغلق کے عہد سے سلطنت دہلی ڈانواڈول ہو چکی تھی۔ اور مختلف علاقوں میں صوبیدار خود مختار حکومتیں قائم کرنے کے لئے موقع کے منتظر تھے۔ ۱۳۹۱ء میں گجرات میں راستی خاں فرحت الملک ناظم تھا۔ اس کے ظلم و ستم کے خلاف دہلی شکایتیں پہنچ چکی تھیں۔ اس بنا پر دہلی سے ظفر خاں بن وجیہ الملک کو سند نظامت دیکر ۱۳۹۱ء میں گجرات بھیجا گیا۔ ظفر خاں نے نہروالا پٹن پر راستی خاں کو پیغام بھیجا۔ لیکن راستی خاں نے پرواہ نہیں کی۔ آخر پٹن کے قریب کمبوئی مقام پر جنگ ہوئی اور راستی خاں بھاگ نکلا یا مارا گیا۔ اس طرح ظفر خاں ۱۳۹۲ء سے ناظم کی حیثیت سے فرائض انجام دیتا رہا۔ جس میدان میں جنگ کھیلی گئی تھی اس کو ظفر خاں نے جیت پور نام دے کر آباد کر دیا۔

ظفر خاں ۱۴۰۷ء تک ناظم کی حیثیت سے نہایت دیانتداری اور وفاداری سے کام کرتا رہا۔ اس وقت دہلی کے حالات بد سے بدتر ہو رہے تھے۔ ۱۳۹۸ء/ ۸۰۰ھ میں دہلی پر امیر تیمور کا حملہ ہوا اس نے حالات اور بھی خراب کر دئے۔ ظفر خاں کا بیٹا تاتار خاں جو دہلی میں وزیر کے عہدہ پر فائز تھا تمام بدنظمی اور امرا کی نوچ کھسوٹ میں برابر کا حصہ دار تھا۔ اس نے ۱۴۰۳ء میں گجرات آکر فوج فراہم کرنا شروع کیا اور اپنے باپ کو سمجھاتا رہا کہ دہلی پر قبضہ کر لینے کے لئے یہ اچھا موقع ہے لیکن جب

ظفر خاں نہ مانا تو تاتار خاں نے باپ کو قید کر دیا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے دہلی کی طرف بڑھ گیا۔ ظفر خاں نے اپنے بھائی شمس خاں کو حالات سے آگاہ کیا۔ بلکہ اپنے بیٹے تاتار خاں کو زہر دینے کا مشورہ بھی دیا۔ شمس خاں نے ایسا ہی کیا۔ اور ظفر خاں کو قید سے آزاد کرا دیا۔ ۱۴۰۷ء میں دہلی سلطنت کے حالات ایسے ابتر ہوئے کہ امراء نے ظفر خاں کو خود مختاری کا اعلان کرنے پر مجبور کر دیا۔ ظفر خاں مظفر شاہ کے لقب سے گجرات کا پہلا خود مختار سلطان قرار پایا۔ ۱۴۱۰ء میں مظفر شاہ بیمار پڑا۔ اس نے اپنے پوتے احمد بن تاتار خاں جس کو کئی سال امور سلطنت سے نمٹنے کی تربیت دی تھی تخت و تاج کا مالک بنا کر الگ ہو گیا اور اس کے پانچ ماہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

شہزادہ احمد سلطان احمد شاہ کے لقب سے ۱۴۱۱ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس نے ۱۴۱۱ء میں شہر احمد آباد بسایا اور صدر مقام پٹن سے منتقل ہو کر احمد آباد آ گیا۔ احمد شاہ نے ۱۴۴۲ء میں وفات پائی۔ یہ بہت بہادر اور دیندار سلطان تھا۔ اس نے ایک طرف راجپوتوں سے اور دوسری طرف ماہم (قریب بمبئی) کے سلسلہ میں بہمنی حکومت سے جنگیں کیں اور اپنا لوہا منوایا۔ اس کا زیادہ وقت جنگ و جدال میں گذرا۔ لیکن شاید ہی کبھی اس نے شکست کا منہ دیکھا ہو۔ مورخین نے اس کی دینداری کی بہت تعریف کی ہے۔ چند امراء اس سے ناراض تھے۔ کہ وہ ان کی بیٹیوں کو اپنے نکاح میں لانا چاہتا تھا۔ احمد شاہ انصاف پسند بھی تھا۔ ایک واقعہ میں اس نے اپنے داماد کو سر بازار سولی پر چڑھوایا تھا۔

احمد شاہ اول کے بعد اس کا بیٹا محمد شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ بڑا فیاض اور بکھ لٹ سلطان تھا۔ اس کو زر بخش کہا جاتا تھا۔ ۱۴۴۴ء اور ۱۴۴۹ء میں اس نے ایڈر اور چانپانیر پر حملے کئے تھے۔ سندھ کے امیر جام کی ایک بیٹی بی بی مغلانی سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ جام کی دوسری بیٹی بی بی میرگی شاہ عالم بخاری کی منکوحہ تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے بی بی مغلانی حضرت شاہ عالم سے منسوب تھیں۔ لیکن یہ بہت حسین تھیں اس لئے بی بی مغلانی کو سلطان نے اثر رسوخ سے اپنے سے منسوب کرا لیا۔ اس پر شاہ عالم نے اپنے والد حضرت قطب عالم سے شکایت کی۔ قطب عالم نے فرمایا "تیجے نصیب وچ دو ہوں" بی بی مغلانی سے محمود بیگڑا پیدا ہوا تھا۔ جو بعد میں گجرات کا نامی گرامی سلطان ہوا۔ اس عہد میں یعنی ۱۴۴۶ء میں حضرت شیخ احمد کھٹو کا وصال ہوا۔ اس عہد میں اسماعیلیوں سے جدا ہو کر ایک بزرگ حضرت امام شاہ گجرات آئے تھے۔ ان کا تبلیغ کا طریقہ اسلام کے بالکل منافی تھا۔ ان کے خلیفہ کاکا کہلاتے ہیں۔ اور پہلے مخفی طور پر مسلمان

ہوتے ہیں اور بعد میں ظاہر کردیا جاتا ہے۔اس کو'پرگٹ' ہونا کہا جاتا ہے۔انکے رسم و رواج ہندوانہ ہیں۔پیر پرستی اور قبر پرستی ان کا شعار ہے۔ان کے پیروؤں کو ہندو ہندو نہیں مانتے۔اور مسلمان مسلمان نہیں کہتے۔ان کا صدر مقام احمد آباد کے قریب پیرانہ کے نام سے مشہور ہے۔امام شاہ نے ۱۵۱۳ء یا ۱۵۲۰ء میں انتقال کیا۔ان کا مزار پیرانہ میں ہے۔اس تحریک نے بھی مخلوط بولی کے ابھرنے میں مدد کی تھی۔محمد شاہ نے ۱۵۴۱ء میں انتقال کیا۔

محمد شاہ کے بعد اس کا بڑا بیٹا جلال خاں قطب الدین احمد شاہ دوم کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔اس کے عہد میں مالوہ اور چتوڑ کی جنگیں اہمیت رکھتی ہیں۔محمد شاہ کے انتقال پر اس کی بیوہ بی بی مغلانی اپنے شہزادہ فتح خاں (بیگڑا) کو لے کر حضرت شاہ عالم کے ہاں اپنی بہن کے ساتھ رہنے لگیں۔اتفاق سے بی بی میر کا انتقال ہوگیا۔شاہ عالم نے بی بی مغلانی سے کہا کہ اب تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔بی بی مغلانی نے شاہ عالم سے خود کو اپنے نکاح میں لینے کے لئے درخواست کی۔حضرت نے ایسا ہی کیا۔اس طرح قطب عالم کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔قطب الدین کے دل میں فتح خاں کی طرف سے ہمیشہ اندیشہ رہتا تھا۔اس لئے وہ فتح خاں کو قتل کرادینا چاہتا تھا۔ایک دفعہ کسی نے اطلاع دی کہ فتح خاں شاہ عالم سے درس لے رہا ہے۔جب سلطان کے سپاہی اس کو گرفتار کرنے گئے تو شاہ عالم سمجھ گئے اور یہ الفاظ کہے "پڑھ بے ڈوکرے" یعنی پڑھ بڈھے۔سپاہیوں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص شاہ عالم سے کچھ پڑھ رہا ہے یہ دیکھ کر سپاہی وہاں سے چلے گئے۔قطب الدین کو تعمیرات سے بہت شغف تھا۔اس کے زمانے کے حوض قطب نگینہ باغ گھٹا منڈل حضرت شیخ احمد کھٹو کا روضہ اور مسجد ملک شعبان کا مقبرہ وغیرہ مخلوط تہذیب کے یادگار نمونے ہیں۔سلطان قطب الدین بہت شجاع تھا۔یہ اپنی تند مزاجی اور شراب نوشی کی وجہ سے بدنام تھا۔کہا جاتا ہے کہ اس کو اس کی بیوی نے زہر دے کر مار ڈالا۔اس کی عمر ۲۹ سال تھی۔

۱۴۵۸ء میں قطب الدین کے چچا داؤد کو تخت پر بٹھلایا گیا۔لیکن سات یا ستائیس ماہ کے بعد ہی اہل دربار نے فتح خاں کو تخت پر بٹھا کر اس کو سلطان تسلیم کرلیا۔فتح خاں کا لقب محمود شاہ اول (بیگڑا) تھا۔بیگڑا کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس کی مونچھیں بہت لمبی تھیں۔وہ انہیں اوپر باندھ لیا کرتا تھا۔گجراتی میں جس بیل کے دونوں سینگ اندر کی طرف مڑے ہوئے ہوتے ہیں۔اس کو ویگڑو بیل کہتے ہیں اس کے پیش نظر محمود شاہ کو بھی بیگڑو کہتے تھے۔اردو میں ڈ ب سے بدل گئی۔بیگڑا نے چون سال حکومت کی۔

بیگڑا گجرات کا دوسرا سدھراج جے سنگھ مانا جاتا تھا۔ اس کے عہد میں سلطنت کا رقبہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ بہت بہادر اور قابل جرنیل تھا۔ اس نے جونا گڑھ ۱۴۷۰ء میں فتح کیا اور اس کو مصطفیٰ آباد نام دیا۔ ۱۴۷۲ء میں کچھ پر فتح حاصل کی اور گجرات کی سرحد کے قریب سندھ پر بھی حملہ کیا تھا۔ اس کی سب سے اہم فتح چانپانیر ہے۔ چانپانیر کو فتح کرکے محمد آباد نام دیا۔ وہاں مساجد و محلات تعمیر کرائے۔ ایک مدت تک اس کو صدر مقام کا درجہ حاصل رہا۔ اس نے ۱۴۷۳ء میں دوارکا پر حملہ کیا اور فتح مند لوٹا۔ ابتدائی پانچ سات سال جنگ و جدال میں گذار کر تقریباً نووس سال سلطنت کے نظم و نسق کی نگرانی کرتا رہا۔ اسی عہد میں احمد آباد کے قریب اس نے محمود آباد کے نام سے شہر آباد کیا تھا۔ اس کے عہد میں پرتگالی گجرات آئے اور آہستہ آہستہ اپنے قدم جما لئے۔ بیگڑا کے عہد کی ایک اہم مذہبی تحریک مہدوی تحریک ہے حضرت سید محمد جونپوری ۱۴۹۹ء میں احمد آباد آئے اور وہاں مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس تحریک نے گجرات میں زور پکڑا۔ ۱۵۲۳ء/۹۳۰ھ تک ایک کثیر تعداد مہدویہ فرقہ میں شامل ہو گئی۔ ریاست جالور راجپوتانہ اور پالن پور گجرات کے رئیس اس فرقہ سے منسلک ہوئے اور آج تک پالن پور کے نواب خاندان کا یہی مشرب ہے۔ بیگڑا کے عہد میں گجرات بہت ہی سرسبز و شاداب اور خوش حال تھا۔ دہلی کے حکمراں سکندر لودھی نے گجرات کے سلطان کو دوستانہ تعلقات کی پیش کش کی تھی اور کہا تھا: "مدار بادشاہی دہلی بر گندم و جوار است و بنیاد بادشاہ گجرات بر مرجان و مروارید۔"

بیگڑا نے ۱۵۱۱ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا ولی عہد خلیل خان تخت نشین ہوا۔

شہزادہ خلیل خاں ۴۰ سال کی عمر میں مظفر شاہ دوم کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں بھی راجپوتوں سے زور آزمائی ہوئی۔ اس نے مانڈو کے سلطان محمود خلجی دوم کو اس کے بھائی کے خلاف جنگ میں مدد کی تھی۔ مظفر شاہ نے ترپن سال کی عمر میں بہ سنہ ۱۵۲۶ء وفات پائی۔

مظفر شاہ دوم کے عہد میں ہندو مسلمان میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی تھی کئی اعلیٰ عہدوں پر ہندو فائز تھے ان میں ملک گوپی سورت اور بھروچ کا گورنر شہرت رکھتا ہے۔ سورت میں گوپی کی یادگار گوپی تالاؤ مشہور ہے۔ اس عہد میں کاٹھیاواڑ کا گورنر ملک ایاز بھی اہم شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے دیو کی بندرگاہ میں جہازوں کی بلا اجازت آمد و رفت روکنے کے لئے پانی کے اندر اور باہر لوہے کی زنجیریں ڈلوادی تھیں۔ اس کو سنکل کوٹ کہتے تھے۔ مظفر شاہ کو تعمیرات کا بھی بہت شوق تھا۔ اس کے عہد کی تعمیرات میں رانی سیپری کی مسجد فن تعمیرات اور کشش میں ایک عجوبہ ہے

محمود بیگڑا کی ایک رانی بی بی رانی تھی۔ اس کو شبہ رانی (شاید خطاب) کہا جاتا تھا شبہ رانی سے بگڑ کر سپری ہوگیا۔ یہ سکندر شاہ کی ماں تھی۔ اس رانی کے نام پر سپری مسجد تعمیر کی گئی۔ اس مسجد کی تعمیر کا عیسوی سنہ ۱۵۱۴ء ہے

مظفر شاہ کو اس کے حلم کی وجہ سے مظفر حلیم کہا جاتا تھا۔ اس کا حلم سیاسی امور میں کمزوری سمجھا جاتا تھا۔ مظفر میں بڑی خوبیاں تھیں۔ یہ دیندار تھا۔ عالم تھا۔ فن کتابت میں ماہر تھا۔ گھوڑا سواری اور تلوار بازی میں بھی خوب مہارت رکھتا تھا۔ اس کی دینداری کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ اس کا گھوڑا بیمار ہوگیا تو اس کو دوا کے طور پر شراب پلائی گئی۔ جب مظفر کو پتہ چلا تو اس نے اس گھوڑے پر بیٹھنا ترک کر دیا۔ اس کے آٹھ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ اس کا شہزادہ بہادر ۱۵۲۵ء میں گجرات سے دہلی ابراہیم لودھی کے دربار میں چلا گیا تھا۔ وہ پانی پت کی پہلی جنگ میں بھی شریک ہوا تھا۔

مظفر حلیم کے بعد اس کے شہزادوں میں سے سکندر تخت پر بٹھایا گیا۔ سکندر میں اپنے اجداد کے جوہر نہیں تھے۔ یہ بڑا کھولٹ تھا۔ اور امرا کو جا و بیجا نواز تا رہتا تھا۔ اس کا وزیر اور مشیر کار عماد الملک خوش قدم تھا۔ بعض شریر امرا نے خوش قدم کو یہ اطلاع دی کہ سلطان اس سے اپنا دامن چھڑانا چاہتا ہے اس بنا پر خوش قدم نے چاپانیر میں ایک دن سکندر کو قتل کرا دیا۔ اور اس کے ایک دوسرے بھائی ناصر خاں کو جو صرف چھ سال کا تھا تخت پر بٹھا کر اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس اثنا میں بعض امرا نے خوش قدم کے خلاف سازش شروع کی اور بہادر خاں کو طلب کیا۔ بہادر منزلیں طے کرتا ہوا احمد آباد پہنچا۔ اس اثنا میں خوش قدم نے ریاستوں کو نیز بابر کو مدد کے لئے خطوط بھیجے لیکن کامیاب نہ ہوا۔ بہادر شاہ نے احمد آباد اور بعد میں چاپانیر میں شاہی دربار منعقد کیا اور خطابات عنایت کیے۔ سکندر اور محمد شاہ کا دور صرف چھ ماہ رہا۔

بہادر شاہ کا دور حکومت ۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۷ء تھا۔ اس وقت اس کی عمر بیس سال تھی۔ اس نے بھی راجپوتوں سے زور آزمائی کی مالوہ کی ریاست کو گجرات میں شامل کر لیا۔ سلاطین دکن سے خراج طلب کیا۔ پرتگالیوں سے نبرد آزما ہوا۔ اور انہیں شکستیں دی۔ غرض اس سے قبل گجرات کی سلطنت پر ادبار کی گھٹائیں منڈلا رہی تھیں۔ لیکن چھٹ گئیں اور بہادر دہلی کے بادشاہ سے مقابلہ کے قابل ہو گیا۔ اس کے عہد میں بعض ترکی افسر گجرات پہنچے۔ ان میں رومی خان خواجہ سفر سلمانی وغیرہ نے اپنے کارنامے دکھلا کر اعلیٰ عہدے اور سلطان کا اعتماد حاصل کیا تھا۔ ۱۵۳۵ء میں ہمایوں نے گجرات پر حملہ کر دیا۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ مرزا محمد زماں آگرہ سے بھاگ کر گجرات میں پناہ گزیں

ہوا تھا۔ دوسرے بہادر نے افغان افسروں کو گجرات میں پناہ دی تھی۔ اور انہیں اعلیٰ عہدے بھی دئے گئے تھے۔ تیسرے رومی خاں کو چتوڑ قلعہ کی قلعہ داری حسب وعدہ نہیں دی گئی۔ رومی خاں نے ہمایوں سے سازباز کی اور ہمایوں کو گجرات پر حملہ آور ہونے پر آمادہ کر لیا۔ ہمایوں نے ۱۵۳۵ء میں گجرات پر حملہ کیا۔ سب سے پہلے اس نے مالوہ پر قبضہ کیا۔ اور گجرات کی طرف چانپانیر کھمبایت تک فتح و نصرت کے ساتھ بڑھ گیا۔ چانپانیر میں اس نے اپنے نام کا سکہ بھی ضرب کرایا۔ ہمایوں نے گجرات میں دربار منعقد کیا۔ اس وقت اس کے سامنے بہادر کا ایک طوطا بھی لایا گیا۔ دربار میں جب رومی خاں کی آمد کا اعلان کیا گیا تو طوطا بول اٹھا: "پھٹ رومی خاں نمک حرام" یہ سن کر رومی خاں بہت خائف ہوا۔ اگرچہ ہمایوں گجرات پر قابض ہو چکا تھا لیکن عوام بہادر کو چاہتے تھے۔ بہادر پھر ایک بار اپنا ملک حاصل کر لیتا ہے۔ ادھر ہمایوں کو شمال سے شیر خاں کی شورش کی اطلاع ملتی ہے۔ ہمایوں کھمبایت سورت راندیر ہوتا ہوا مالوہ کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ بہادر دیو بندر پہلی بار پہنچتا ہے۔ جہاں پرتگالیوں نے دغا سے اس کو مار ڈالا۔ اس کی تاریخ وفات ہے: "سلطان البر شہید البحر" (۹۴۳ھ)

۱۵۳۷ء میں بہادر شاہ کی شہادت کے بعد اس کے بھتیجے محمود خاں بن لطیف خاں کو گیارہ سال کی عمر میں تخت پر بٹھلا دیا گیا۔ اس وقت حکومت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ امرا کی ریشہ دوانیاں حد سے سوا تھیں۔ خود غرضیوں کی وجہ سے خانہ جنگیوں کا بازار گرم تھا۔ ۱۵۵۴ء میں اس کے ملازم خاص برہان نے اس کو قتل کر دیا۔ محمود شاہ سوم نے ۱۵۳۸ء تا ۱۵۵۴ء حکومت کی۔ محمود شاہ لاولد تھا۔ اس لئے امرا نے اس خاندان کے احمد نامی ایک بچہ کو تلاش کر کے بلوایا اور تخت پر بٹھلایا۔ کہتے ہیں جب سرکاری سپاہی اور افسر احمد کو زبردستی اٹھا لائے تو اس کی دایہ چیخ رہی تھی کہ "بچہ کو کہاں لے جا رہے ہو" اس پر ایک افسر نے کہا کہ "میں اس کو وہاں لے جا رہا ہوں جہاں کل اس کے ارد گرد بہت لوگ جمع ہوں گے۔ لیکن ان میں سے ایک بھی اس کا دوست نہ ہو گا" احمد کو سلطان احمد شاہ سوم کا لقب دیا گیا تھا۔ اس کے دور میں امرا کی خانہ جنگیاں حد سے تجاوز کر چکی تھیں۔ ہر علاقہ میں منصبدار یا صوبیدار خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کرتا تھا۔ نظم و نسق درہم برہم ہو چکا تھا۔ اس کے دور میں سوری کے زوال پر افغانوں نے گجرات میں پناہ لی۔ ایک روز وزیر اعتبار خاں نے احمد شاہ کو قتل کرا دیا: "مقتول شہ بیگناہ" سے سنہ وفات نکلتی ہے۔

احمد شاہ سوم کے بعد پھر تخت و تاج کے وارث کی تلاش ہوئی۔ اعتماد خاں نے جو اس وقت سلطان گر کی حیثیت رکھتا تھا۔ نتھو نامی بارہ سالہ بچہ کو یہ کہہ کر پیش کیا کہ سلطان محمود سوم نے اس

کی ماں کا حمل ساقط کرادینے کے لیے حکم دیا تھا۔ لیکن اس کو بچالیا گیا تھا۔ امرا نے اعتماد خان کے اس بیان پر اعتماد تو نہیں کیا لیکن حالات کے پیش نظر منظور کر لیا۔ اس طرح ناتھو کو مظفر شاہ سوم کے لقب سے ۱۵۶۱ء میں تخت پر بٹھلایا گیا۔ یہ سلطان بھی اعتماد خاں کے رحم و کرم پر قائم رہا۔ اعتماد خاں پچھلے بیس سال سے سفید و سیاہ کا مالک تھا۔ وہ نہ فن جنگ میں مہارت رکھتا تھا۔ نہ ہی میدان میں مقابلہ کی تاب لاسکتا تھا۔ وہ سیاسی بازی گری اور فریب سے بادشاہ گر بنا رہا۔ امرا نے پوری سلطنت کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ احمد آباد، کھمبایت، پٹن وغیرہ اعتماد خان کا علاقہ تھا۔ سورت، بھروچ، بڑودہ فولادی خان کی ملکیت تھی۔ چاپانیر چنگیز خاں کے پاس تھا۔ کاٹھیاواڑ پر تاتار خاں غوری قابض تھا۔ اور دھندوکا و دھولکا سید مبارک بخاری کے بیٹے پوتوں کے پاس تھے۔ چنگیز خاں اپنے حصے سے مطمئن نہیں تھا اور زیادہ کا طلب گار ہوا تو اعتماد خان نے اس کو خاندیس کے شہر نندربار پر دھاوا بولنے کا مشورہ دیا۔ چنگیز خاں وہاں ناکام ہوا لیکن اتفاق سے دہلی سے تیموری شہزاد مرزا برادران اس کے دربار میں باریاب ہو گئے۔ چنگیز خان نے ان کی مدد سے احمد آباد کی طرف کوچ کیا۔ اعتماد نے دوبارہ اکبر کو گجرات فتح کرنے کی دعوت بھیجی۔ چنگیز خان احمد آباد پر قابض ہو گیا۔ لیکن حبشی سرداروں نے چنگیز خان کو ایک موقع پاکر قتل کر دیا۔ اس طرح چنگیز خاں کی حکمرانی کا ۱۵۶۷ء میں خاتمہ ہو گیا۔

دوبارہ اعتماد خان وزیر بن گیا۔ اس کی دعوت پر اکبر نے ۱۵۷۲ء کے وسط میں آگرہ سے گجرات کی طرف کوچ شروع کیا۔ اس وقت شیر خاں فولادی نے احمد آباد پر دھاوا بول دیا تھا۔ مظفر شاہ سوم فولادی کا طرفدار بن گیا لیکن فولادی نے جیسے ہی احمد آباد کا محاصرہ اٹھالیا مظفر شاہ احمد آباد سے بھاگ نکلا۔ آخر کار کاٹھیاواڑ سے اس کو قید کرکے لایا گیا اور اکبر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اکبر نے شمالی گجرات مرزا عزیز کوکا کے سپرد کیا۔ اور جنوبی گجرات اعتماد خان کو دیا۔

غرض ۱۵۷۲ء میں گجرات میں اکبری فتح کا ڈنکا بج چکا تھا۔ لیکن ۱۵۸۳ء تک جنگ و جدال کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔ مظفر شاہ دوبارہ احمد آباد پر چھ ماہ قابض رہا۔ ادھر مرزا بھائیوں نے شورشیں برپا کر رکھی تھیں۔ لیکن آخر کار مظفر شاہ نے قید میں اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ لیا۔ اور اس طرح سلاطین گجرات کا چراغ گل ہو گیا۔

مرآت سکندری:

"مدارس بہشت آئین و مساجد چوں خلد بریں ساختہ ایں شہر را چنیں قبول روئی داد و رونق او بر جمیع بلاد ہفت اقلیم فائق افتاد و مسافران بر و بحر متفق علیہ اند

کہ بدایں طرح دلکشا وزیبا شہرے بروئے زمین بنا نیافتہ ۔ (احمد آباد)

مرآتِ احمدی :

" ودرگجرات کہ زیب وزینت ہندوستان است اہلِ کسب وارباب ہند ہمہ جہت می باشند ۔"

یادِ ایام :

" اس مبارک خاندان نے ایک سو چوراسی برس تک گجرات میں فرماں روائی کی اپنی حکمرانی کا ایسا بہتر نمونہ پیش کیا ہے جس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں مشکل مل سکتی ہے ۔"

۱۵۷۳ء میں اکبر کی فتح گجرات کے بعد گجرات میں نئے صبح وشام کا آغاز ہوا۔ اکبری دور میں نو صوبیدار گجرات آئے ۔ ان میں پہلا صوبیدار مرزا عزیز کوکا اور تیسرا خان خاناں تھا۔ اس دور میں تقریباً دس بارہ سال مظفر شاہ اور مرزاؤں کی شورشیں برپا ہوتی رہیں ۔ لیکن اس کے بعد مستحکم حکومت قائم ہوگئی ۔ جہانگیر ۱۰۱۴ھ تا ۱۰۳۷ھ اور شاہجہاں ۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۸ھ کے دور میں بالترتیب آٹھ اور بارہ صوبیدار گجرات بھیجے گئے ۔ ان میں شاہجہاں اور اورنگ زیب بھی ۱۰۳۶ھ اور ۱۰۵۴ھ میں صوبیدار کی حیثیت سے گجرات آئے تھے اس پورے دور میں کوئی اہم جنگ یا شورش برپا نہیں ہوئی ۔ ایک ڈھرے پر حکومت کا نظم ونسق قائم رہا ۔

آخری سلاطین کے دور میں مصر سے ترکی اور حبشی سردار گجرات آئے جنھوں نے اپنی لیاقت وشجاعت کی بنا پر سیاست میں اہم حصہ لیا ۔ اسی دور میں شمال سے افغان سردار گجرات میں قسمت آزمائی کے لئے آگئے اور بیرونی ملکوں سے پرتگالی آئے جنھوں نے قلیل عرصہ میں بندرگاہوں پر اپنا اقتدار قائم کرلیا ۔ یہی سلطان بہادر شاہ کے قاتل ہیں ۔ پرتگالی اکثر سورت کی بندرگاہ مگدلا پر حملہ کرتے تھے مگر انہیں مگدلا کے حبشی ناکام بناتے رہتے تھے ۔ مگدلا اور سورت میں حبشیوں کی بڑی آبادیاں آباد تھیں ۔ معلوم ہوتا ہے لفظ مگدلا بھی انہیں کی زبان کا لفظ ہے ۔ سترہویں صدی کے آغاز سے انگریزوں کی آمد شروع ہوئی ۔ ۱۶۰۸ء میں کپتان ہاکنس ۱۶۱۲ء میں کپتان بسٹ ۱۶۱۵ء میں ٹامس رو بحری قافلے لے کر آئے ۔ پرتگالیوں سے ان کی جھڑپیں اور بحری جنگیں ہوئیں بازاروں اور سرکار دربار میں پرتگالی انگریزوں کے خلاف سازشیں کرتے رہے لیکن انگریزوں نے حکمت عملی سے دہلی دربار میں رسائی حاصل کرکے پروانے حاصل کرلئے ۔ اور سورت ، بھروچ ، احمد آباد ، آگرہ وغیرہ مقامات پر کوٹھیاں بھی قائم کرلیں ۔ ۱۶۱۶ میں ولندے

بھی وارد ہوگئے۔ اور سورت میں اپنی کوٹھی قائم کرلی۔

باہر کی قوموں کے ہندوستان آنے سے تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا: ۱۶۲۰ تا ۱۶۲۰ء تقریباً ستائیس سے تیس جہاز مال لے کر لندن گئے تھے۔ یہاں کا کپڑا لندن اور یورپ کے دوسرے حصوں میں بہت مقبول تھا۔ وہاں سے چائے، کافی، لوہا، مینگنیز اور اس قسم کی اشیاء آئیں اور یہاں سے تو یہ لوگ گویا سونا اور جواہرات ہی لے جاتے۔ تجارت سے گجرات اور خصوصاً سورت کے مہاجن بہت پھلے پھولے۔ جب جہاز آتے اس وقت یہ مہاجن سود پر روپیہ دیتے۔ اس طرح ان کو بہت فائدہ ہوتا۔ منڈیسلو ٹورنیر اور ایسے دوسرے سیاح جب سورت کے کسٹم کی آمدنی دیکھتے تو متحیر رہ جاتے تھے۔ گجرات میں تجارت کی فراوانی کی وجہ سے ہن برستا تھا۔ اسی وجہ سے مغلوں کے عہد میں گجرات میں بڑے بڑے اجارے شاہی خاندان کے افراد کے پاس تھے۔

مغلوں کو تعمیرات کا بڑا شوق تھا۔ جہاں جاتے باغ لگاتے اور پانی کے فوارے اڑاتے شاہجہاں تو اس کا عاشق تھا۔ اس نے احمد آباد میں شاہی باغ کے نام سے باغ اور محلات بنوائے تھے سورت جہاں آرا کی جاگیر تھی۔ ۱۶۴۴ء میں حقیقت خان قلعہ دار نے سورت میں حجاج کے لئے ایک سرائے تعمیر کرائی تھی۔ اس سرائے کی وجہ سے سرائے کے قریب کا پورا علاقہ مغلی سرائے کے نام سے آج تک یاد کیا جاتا ہے۔ سرائے میں اس وقت سورت میونسپل کارپوریشن کے دفاتر ہیں۔

اس باب کے تحت شیخ احمد کھٹو، شیخ بہاء الدین باجن، قاضی محمود دریائی، شاہ علی جیوگام دھنی، بابا شاہ حسینی، سید حسن جی اور شیخ خوب محمد چشتی کا تذکرہ اگلے صفحات میں پیش کیا جارہا ہے۔

اس پس منظر کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے:

۱۔ ہسٹری آف گجرات۔ انگریزی کامی سیریٹ
۲۔ مرأت احمدی۔ اُردو اور فارسی
۳۔ مرات سکندری۔ انگریزی ترجمہ از منشی فضل اللہ فریدی
۴۔ گرجر ویش۔ گجراتی۔ کے۔ ایم منشی
۵۔ تاریخ گجرات۔ اُردو۔ سید ابو ظفر ندوی
۶۔ گجرات نو پاٹ نگر۔ گجراتی۔ رتن منی راو بھیم راو
۷۔ یاد ایام۔ حکیم عبدالحی ندوی (۸) گزیٹیر، سورت، بھروچ، کاٹھیاواڑ۔

شیخ احمد کھٹو

شیخ احمد کے مفصل حالات ان کے ایک عقیدت مند مولانا قاسم نے شیخ کی وفات کے بارہ سال بعد لکھے ہیں جس کا نام مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول ہے۔ ان کے دوسرے عقیدت مند محمود بن سعید ایرجی نے بھی تحفۃ المجالس کے نام سے مفصل حالات لکھے ہیں۔ مذکورہ دونوں حضرات نے زیادہ تر چشم دید واقعات اور شیخ کے ارشادات قلم بند کیے ہیں۔

مرقاۃ الوصول میں مذکور ہے کہ شیخ دہلی کے ایک رئیس کے نور نظر تھے۔ اتفاق سے دیند وانہ کے ایک جولاہے کے گھر میں آگئے اور وہاں کچھ عرصہ گذرا تھا کہ کھٹو کے ایک مشہور و معروف بزرگ بابو اسحاق نے انہیں اس جولاہے سے لے کر پرورش کیا۔

شیخ خود فرماتے تھے کہ بابو اسحاق نے انہیں بڑے چاؤ سے پرورش کیا۔ جب لڑکپن میں شیخ کھیل کود کر گھر آتے تو بابو دونوں ہاتھ پھیلا کر اپنے آغوش میں لے لیتے اور فرماتے "آؤ میرے بابا آؤ میرے محمود" لفظ محمود میں پہلو یہ تھا کہ بابو اسحاق کے والد کا نام محمود تھا۔ شیخ کے لئے بابو بہترین اور نفیس کپڑا اور کھانا مہیا کرنے اور اچھے سے اچھا جوتا دور دور سے منگواتے تھے۔ ایک روز شیخ نے پھٹا پرانا جوتا پہنا تھا۔ اس سے بابو کو بہت افسوس ہوا۔ اور فرمایا کہ اپنی زندگی میں ایسا جوتا نہیں پہننے دوں گا۔ جب کبھی شیخ سفر سے واپس آتے تو بابو اپنے ہاتھ سے شیخ کی پیشانی سے پسینہ پونچھتے اور سر پر پانی ڈالتے۔ جب تک شیخ کھانا نہ کھاتے بابو بھی نہ کھاتے تھے غرضیکہ بابو شیخ کو بہت چاہتے تھے اور انھیں بڑے ناز و نعم میں پرورش کیا۔

شیخ کی تعلیم اور اساتذہ کا حال کسی کتاب میں نہیں پایا جاتا۔ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ بابو شیخ کی تعلیم و تربیت میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔ علوم کے ساتھ شیخ فنون میں بھی بچپن سے مہارت رکھتے تھے۔ شیخ خاص طور پر تیر اندازی شہسواری اور پہلوانی میں ماہر فن تھے۔

شیخ نے چلہ کشی، اوراد و وظائف اور دائمی روزہ جوانی ہی سے شروع کر دیا تھا۔ خراسان، حجاز، دہلی وغیرہ مقامات کے دوران سفر میں بھی روزہ کبھی قضا نہ ہوا۔ شیخ رات کو سوتے بہت کم تھے۔ اور ہر وقت مسجد میں نماز پڑھتے یا مراقبہ میں بیٹھے ہوئے پائے جاتے تھے۔ شیخ نے خود اپنی چلہ کشی کا ایک واقعہ سنایا تھا کہ کھٹو میں ایک دفعہ صرف بارہ خرما پر چالیس روز کا چلہ کیا تھا۔ چلہ کشی و ریاضت کی وجہ سے بہت نحیف و نزار ہو جاتے تھے۔ شیخ کی قطبیت کے متعلق مولانا قاسم لکھتے ہیں کہ سید

احمد عرب نے مولانا قاسم سے بیان کیا تھا کہ شیخ یحییٰ خلیفہ شیخ عمر جبلی ، ۸۴۰ھ میں جہاں آ رہے تھے اس وقت شیخ عمر نے شیخ یحییٰ سے فرمایا تھا کہ گجرات میں بمقام سرکھیج ایک شیخ احمد رہتے ہیں۔ ان کو میرا سلام پہنچا کر کہنا کہ تم کو اللہ کی طرف سے قطب کا درجہ عطا ہوا ہے۔

شیخ ۸۰۳ھ میں کھٹو سے گجرات بمقام پٹن آئے۔ یہاں مظفر شاہ اوّل نے گجرات میں سکونت اختیار کرنے کی درخواست کی تو آپ نے احمد آباد سے سات میل دور مقام سرکھیج پسند کیا۔ شیخ کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ شیخ کے عقیدت مندوں میں قابل ذکر آٹھ فرمانروا تھے۔ فیروز شاہ تغلق۔ حاکم مالوہ۔ حاکم ٹھٹھہ گجرات کے مظفر شاہ۔ محمد شاہ۔ احمد شاہ۔ محمد شاہ ثانی سلاطین شیخ کے بہت معتقد تھے۔ فیروز شاہ کے دربار میں تو شیخ کی باریابی عمر پندرہ سال ہی ہو چکی تھی۔ سلاطین گجرات میں احمد شاہ بانی احمد آباد شیخ کا بہت معتقد تھا۔ شیخ کی علالت کے وقت اکثر احمد شاہ شیخ کی خدمت میں حاضر رہتا۔ مرأتِ احمدی میں لکھا ہے کہ شہر احمد آباد کا سنگ بنیاد رکھنے کا اعزاز شیخ کو بھی حاصل ہے۔ شیخ کی داد و دہش اتنی تھی کہ عوام میں آپ گنج بخش کے لقب سے مشہور تھے۔ جب دولت کدہ بہت اشیاء جمع ہو جاتیں تو شیخ فقراء کو تقسیم کر دیتے تھے۔ کوئی امیر کوئی چیز تحفۃً پیش کرتا تو شیخ اس کی دل شکنی نہ ہو اس خیال سے قبول تو کر لیتے لیکن فوراً ہی اتنی ہی قیمت کی کوئی اور شئے تحفہ لانے والے کو دیدیتے۔ اکثر شیخ فرماتے کہ میں کسی کے زیر احسان نہیں رہنا چاہتا۔

۸۴۹ھ میں شیخ عید الفطر سے واپس آئے ویسے ہی ایک قے ہوئی اس کے بعد سے طبیعت ناساز ہی رہی۔ اور ۱۴ شوال کو بے ہوشی طاری ہوگئی۔ ۱۵۔ شوال کو صبح ملک جی الملک آیا تو شیخ اٹھ کر بیٹھے اور مولانا قاسم کے بھائی شیخ صلاح الدین کے سر پر دستار رکھی اس کے بعد شیخ بستر پر لیٹ گئے اور چند سانسیں لینے کے بعد ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ مولانا قاسم نے شیخ کو غسل دیا۔ نماز جنازہ کے وقت سلطان محمد شاہ موجود تھا۔ اس نے مولانا قاسم کو نماز جنازہ پڑھانے کی اجازت دی۔ شیخ کو سرکھیج ہی میں سپرد خاک کیا گیا ہے۔ اسی جگہ محمود بیگڑا کا بھی مزار ہے روضہ کا احاطہ بہت وسیع ہے۔ اس کی ایک جانب بڑا تالاب ہے۔ اور تالاب کے اردگرد شاہی محلات کے آثار ہیں۔ آج تک شیخ کا روضہ مبارک مرجع خلائق ہے۔

شیخ کو شعر و سخن سے بھی کافی شغف تھا۔ احمد تخلص کرتے تھے۔ فارسی میں چند اشعار دستیاب ہوئے ہیں۔ ہندی میں بھی چند اشعار پائے جاتے ہیں۔ لیکن تخلص کا شعر ہندی میں ایک بھی نہ

نہ ملا۔ تاہم قرین قیاس یہ ہے کہ مرقاۃ الوصول میں ہندی کے جو اشعار پائے جاتے ہیں وہ شیخ کے ہی ہیں ہم یہاں پہلے فارسی کلام پیش کرتے۔ اور اس کے بعد ہندی اشعار درج کرتے ہیں۔

ایک دن آپ مکان میں گریہ وزاری کر رہے تھے اس موقع پر شیخ نے خادم کو بھیجا کہ محمود (امیر جی) کو بلا لاؤ۔ محمود جب در دولت پر پہنچے تو دیکھا کہ شیخ یہ دو شعر پڑھ رہے تھے۔

نے در شمار مرد نہ اندر شمار زن　　　معلوم نیست در چہ شماریم آہ آہ

خواند اگر بلطف بیایم شتاو شتاو　　　راند اگر بقہر برار ... یم آہ آہ

کچھ دیر کے بعد شیخ نے محمود امیر جی کو دیکھا تو فرمایا: "بابا این دو بیت از غزل خاصہ ماست"۔ اس کے بعد محمود نے پوری غزل پڑھنے کے لئے درخواست کی۔ شیخ نے تب پوری غزل سنائی۔

شوریدگان خستہ وزاریم آہ آہ　　　وا ماندگان صحبت یاریم آہ آہ

سرگشتہ گان سوختہ با پختگان خام　　　دل دادگان سینہ فگاریم آہ آہ

مستان ز شب جوی لوندان کو بکو　　　کہ در شراب وگہ خماریم آہ آہ

زندان غلیم حریفان نافہیم　　　جز نیستی و جرم نہ داریم آہ آہ

جب محمود نے مقطع کے لئے عرض کی تو شیخ نے فرمایا: "بابا می خواہی کہ خلق مارا شاعر گویند چیزے از سر ذوق و حال خود نبشتہ ایم"۔

ایک دفعہ ایک شاعر شیخ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اور شیخ اس وقت فقرا کو مال تقسیم کر رہے تھے یہ دیکھ کر شاعر نے کہا: "زہے ایثار کہ حق سبحان تعالی مخدوم را روزی کردہ است"، اس وقت شیخ نے جواب میں فرمایا:

می برد ہر کس نصیبے خویشتن　　　درمیاں احمد بہانہ بیش نیست

شاعر نے اس بیت پر پوری غزل کہی اور شیخ کے حضور میں پیش کی۔ شیخ نے شاعر کو انعام دیا اور اپنا ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ سلطان فیروز نے ایک شعر کہہ کر شعرا سے تضمین کرنے کو کہا۔ اس بیت پر شیخ نے بھی غزل کہی اور فیروز نے جب شیخ کی غزل دیکھی تو دریافت کیا کہ یہ کس کی غزل ہے۔ حاضرین سے جب معلوم ہوا کہ شیخ احمد کی غزل ہے تو کہا:

"بغایت ظریف است کلام الملوک ملوک الکلام"

ہندی کلام: ایک دفعہ ایک شخص نے ایک دوہا پڑھا۔

توں جانتہ کرتار جی منجہ ساجن پھیرہ ــــــ سایب مریسی سار کروں تمہاری بالہا

بندگی مخدوم درحال بریں نسق فرمودند۔

توں جانتہ کرتا رچی منجہ سائیں بیہرہ   سائیں کی ہی سار پانچہ سیانہ جوں لبنہ

ایک دفعہ ایک کنیز آنکھوں میں سرمہ (بجوہ) ڈال کر شیخ کے سامنے آئی۔ شیخ نے اس وقت غضب میں آکر یہ دوہرہ کہا۔

دو کہا کا جل جی کروں تو سوکن دکہہ دینہ   نہ پیسو ڈکھین دینہ مجہ نہ آپ دیکھ سکینہ

ایک شخص نے یہ مصرعہ کہا۔

بہولی بوجہوں بندتا دورن کسی ماس

اور عرض کیا کہ اس کی مناسبت میں کچھ فرمایئے۔ شیخ نے فوراً دوہرہ کہا۔

دیئی بجہتیں ایک پل جاتوں برس پچاس   جی کن دیکھ دلیس کی برسنہ انت نہ ماس

قاضی عالم کے والد قاضی حاکم نے اپنے مکان میں ایک جگہ پردہ باندھا تھا۔ شیخ نے جب یہ دیکھا تو دوہرا فرمایا۔

تتی بدھی کنزی جیوں دہن اوجہل ہوئے   مور کہہ رکھی نیں دو منہ کر رکھی کوئے

یہ کہنا مشکل ہے کہ مذکورہ بالا دوہے کسی اور شاعر کے ہیں یا خود شیخ کے کہے ہوئے ہیں۔

باجن

شاہ باجن کا نام بہار الدین تھا۔ وہ ایک صوفی اور علم دوست خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے بزرگوں میں سے ایک شخص مولانا احمد مدنی حجاز سے دہلی آئے تھے۔ دہلی میں بادشاہ وقت ان سے بے حد اعتقاد رکھتا تھا۔ بادشاہ نے اپنی بیٹی مولانا موصوف کے فرزند عبدالملک سے بیاہ دی تھی۔ مولانا احمد کچھ مدت کے بعد حجاز لوٹ گئے لیکن عبدالملک نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ عبدالملک کی تیسری پشت میں ایک فرد حاجی معزالدین گذرے تھے معزالدین نے حجاز کے سفر کا ارادہ کیا اور دہلی سے احمد آباد گجرات آئے۔ احمد آباد میں قیام کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ پھر وہ یہیں کے ہو رہے اور ۷۹۰ھ میں اسی شہر احمد آباد خجستہ بنیاد میں معزالدین کے گھر بہار الدین (باجن) تولد ہوئے۔ ابھی باجن کی عمر چار سال کی تھی کہ ان کے والد معزالدین کا ایک سو پچاس[150] سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔[1]

باجن شیخ رحمت اللہ بن شیخ عزیز اللہ متوکل کے مرید تھے۔ باجن نے مدت دراز تک اپنے مرشد

کی خدمت میں رہ کر کسب فیوض کیا۔ باجن حج بیت اللہ کی غرض سے حجاز گئے تھے کہ ان کے مرشد کا انتقال ہوگیا۔ حضرت رحمت اللہ کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ لہٰذا انھوں نے وفات سے قبل خرقۂ خلافت اور فرمان اپنے بھتیجے شیخ عطاء اللہ دین شیخ شہر اللہ کے سپرد کر کے ہدایت کی تھی کہ شاہ بہاء الدین کے حج سے لوٹنے پر انہیں تبرکات دیدیئے جائیں۔ جب باجن احمد آباد پہنچے تو شیخ عطاء اللہ نے تبرکات باجن کے حوالہ کر دئے۔ باجن نے خرقہ اور فرمان کو مرشد کے مزار پر رکھ دیا۔ ادھر قوالوں نے باجن کا کلام گانا شروع کیا اور جب قوال اس سخن پر پہنچے۔

شاہ رحمت اللہ رے منجہ پیہ ملاؤ   تم باج لاگوں کیسے پاؤ (پاؤں)

اس وقت قبر سے ندا آئی "باجن لاگے تیرے پاؤ" (پاؤں)۔ اس وقت باجن پر وجد حال کی کیفیت طاری ہوگئی۔ پھر ندا آئی "بہوش کہ حق تست" جیسے ہی باجن نے دونوں ہاتھ اوپر کئے خرقہ خود بخود جسم پر زیب تن ہوگیا۔ لقب باجن بھی اسی وقت سے مشہور ہوا۔ چند سال باجن نے شیخ عطاء اللہ کی خدمت میں بھی گذارے۔

باجن کو سیر و سیاحت سے بہت شغف تھا۔ خود فرماتے ہیں کہ

"ایں فقیر از طرف سندھ تا خراسان و از طرف دکن تا سیلان مسافرت نمود"[1]

ایک دن احمد آباد سے رخت سفر باندھا اور بیدر پہنچ کر چلہ کشی کی اس کے بعد گجرات لوٹ آئے اور یہاں آٹھ سال ریاضت میں گذارنے کے بعد برہانپور کا قصد کیا کیونکہ انہیں ایک دفعہ حضرت رحمت اللہ نے بشارت دی تھی کہ

"مقام شما در برہانپور است، وصال شما ہمانجا خواہد شد"

اور جب برہانپور کے سفر کا ارادہ کیا تو خواب میں حضرت برہان الدین نے بشارت دی کہ

"برہانپور حوالۂ شما کردیم و اجازت نامہ نوشتہ دادند"[2]

باجن برہانپور سے چند میل دور خانہ پور میں قیام پذیر ہوئے لیکن حکام اور مشائخ انہیں شہر برہانپور میں لے آئے۔ برہانپور میں ان کی عمر عزیز کے چالیس سال گذرے اور ۹۱۲ھ میں یہیں پیوند خاک ہوئے۔ مزار بمقام شاہ بازار (ساہوکار بازار) واقع ہے۔ اس کے متصل اعظم

---

[1] خزانۂ رحمت ملوکہ احکام اللہ حضرت

[2] " " " " " " "

ہمایوں سلطان فاروقی (سلطان محمود بیگڑے کا حقیقی بھانجہ) نے ایک عالی شان مسجد تعمیر کرادی تعمیر سے متعلق مسجد کے کتبہ پر سنہ ۹۰۸ھ درج ہے مزار کے دروازہ کی پیشانی پر ایک قطعہ کندہ ہے:

اے پسر روئے متاب از نظر درویشاں — کہ نظرہائے بیابی ز در درویشاں
ظلم اعدا چو رود در در درویش در آ — کہ مرادات بیابی ز در درویشاں

قطعہ ایک بڑی اینٹ پر مینا کے نیلگوں حروف میں منقوش ہے۔

باجن نے اپنی ایک تصنیف خزانۂ رحمت کے نام سے یادگار چھوڑی ہے۔ اس کا ایک نسخہ لاہور کے اورینٹل کالج میں محفوظ ہے۔ اس نسخہ کے معنی و مطالب پر مرحوم حافظ محمود شیرانی نے اورینٹل کالج میگزین کے نومبر ۱۹۳۰ء کے شمارہ میں مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ سید مطیع اللہ راشد برہانپوری مرحوم سے ۱۹۴۴ء میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ مذکورہ تصنیف کا ایک نسخہ برہانپور میں مشائخ خاندان کے ایک شخص مولوی رفیع الدین کے کتب خانہ میں ہے۔ میں نے راشد صاحب کے توسط سے حاصل کرنے کی ہر چند کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ جب راشد صاحب کو نسخہ دستیاب ہوا تو انھوں نے اس میں سے باجن کا ہندی کلام نقل کر کے پروفیسر ندوی صاحب کے پتہ سے میرے نام بھیجا جس کا مجھے علم نہ ہو سکا۔ ۱۹۷۱ء میں ندوی صاحب کے قلمی ذخیرے میں یہ پایا گیا۔ مولوی رفیع الدین کا نسخہ ان کی وفات کے بعد برہانپور کی جامع مسجد کے خطیب مرحوم حضرت احکام اللہ صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ کر دیا گیا تھا جو اب احکام اللہ حضرت کے بھتیجے اور خطیب جامع مسجد حضرت حکیم توحید میاں صاحب کی کشادہ دلی اور علم دوستی کی وجہ سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اسی نسخہ کے پیش نظر ڈاکٹر فرید شیخ نے ایک مضمون قلم بند کیا جو نوائے ادب کے شمارہ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں شائع کیا گیا ہے۔

خزانۂ رحمت[1] زبان اور موضوع دونوں حیثیتوں سے اہمیت کا مالک ہے۔ تالیف کے متعلق باجن فرماتے ہیں:

"و ایں فقیر بہار الدین الملقب بہ باجن کہ غلام سلطان المشائخ المفتقر الی اللہ مخدوم شیخ رحمت اللہ قدس اللہ سرہ العزیز است بعضے کلمات از زبان حضرت ایشان کہ...

[1] خزانۂ رحمت کا ایک نسخہ لاہور میں ہے۔ اس پر حافظ محمود شیرانی نے مضمون سپرد قلم کیا ہے دوسرا نسخہ برہانپور میں جامع مسجد کے خطیب حضرت احکام اللہ صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

"منقول از کتب معتبر جمع کردہ بود وانچہ در طبع ایں فقیر گنجید و سنجید تحریر یافت وایں رسالہ را خزانۂ رحمت اللہ نام نہادہ"

خزانۂ رحمت سات خزانوں (ابواب) پر مشتمل ہے اور ہر خزانہ ذیلی حصوں میں منقسم ہے۔ کتاب کے موضوع مختلف النوع ہیں۔ اس میں مرشد کے اقوال کے علاوہ عبادت، ریاضت، ذکر مشائخ، قصص انبیاء، تعویزات و اوراد، فقر و غنا وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔ اس میں باجن نے خود اپنے متعلق بعض اہم اطلاعات بہم پہنچائی ہیں اور سب سے زیادہ اہم ان کے ہندی و گوجری میں اشعار ہیں۔ باجن فرماتے ہیں:

"خزینہ ہفتم در ذکر اشعار کہ مقولۂ ایں فقیر است بزبان ہندی جگری خوانند و قوالان ہند آنرا در پردہا و سرودہا می نوازند بعضے در مدح پیر دستگیر و وصف روضۂ ایشاں و وصف وطن خود کہ مقام گجرات است و بعضے در ذکر مقصد مقصودات مریداں و طالبان و بعضے در عشق و محبت دریں خزانہ بالتفصیل جمع کردہ شد بنام پردہا و سرودہ"

مذکورہ بالا اقتباس میں لفظ جگری غور طلب ہے۔ اگر جگری کے درمیانی حرف کو "گ" پڑھا جائے تو جگری کے معنی جگر یا دل سے نکلی ہوئی بات ہوں گے جیسے موسیقی میں جگری نے اس لے کو کہتے ہیں جو از خود دل سے نکلی ہو یعنی اکتسابی نہ ہو اسی طرح جگری اشعار کے معنی جو دل سے آمد کی وجہ سے نکلے ہوں ہو سکتے ہیں اگر اس کو "ک" سے پڑھا جائے تو یہ لفظ جکری ہوگا۔ جکر ذکر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جکریاں عموماً قوال صوفیا کی مجالس میں گاتے تھے۔

خزانۂ رحمت میں جگہ جگہ باجن کے ہندی اشعار پائے جاتے ہیں بعض نظموں اور دوہروں پر "بزبان ہندی" درج ہے اور دو تین نظموں پر لفظ گوجری ملتا ہے[1] شیرانی صاحب نے باجن کی ایک نظم نقل کی ہے اور اس پر یہ الفاظ دیے ہیں "صفت دنیا بزبان دہلوی نیشتہ" لیکن برہانپوری نسخہ میں یہ الفاظ ہیں "صفت دنیا ایں درویش بزبان ہندی گفتہ است[2]"

قاضی محمود دریائی

قاضی صاحب کی جکریوں کا ایک مجموعہ احمد آباد کے مشائخ خاندان مشہدی میں محفوظ ہے[3]

---

[1] خزانۂ رحمت [2] ملاحظہ احکام اللہ حضرت [3] اس نسخہ کا مائکروفلم راقم کے کتب خانہ میں ہے۔

موصوف کے دوعقیدت مندوں نے مفتاح القلوب اور تحفۃ القاری کے ناموں سے ملفوظات مرتب کئے تھے جو ہمارے پیش نظر ہیں۔ مراۃ احمدی میں بھی قاضی صاحب کے مختصر حالات درج ہیں اسی طرح مرحوم حافظ محمود شیرانی صاحب اور مولوی عبدالحق صاحب نے بھی قاضی کے متعلق مضامین سپرد قلم کئے ہیں۔ ان کے علاوہ ملفوظات کے سلسلہ میں کنز الکرامات اور فوائد محمدی بھی ہیں جو ان کے عقیدت مندوں نے لکھی ہیں۔

تحفۃ القاری میں مرقوم ہے کہ قاضی صاحب کے خاندان کے ایک بزرگ شاہ علی سرمست شیراز سے بمقام نہروالا پٹن آئے ہیں۔ پٹن میں ہندوؤں کو شاہ صاحب کا قیام ناگوار گذرا اور انھیں شہر پٹن سے نکالنے کی کوششیں کی گئیں۔ لیکن شاہ صاحب نے پٹن کی اقامت ترک نہیں کی۔ اسی زمانے میں گجرات کے راجہ کرن کے یہاں اولاد نرینہ نہیں تھی اور راجہ سنتوں سے فقیروں سے دعائیں کراتا تھا۔ راجہ علی سرمست کی خدمت میں حاضر ہوا اور دعا کے لئے درخواست کی۔ سرمست کی دعا سے راجہ کے گھر لڑکا پیدا ہوا یہی لڑکا راجہ سدھ راج کے نام سے مشہور و معروف راجہ گزرا ہے۔ راجہ نے اسی خوشی میں علی سرمست کو تحفتاً کچھ دینا چاہا۔ تحفہ کے عوض شہر میں ایک مسجد بنوانے کی اجازت چاہی۔ راجہ نے یہ بات خوشی سے منظور کرلی شہر میں مسجد تعمیر کی گئی اور اس کے لئے ایک ترک حافظ نے مسجد کاٹ اِکات نام تجویز کیا۔

شاہ علی سرمست کے بعد ان کے خلف الصدق شاہ سلیمان، شاہ سلیمان کے بعد ان کے فرزند قطب محمود کے بعد قاضی محمد نے سجادۂ طریقت کو رونق بخشی۔ قاضی محمد ابھی پندرہ سال کے تھے کہ انھیں غیب سے ندا آئی کہ ہم نے تمہیں قاضی اسلام کا درجہ دیا ہے اور اقامت کے لئے بلدہ احمد احمد آباد میں موضع سارنگ پور تجویز کیا ہے۔ قاضی محمد نے حکم کی تعمیل کی اور احمد آباد میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ قاضی موصوف حضرت قطب عالم کے مرید و خلیفہ تھے۔ ایک روز قاضی محمد کی شریک زندگی بانو کے ہاتھ پر چار حروف ح۔ح۔ح۔ا ابھر آئے۔ قاضی محمد صاحب سے جب اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو قاضی موصوف نے فرمایا یہ چار اولادوں کی پیشن گوئی ہے۔ پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی اور چار اولادیں شاہ حمیدالدین، شاہ حماد، شاہ حامد اور ایک دختر اولادیں ہوئیں۔

شاہ حمیدالدین حضرت شاہ عالم کے مرید تھے۔ شاہ عالم نے حمیدالدین کو چاُلندہ نام دیا تھا اور وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ شاہ چاُلندہ نے چار شادیاں کی تھیں اور ہر ایک زوجہ سے اولادیں ہوئیں۔ قصبہ زین آباد میں ایک شخص سید سمیع الدین عرف قاضی سادھن رہتے تھے کتب تواریخ

میں اس واقعہ کا ذکر نہیں ملتا۔ ان کی دختر بی بی فتح ملک چاٗلندہ کی پہلی بیوی تھیں۔ فتح ملک کے بطن سے شاہ معروف حضرت قاضی محمود محبوب اللہ اور شاہ احمد پیدا ہوئے۔ فتح ملک کے انتقال کے بعد شاہ چاٗلندہ نے قاضی سادھن کی دوسری دختر امت الروف سے اور ان کی وفات کے بعد سادھن کی تیسری دختر بی بی راجی ملک سے عقد کیا۔ امت الروف سے چاند محمد اور شاہ محمد دو فرزند پیدا ہوئے اور راجی ملک کے بطن سے شیخ گوہر اور دوسری چند اولاد ہوئیں۔ شاہ چاٗلندہ نے سادھن کی چوتھی دختر بی بی ملک سے بھی عقد کیا جن سے کئی اولادیں ہوئیں لیکن سب معصوم ہی فوت ہوئیں۔

قاضی محمود دریائی سنہ ۳ء ۹ھ میں بمقام بیرپور پیدا ہوئے۔ مفتاح القلوب میں قاضی صاحب کی ولادت کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت محمود ابھی شکم مادر میں تھے کہ آپ کی والدہ نے چندوانے چنے کے کھالئے اس سے ان کے شدت کا درد شروع ہوگیا۔ شاہ چاٗلندہ نے پہلے تو حضرت محمود کی والدہ کو قے کرائی لیکن اس سے بھی افاقہ نہیں ہوا لہذا شاہ صاحب نے ایک سوئی کی نوک شکم مادر پر چبھوتے ہوئے فرمایا محمود رہا نیز اس کے بعد درد جاتا رہا۔ حضرت محمود جب پیدا ہوئے تو ان کے ہاتھ پر ایک نشان پایا گیا۔ اس نشان کے لئے کہا گیا کہ یہ اس سوئی کا نشان ہے۔ کہتے ہیں کوئی معتقد کسی کے کھیت سے بلا اجازت چنے لایا تھا۔ حضرت محمود شکم مادر میں چنوں کو حرام سمجھ کر اس کا اثر اپنے پر نہیں چاہتے تھے۔

صاحب تحفۃ القاری کا بیان ہے کہ شاہ چاٗلندہ حضرت محمود کو ایک دفعہ شاہ عالم کی خدمت میں لے گئے۔ شاہ عالم نے حضرت محمود کو گود میں لے کر اپنے دونوں ہاتھ سے اتنا اوپر اٹھا لیا کہ شاہ عالم کی دستار مبارک سے حضرت محمود کے پاؤں چھونے لگے اور شاہ عالم فرماتے جاتے۔ "قاضی کا شملہ بڑا قاضی کا شملہ بڑا، یہ دیکھ کر چاٗلندہ نے عرض کیا کہ حضرت بچہ کے پاؤں دستار مبارک کو لگتے ہیں اور یہ گستاخی ہے۔ شاہ عالم نے جواب دیا "خدا جس کو مرتبہ دیتا ہے اس میں کمی نہیں ہو سکتی"

حضرت محمود نے بارہ تیرہ سال کی عمر سے ہی سخت ریاضت شروع کردی تھی۔ اکثر اوقات بیرپور کے قریب کوہ (الت) کے غاروں میں دو دو ہفتے مجاہدہ میں گزار دیتے۔ چالیس چالیس روز کا روزہ رکھتے اور نیم کے زیرہ سے افطار کرتے اور نیم کی پتیاں چبا لیتے۔ اس طرح راتیں قیام اور دن صیام میں گذار دیتے اور یہ دوہرہ زبان پر ہوتا۔

یگہ بھوجن کیا انترا جی کھائے شد باج   بھوکا رہنا میت لک آھی پھرا راج

پہلا چلہ کیا ابھی ایک روز باقی تھا کہ مغرب کی نماز میں حضرت کو غش آگیا اور گر پڑے۔ اس وقت

ان کے والد شاہ چاٗلندہ امامت کر رہے تھے۔ چاٗلندہ نے بعد نماز پانی منگوایا اور پلایا اور چند روزہ رکھنے کے لئے منع فرمایا حضرت محمود نے حکم کی تعمیل کی۔ ایک دفعہ تمام شب سجادہ پر بیٹھ کر رسول اکرم سے توجہ کے لئے التماس کرتے رہے اور صبح کو یہ کلام آپ کی زبان پر تھا۔

لوں آدے نمن پیو پوچھیں نیمن لکھ بھیجی منجھ نہ سندیسا
تجھ کارن نئی سارن من چھوروں لیوں نا سا

بعض اوقات جاڑے میں تمام رات پانی میں کھڑے رہ کر یا کھلے میدانوں میں سربسجود یاد الٰہی میں مشغول رہتے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ غلبہ کی حالت میں گھنٹوں آسمان کی طرف دیکھا کرتے تمام نماز ادا کرتے اور عالم استغراق میں پائے جاتے۔ صاحب مفتاح القلوب کا بیان ہے کہ ایک دفعہ عالم استغراق کے بعد رسول اکرم چاروں اصحاب کے ہمراہ جلوہ افروز ہوئے حضرت محمود کے سر پر دستار رکھی اور چالیس بار نور تجلی سے مشرف کیا حضرت محمود اکثر فرماتے۔

"سری کے میاں من و حق تعالیٰ است اگر یک ذرہ از آں ظاہر کنم عالم متحیر گردد
اما ملاحظہ شرع شریف دارم۔ مرید نتواند گفت کہ پیر ماست فرزند نتواند گفت کہ
پدر ماست و خویش نتواند گفت کہ اقارب ماست آں زماں محمود چیزی دیگر شود"

حضرت پیر محمود کو سرود سے بہت شغف تھا۔ آپ کی مجالس میں داؤد اور حسن نامی مطرب اس خدمت کو انجام دیتے تھے۔ اکثر بعد نماز عشاء مجلس سماع منعقد ہوتی اور وجد و حال میں یہ کیفیت ہوتی کہ حضرت اتنی گریہ وزاری کرتے کہ آنکھوں سے خون بہنا شروع ہو جاتا اور جب اس حالت میں آہ بھرتے تو صاعقہ ریزی ہوتی اور شعلے نکلنے لگتے۔ صاحب مفتاح القلوب کا بیان ہے کہ یہ اس کے چشم دید واقعات ہیں بعض اوقات وجد کی حالت میں کھڑے ہو جاتے اور رقص کرنے لگتے اور زبان پر یہ جاری ہوتا۔

"ہوں ڈھونڈوں میکر اللہ کوں"

کہتے ہیں کہ عہد طفولیت میں بھی حضرت کی آنکھوں سے خون کے قطرے ٹپکتے رہتے تھے۔ اس بات کی اطلاع جب سلطان مظفر کو ہوئی تو سلطان نے امر واقعہ معلوم کرنے کے لئے صدر جہاں کو فیروز پور بھیجا تو حضرت محمود ہمعصر بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے پائے گئے۔ صدر جہاں نے سواری پر سے ہی دریافت کیا قاضی محمود کہاں ہیں۔ حضرت محمود نے جواب دیا "محمود غریب خدا مجھ کو کہتے ہیں" صدر جہاں نے سوال کیا "ہم نے سنا ہے آپ شعر کہتے ہیں؟" حضرت نے جواب دیا جو قیامت

تک قائم رہے گا۔ صدرجہاں نے پھر سوال کیا کہ آپ کی آنکھوں سے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں ؟ جواب دیا "عجب نہیں" صدرجہاں نے اس بات کا گواہ طلب کیا۔ حضرت نے جواب دیا۔ "عیاں راچہ بیاں" اور یہ دوہا پڑھنا شروع کیا۔

رت روی (؟) سن میری متیا ۔۔۔ صورت پر بھوتیاں ابھرن کیتا
ململ سبھی سمانیاں منجھ پوچھن آویں ۔۔۔ نین سوراتی کب ہوئی رت ماذنراویں
کس کس بیدن ہوں کہوں جی پوپیں کیتا ۔۔۔ ان پر پرت اپار کو دکھ ہم کو دیتا

فوراً آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا۔ صدرجہاں سواری سے اتر پڑا اور خون کے قطرے اپنے دامن پر لے لئے تو حضرت نے یہ کلام پڑھنا شروع کیا۔

محمود سنوری سائیاں یوں آئین ونا نہاں ۔۔۔ بھی ساوھ مکھ دیکھئے میرے من مانہاں
آئیہ صدرجہاں منجھ کو کیوں ملے سوسائیں ۔۔۔ تن من ہوں تو ہو رہیا تبہ کیہ دتائیں

جب سلطان نے صدرجہاں سے سارا حال سنا تو بہت متاثر ہوئے اور تحفے تحائف وغیرہ بطور نذرانہ حضرت محمود کی خدمت میں حاضر کیے۔ حضرت نے احتراماً نامۂ سلطان جس پر سلطان کی مہر تھی اٹھا کر سر پر رکھ لیا اور اس کی پشت پر ایک نظم لکھ کر واپس کر دیا جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

آج نہ چیتے کے پت کھولی پھین ہاتھ ملے کیا ہوئے
تیئں کیا پوچھا کیوں ری سہیلی ٹنڈ ہوئی

مفتاح القلوب اور تحفۃ القاری میں حضرت محمود کی بیشمار کرامات بیان کی گئی ہیں ان میں سے چند ملاحظہ کیجئے:

شیخ فضل اللہ نبیرۂ حضرت گیسو دراز دکن سے گجرات تشریف لائے اور حضرت محمود سے شرف ملاقات حاصل کیا۔ ایک روز اثنائے گفت و شنید میں شیخ فضل اللہ نے زیارت کعبۃ اللہ کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت محمود نے فرمایا۔

"پہلے کعبہ دل کو غیر از خدا درست کرو پھر جہاں چاہو گے خود کعبہ سلام کرنے آئے گا۔ اس کے بعد حضرت نے شیخ کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور اپنی روحانی قوت سے شیخ کے دل کی دنیا بدل دی۔ شیخ نے دیکھا کہ وہ کعبہ کے پاس کھڑے ہیں اور وہاں انھوں نے نفل ادا کیے اس کے بعد شیخ نے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو حضرت کی خدمت میں بیٹھا پایا۔ رات کو حضرت محمود کی خدمت میں حضرت گیسو دراز تشریف لائے اور شیخ فضل کی سفارش کی۔ صبح کو حضرت محمود نے شیخ فضل اللہ کو خرقہ

خلافت عطا کر کے رخصت کیا۔

ایک دفعہ گجرات کے سلطان کا کوئی پیغام لے کر قاصد اونٹ پر بعجلت تمام تیز تیز چلا آ رہا تھا۔ اس موقع پر حضرت محمود اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے ہوئے تھے حضرت نے قاصد سے دریافت کیا کہ کہاں جا رہا ہے۔ قاصد نے جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد اونٹ ایک قدم آگے نہیں بڑھا اور وہیں بیٹھ گیا۔ جب شتربان سے کچھ نہ بن پڑا اور لوگوں نے اسے سمجھایا کہ وہ بزرگ حضرت محمود ہیں ان سے درخواست کر۔ شتربان کو اپنے قصور کا احساس ہوا تو حضرت محمود کی خدمت میں گیا اور معافی کے لئے درخواست کی۔ حضرت محمود نے فرمایا۔ اب جلد چلا جا اونٹ کھڑا ہو گیا اور قاصد چلا گیا۔
اس موقع پر حضرت کی زبان سے یہ سنا گیا۔

اسے رائے کا سانڈھ اوتاولے ہاک　　　پیچھیں مارگے رہسے تھاگ

ایک دفعہ حضرت محمود سلطان مظفر حلیم سے باتوں میں مشغول تھے کہ دفعتاً پانی کا کوزہ منگوایا اور زمین پر الٹ دیا۔ سلطان نے وجہ پوچھی تو حضرت نے فرمایا۔ فیروز پور میں کسی کا گھر جل رہا تھا۔ اور وہ میری مدد چاہتا تھا۔ کہتے ہیں تفتیش کی گئی تو یہ واقعہ صحیح ثابت ہوا۔ اسی طرح ایک روز شاہ چاملندہ درس دے رہے تھے۔ یکایک حضرت محمود اٹھے اور آب خورے میں پانی لے کر پھینک دیا۔ فرمایا میری عمہ کا گھر جل رہا تھا۔ دریائی سفر میں جب آفت آتی تو لوگ حضرت محمود کو یاد کرتے۔ آپ کو کشف سے معلوم ہو جاتا اور آپ مدد فرماتے۔ اسی وجہ سے آپ کو دریائی بھی کہا جاتا ہے۔

سلطان مظفر نے حضرت محمود سے اپنے ملک گجرات کی خوشحالی کے لئے دعا کی درخواست کی حضرت نے فرمایا: "جب تک ہم زندہ ہیں نہ تو قحط پڑے گا اور نہ تو مغل حملہ کرے گا۔" ایسا ہی ہوا حضرت محمود کے وصال کے بعد قحط پڑا اور آپ کے وصال کے پانچ ماہ بعد مغلوں نے حملہ کر دیا۔ سلطان مظفر نے قلعہ چتوڑ کے متعلق دریافت کیا تھا۔ حضرت نے اس وقت بھی پیشگوئی کی تھی کہ "اول صلح ہو گی بعدہ فتح" سلطان بہادر کے لئے حضرت نے فرمایا تھا۔ بھاگا آوے ناٹھا جاوے۔
یعنی ہمایوں دھاوا بولے گا اور بہادر بھاگ نکلے گا۔

حضرت محمود جتنے جلالی تھے اتنے منکسر المزاج بھی تھے کسی کو سخت لفظ نہیں کہتے تھے نہ کسی سے ناراضگی کا اظہار کرتے تھے۔ اپنے لئے ہمیشہ محمود غریب ضرور استعمال کرتے۔ حضرت کو چھالیہ سے شغف تھا عقیدت مند ہمیشہ آپ کے دہن مبارک کی چھالیہ کے آرزومند رہتے تھے۔ حضرت اکثر اپنی چبائی ہوئی چھالیہ کسی نہ کسی کو دے دیتے تھے۔ حضرت کو سیر و شکار کا بھی بہت شوق تھا۔

حضرت محمود نے تقریباً ۲۸ سال مجاہدہ کرنے کے بعد اپنے والد شاہ چاُملندہ سے بیعت کیلئے درخواست کی شاہ صاحب نے فرمایا کہ شاہ عالم بخاری قدس سرہٗ کے مرید ہوجاؤ وہ میرے بھی مرشد ہیں۔ حضرت محمود شاہ عالم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شاہ عالم نے مراقبہ میں کچھ دیر گزار کر فرمایا کہ مجھے اس باب میں حکم ہوا ہے کہ تمہیں شاہ چاُملندہ کی خدمت میں بھیجوں۔ حضرت محمود نے شاہ چاُملندہ سے دوبارہ درخواست کی۔ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ تم کو مرید کرنے کے بارے میں مجھے حکم مل جائے تب تک انتظار کرو۔ کچھ مدت کے بعد سید عبدالقادر جیلانی نے حضرت محمود کو بشارت دی اور حکم کیا کہ تم اپنے والد کے مرید ہوجاؤ۔ حضرت محمود نے اپنے والد سے ذکر کیا۔ شاہ چاُملندہ نے جواب دیا کہ مجھے بھی اس باب معلوم ہوچکا ہے، وقت آنے پر موقوف ہے۔

شاہ چاُملندہ نے اپنے وصال سے ایک روز قبل پانچ صفر ۹۱۱ھ کو حضرت محمود کو خلافت عطا کی۔

حضرت محمود نے علوم عقلی و نقلی میں اپنے والد کے سامنے زانوے ادب تہ کئے تھے۔ اور بعد میں طالبان علم کو خود بھی علم و فقہ، تفسیر، احادیث، منطق و معنی، حکمت، ہیئت، ہندسہ وغیرہ میں درس دیتے تھے۔

حضرت محمود کی شہرت گجرات کے باہر دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف سے لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ دہلی کے برہان نامی حلوائی کو کسی نے سحر میں جکڑ رکھا تھا کہ اسے حضرت محمود کی خدمت میں جانے کا مشورہ دیا۔ برہان دہلی سے گجرات آرہا تھا کہ جالود مقام کے قریب ڈاکوؤں نے اسے لوٹ لیا۔ برہان جب بیر پور پہنچا تو حضرت محمود نے اس کو دیکھتے ہی نام لے کر پکارا اور فرمایا فلاں جگہ سحر سے متعلق چیزیں دفن کی گئی ہیں انھیں جاکر نکال پھینک اور تیرا مال اسباب جو ڈاکوؤں نے لوٹ لیا ہے وہ تجھے گھر پہنچنے پر مل جائے گا۔ برہان جب گھر لوٹا تو معلوم ہوا کہ کوئی قاضی محمود نامی یہ اسباب پہنچا گیا ہے۔ برہان ان باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ دوبارہ گجرات آکر حضرت کی خدمت میں اپنی عمر گزار دی۔ اسی طرح ایک جوگی بھال ناتھ اپنے چیلوں سمیت حضرت محمود کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت محمود نے اپنے دہن مبارک سے چھالیہ نکال کر عنایت کی اور سب کو مرید بنالیا۔ جوگی نے ارادت کی درخواست کرتے ہوئے کہا۔

جوگی تمو تھیں بچھڑے دکھی ہوئے من مانہ

ہم تو تم کون سمرتے تم جانتے کہ نا نہ (سمرنا۔ یاد کرنا)

حضرت نے اس کے جواب میں فرمایا۔

جو تم ہمکوں سمرتے ہم ہوتے تم پاس

ایک دفعہ ایک شخص حضرت کی خدمت میں یہ شکایت لے کر آیا کہ میگھرج قصبہ کے سپہ‌پیر

مجھے مرید نہیں کرتے کہ میں دوزخی ہوں۔ حضرت محمود نے اسے وضو کرنے کے لئے فرمایا اور اس کے بعد اس نے حضرت کے ہاتھ پر بیعت لی۔ حضرت نے فرمایا کہ سید پیر سے کہہ دو کہ میں مرید ہو گیا۔

حضرت محمود اکثر فرماتے کہ اگر مرید اپنے اعمال صالح سے مغفرت کا حقدار ہوا تو اس میں پیر کا کیا احسان ہے ایسا ہونا چاہیئے کہ مستحق عذاب کو پیر مستوجب رحمت بنائے۔ حضرت محمود کے خاص مریدوں میں شیخ موسیٰ، شیخ باجن، شیخ قاضن، سید محمود مصطفیٰ، ملک دولت، ملک الشرق، اسلام خان وغیرہ تھے۔ مفتاح القلوب، تحفۃ القاری میں حضرت کے مریدوں میں شیخ باجن کا نام ملتا ہے اگر یہ باجن بہاالدین ہیں تو وہ حضرت کے عقیدت مندوں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ شیخ بہاالدین باجن آخری عمر میں احمد آباد سے برہانپور چلے گئے تھے۔ جہاں ۹۱۲ھ میں وفات پائی اور ۹۱۱ھ میں حضرت محمود کو خلافت عطا ہوئی۔

حضرت محمود ۹۲۰ھ احمد آباد سے بیراوپ چلے گئے تھے۔ شاہ عالم کے انتقال کے بعد جب حضرت تعزیت و فاتحہ کے لئے احمد آباد تشریف لائے تو سجادہ نشین کی مجلس میں اس وقت سلطان مظفر حلیم اور دوسرے اہل دربار بھی موجود تھے۔ اثنائے گفتگو میں حضرت محمود شاہ عالم کو میاں منجھن کے نام سے یاد کیا کرتے۔ اہل مجلس میں سے کسی نے ٹوکا کہ حضرت شاہ عالم کیوں نہیں کہتے یا حضرت محمود کو کشف سے معلوم ہو گیا کہ سجادہ نشین اور دیگر حضرات کو میرا میاں منجھن کہنا ناگوار گذرتا ہے۔ حضرت محمود نے فرمایا کہ میں خود شاہ عالم کی خوشنودی و رضامندی سے میاں منجھن کہتا آیا ہوں اور مزید فرمایا کہ اگر آپ تبرک جو میرے لئے ہے نہیں دینا چاہتے نہ دیں خود میاں منجھن اپنے ہاتھ سے عنایت کریں گے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس گفتگو کے بعد سب اٹھ کر شاہ عالم کے مزار اقدس پر گئے۔ حضرت محمود نے سجادہ نشین نبیرۂ قطب عالم شیخ جیو سے کہا پہلے آپ نام سے آواز دیجئے اور بعد میں میں آواز دوں گا دیکھیں کس کو جواب ملتا ہے۔ حاضرین میں سے کسی نے آواز دی لیکن جواب نہ ملا بعدۂ حضرت محمود نے گریہ وزاری کی اور فرمایا منجھن میاں! منجھن میاں!! محمود غریب آپ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے۔ اس وقت مزار سے آواز آئی کہ محمود! ہم نے تمہارا سلام قبول کیا۔ اس پر حضرت محمود نے فرمایا کہ مجھے میرے حصے کا تبرک عنایت کیجئے مزار اقدس سے ایک ہاتھ باہر آیا اور ایک کرتا اور حلوا حضرت محمود کو عنایت کیا گیا۔

سنہ ۹۴۱ھ ۱۳ ربیع الاول (یا ربیع الثانی) میں حضرت محمود چانپانیر (محمد آباد) میں تھے اس روز دس تاریخ تھی۔ عبدالقادر جیلانی کا عرس کا دن تھا۔ رات کا کچھ حصہ گذر چکا تھا۔ ملک عماد الملک سے فرمایا کہ کھانا لاؤ۔ کھانا لایا گیا۔ سب حاضرین اس میں شریک ہوئے۔ حضرت محمود نے تھوڑا کھانا کھایا اور اٹھ کر اپنے فرزند شیخ ابو محمد کو اپنی جگہ پر بٹھلایا اور فرمایا کہ تم میری جگہ پر بیٹھ کر کھاؤ۔

میرے سینے میں درد ہوتا ہے۔ میں آرام کروں گا۔ جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے تو حضرت نے فرمایا میرے سینے میں شدت کا درد ہے۔ حاضرین نے سینے پر گرم ادویہ مالش کیں اور سینک کرتے رہے اس کے بعد پانی طلب کیا۔ وضو کر کے سورۂ یٰسین پڑھی اور چند نفل پڑھ کر قبلہ رو بیٹھ کر یہ شعر پڑھا۔

کشادہ باد بدولت ہمیشہ ایں درگاہ   بحق اشہدان لا الٰہ الا اللہ

مرآۃ احمد کا بیان ہے کہ حضرت مجلس سماع میں تھے اور وجد حال کی حالت میں وصال ہوا۔

حضرت محمود اپنی جکریوں کے لیے بہت شہرت رکھتے ہیں۔ جکری ایک طرز کی نظم ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے جکریاں مثنوی کہلانے کی مستحق ہیں اور موضوع کے اعتبار سے غزل کہا جاسکتا ہے۔ اس کا موضوع حسن و عشق ہے۔ ان میں عاشق کے اضطرار و اضطراب اور محبوب کی بے نیازی' محبوب کی منت سماجت دیدار کی خواہش، وصال کی آرزو وغیرہ کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ صوفیا کی مجالس حال و قال میں جکریاں گائی جاتیں اور ان کے سننے سے اللہ کے چاہنے والے تڑپ اُٹھتے اور بہ حالت وجد رقص بھی کرنے لگتے تھے۔ حضرت سلطان الاولیا کے عہد میں بھی جکریاں گانے کا رواج تھا۔ عہد قدیم میں قوالی کی طرح جکریاں بھی مقبول تھیں۔ بہاء الدین برناوی اور شاہ ہاشم بیجاپوری ۱۰۵۹ھ نے بھی جکریاں یادگار چھوڑی ہیں۔

حضرت محمود کی جکریاں گجرات کے علاوہ شمال و جنوب میں ہر طرف مقبول تھیں۔ اخبار الاخیار میں اس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

"جکری بہائے و لے کہ بر زبان ہندی دارد و دستور قوالان آں دیار است بغایت مطبوع و موثر و بے تکلف و آثار عشق و وجد از سخنان وے لائح است۔" [1]

علاؤ الدین ثانی نے اپنی کتاب چشتیہ میں حضرت علاؤ الدین کی علائیوں کے ذکر میں حضرت محمود کی جکریوں کا بھی حوالہ دیا ہے[2]

"کلام مقبول او بہ شکل جکری قاضی محمود بحرکری می شنود برحمت او آفریں می شود۔"

اسی طرح تحفۃ الکرام اور خزینۃ الاصفیا میں بھی حضرت محمود کی جکریوں کا حوالہ ملتا ہے جکریاں مخصوص راگوں اور دھنوں میں چسپاں کی گئی ہیں۔ حضرت محمود نے بھی اپنی جکریوں کے اوپر راگ راگنی کا نام مثلاً پوربی، دھناسری، ٹوڑی وغیرہ دیدیا ہے۔

لہ اخبار الاخیار ص ۱۸۰ ، بحوالہ مقالات شیرانی جلد اول ص ۱۶۷

شاہ علی محمد جیو گام دھنی

شاہ علی محمد جیو قطب عالم شاہ ابراہیم بن شاہ عمر الحسینی احمدی کے فرزند ہیں[1]۔ علی جیو کو سید احمد کبیر سے نسبتی تعلق ہے[2]۔ شاہ صاحب خاص و عام میں بہت مقبول تھے۔ اسی وجہ سے انہیں گام دھنی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ موصوف نے ستتر سال کی عمر میں بتاریخ ۴ جمادی الاول ۹۷۳ھ میں انتقال کیا۔ مزار بمقام رائے کھڑ، احمد آباد متصل روضۂ شاہ غزنی واقع ہے۔

شاہ صاحب کی نظموں کا ایک مجموعہ جواہر اسرار اللہ کے نام سے ملتا ہے۔ نظموں کا موضوع وحدت الوجود ہے۔ مصنف مرآت احمدی جواہر اسرار اللہ کو دیوان شیخ مغربی کے برابر کا درجہ دیتا ہے[3]۔ شیخ بہاء الدین برناوی کے جانشین شیخ علاء الدین ثانی اپنی کتاب چشتیہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت برناوی احمد آباد تشریف لے گئے تو گام دھنی کے مہمان تھے۔ شاہ صاحب نے ایک روز اپنا کلام بہ زبان گجرات حضرت برناوی کو سنایا۔ شاہ صاحب نے اس کا ایک نسخہ جو آیات کلام پاک اور احادیث رسول سے محشی و مزین تھا حضرت برناوی کی خدمت میں تحفۃً پیش کیا[4]۔

جواہر اسرار اللہ کو دو مرتبہ دو مختلف حضرات نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ پہلی دفعہ شاہ صاحب کے ایک مرید شیخ حبیب اللہ بن عبدالرحمٰن القریشی الاحمد آبادی نے ایک مختصر دیباچہ کے ساتھ شائع کیا اور دوسری بار شاہ صاحب کے نبیرے سید ابراہیم ابن شاہ مصطفٰی حبیب اللہ ابن شاہ علی محمد نے طویل عربی اور فارسی دیباچہ کے ساتھ شائع کیا۔

مرحوم شیرانی نے گام دھنی کے کلام کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے :

"معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ صفات سے گذر کر عین ذات میں محو ہیں۔ قلب پر وصالی کیفیت طاری ہے۔ بشر، شجر، حجر، پھول، کلی، غنچہ غرض تمام مظاہر قدرت میں محبوب حقیقی جلوہ نما ہے اور یہ اس کے نشۂ محبت میں سرشار ہیں۔ اس سے

---

[1] مرآت احمدی میں نبیرۂ سید عبدالرحیم لکھا ہے۔

[2] سید احمد کبیر کا سال ولادت ۵۱۲ھ اور سال وفات ۵۷۸ھ ہے۔ (بحوالہ مقالات محمود شیرانی ص۱۰۸)

[3] دیوان دارند بہ زبان ہندی در روش ومعنی برابر دیوان مغربی است (مرآت احمدی جلد دوم)

[4] مقالات شیرانی جلد اول ص۱۰۹

رنگ رلیاں کرتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں۔ کبھی مجنوں بنتے ہیں، کبھی لیلیٰ کبھی شیریں ہیں کبھی خسرو کبھی دولہا ہیں اور کبھی دلہن۔ محبوب ان کا بھیس بھرتا ہے اور یہ محبوب کا بہروپ اختیار کرتے ہیں وہ ان پر ناز کرتا ہے اور یہ اس پر ناز کرتے ہیں رنگ اڑاتے ہیں اور ہولی کھیلتے ہیں مختصر یہ کہ وہ اپنی محبت میں مگن ہیں [1]

باباشاہ حسینی[2]

باباشاہ حسینی معروف بہ پیر بادشاہ گجرات کے ایک صاحب دیوان صوفی گذرے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق مندرجہ ذیل اشعار پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ شاید یہ علی جیو کے مرید و معتقد تھے

شاہ علی جیو جگ پرور تم ہو میرے لال نازک نہال ہے شاہ حسینی راکھو تم سنبھال

دنیا فانی سراب کی نا لاگی اس کو جھال

شاہ حسینی کی ایک غزل دستیاب ہوتی ہے۔ غزل کا موضوع حسن و عشق کی بجائے مذہب و اخلاق ہے۔

شیخ خوب محمد چشتی

حضرت شیخ خوب محمد شیخ کمال محمد سیتانی کے مرید تھے۔ وطن احمد آباد گجرات ہے۔ صاحب مراۃ احمدی نے حضرت خوب کو صوفی کامل اور شاعر صاحب سخن کہا ہے

"درویش کامل و صاحب لسان و صاحب سخن بودند، در تصوف دست رسا داشتند۔ بر جام جہاں نما شرح نوشتہ، امواج خوبی و خوب ترنگ نیز از ایشان یادگار و مشہور و معروف است"

خوب محمد نے بتاریخ ۲۴۔ شوال ۱۰۲۳ھ/ ۱۶۱۴ء میں وفات پائی۔ مسجد فرحت اللہ بیگ کے متصل بمقام چوک رخاص بازار احمد آباد مدفون ہیں "خوب" لفظ سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔

فارسی اور گجری میں تصوف پر کئی چھوٹے بڑے رسالے (نظم و نثر) آپ سے یادگار ہیں۔ حفظ مراتب شراب جام، عقیدۂ صوفیہ، خلاصۂ موجودات، صلح کل، خوب ترنگ، چھند چھنداں،

[1] مقالات شیرانی [2] اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ ص ۱۴۳

بھاؤ بھید دستیاب ہیں[1]۔ حفظ مراتب میں وحدت الوجود پر بحث ہے۔ اس میں سوال و جواب کے انداز میں نکات واضح کیے گئے ہیں۔ رسالہ فارسی نثر میں ہے اور سترہ سطری مسطر میں ایک سو ایک صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ تصنیف ۱۰۰۹ھ ہے۔ کتب خانہ پیر محمد شاہ میں اس کے دو نسخے محفوظ ہیں۔ عقیدۂ صوفیہ فارسی نثر میں ہے۔ رسالے کے آخر میں تاریخ اس طرح ہے :

سال شمار و سال از اعداد اگر کس　　　بگو خوبی ہزار و سیزدہ بس
(ملفوظی و مکتوبی دونوں ہیں)

خلاصۂ موجودات پانچ صفحے کا فارسی رسالہ ہے۔
اس کا سنہ تصنیف یہ ہے :

زخوب خوب برآید بجائے سال صریح　　　رسالہ خوب نمودی تو خوب ہر دو ملیح
ہزار چار دہ اتمام صبح ان سناست　　　صباح دوازدہم در رجب خمیس صحیح

رسالہ صلح کل بھی مختصر فارسی نثر میں ہے۔ تاریخ اس طرح ہے۔

آمد ہزار و شانزدہ ز ہجرت محمد　　　تاریخ صلح کل بقول خوب محمد

حضرت خوب کی تصنیف خوب ترنگ زبان نیز موضوع کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ خوب ترنگ کی تاریخ تصنیف ۹۸۶ھ/ ۱۵۷۸ء ہے۔ قطعہ تاریخ یہ ہے۔

نسخہ کی تاریخ اس ٹھانہ　　　پائے عدد ہر مصرعے مانہ
خوب محمد چشتی بچار　　　چودہ گھاٹ اور دس برس ہزار
دو جاچان سو تھا شعبان　　　دلیں دوشنبہ کیا بیان
برس ہزاروں دکھ قبول　　　جو کہیں جانیا جائے رسول
خدا سو جانیا کہی کب　　　بوجھیا جائے محمد جبؐ

خصوصیت یہ ہے کہ شعر نمبر ۱ کے ہر مصرعے سے تاریخ نکلتی ہے بعد دوسرے مصرعے ملفوظی و مکتوبی تاریخیں نکلتی ہیں۔ تصنیف ان کے مرشد کے ارشادات پر مبنی ہے۔ خوب کا بیان ہے :

[1] بھاؤ بھید اور چھپے ماں کا ذکر مولوی عبدالحق صاحب نے اُردو کی نشوونما ... میں کیا ہے
[2] مخطوط کتب خانہ پیر محمد شاہ۔ احمد آباد

میں مرشد تھی سنیا ہوں بیان — وے مرشد صاحب عرفان
جنھوں منجے سکھایا وین — جنہہ تھیں منجہ دل ہوا یقین
وارث محمدی بر ٹھاؤں — شیخ کمال محمد ناؤں
ان تھی میں سنیا دن رات — اوس مال یاد رہی کچھ بات
وہ جیوں منجکو آئی ترنگ — جمع کیے نے تس تس ڈھنگ
خوب ترنگ اس دیا خطاب — مدح رسول اللہ باب[1]

خوب ترنگ میں تصوف کے مسائل انوکھی تشبیہوں اور حکایتوں کے ذریعہ واضح کئے گئے ہیں۔
خوب صاحب کی دوسری تصنیف خوب ترنگ کی شرح ہے۔ اس کا نام امواج خوبی ہے۔ اس کی تاریخ تصنیف ذیل کے شعر سے نکلتی ہے۔

صدو شمار ز تاریخ شرح نعت محمد — ہزار سال مکمل ز فکر خوب محمد

دوسری تاریخ یہ ہے:

شمار ہم سال شرح نعت احمد — دہم سال از دہم عشر از دہم صد

حافظ محمود شیرانی نے اورینٹل کالج میگزین میں خوب کے ایک رسالہ چھند چھنداں کی نشاندہی کی ہے۔ شیرانی صاحب کے الفاظ ہیں: "یہ عروض ہندی و فارسی اوزان اور دھیاو دھا کے متعلق ہے۔ یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے۔ اس کا ابتدائی شعر یہ ہے۔

بسم اللہ کر ناؤں دہر چھند چھنداں — پنگل اور عروض اوزان ادھیا تینہ آں

اس کا عروضی حصہ اس دوہرہ سے شروع ہوتا ہے:

پنگل گن سب کہہ رہیا اب عروض گت آکھ — مصرے خوب آنہیں کے جدی جدی بد بھاکھ

ارکان عروض کے ذکر میں بیان کرتے ہیں:

خوب اصل جز آٹھ ہیں ان کی بکت پچھان — دوئی خماسی تین ہن جیکوں سباعی جان

یعنی فعولن اور فاعلن خماسی ہیں اور مفاعیلن، فاعلاتن۔ مستفعلن، مفعولات، متفاعلن اور مفاعلتن سباعی ہیں۔"[2]

---

[1] مخطوطہ کتب خانہ پیر محمد شاہ
[2] اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۳۰ء

ڈاکٹر عبدالحق (بابائے اردو) کے کتب خانہ (انجمن ترقی اردو) میں خوب صاحب کی کئی تصانیف محفوظ ہیں۔ ان میں ایک رسالہ "بھاؤ بھید" کے نام سے ہے، اس کا موضوع صنایع بدایع کلام ہے۔ عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اس رسالہ کے متعلق خود خوب محمد فرماتے ہیں:

"گفتہ صنایع بدایع را بہ زبان گجرات از جہت یادداشت می گویم، امید بحضرت صانع و بدیع چنانست کہ مقبول گرداند۔"

دوہرہ:

حمد خدا کی خوب کر کہہ صلوٰۃ رسول   پچھیں صنعت شعر کی کہے تو ہوئے قبول

اماں بعد ایں رسالہ بخطاب بھاؤ بھید مخاطب شدہ است در بیان تلونات کلام وانواع مفہومات نظام۔

دوہرہ:

بھاؤ بھید اس نانو کریات بکٹ بھائن،   بھاؤ بھید کے شعر کے خوب جو تجھ آپ آئن[1]

صنعتوں کی مثالیں:

صنعت تفریق تنہا آنست کہ میاں دو چیز جدائی افگند۔ مثال

یں خوب تفریق تنہا پچھاں   جدائی دو ہوں ما نہا اس بھانت آن
کنول مکہ جمل بن جدائی ایک بات   کنول دیس پھول سو میں یہ دیس رات

خوب ترنگ میں خوب صاحب اپنی تخلیقات کی زبان کے متعلق رقمطراز ہیں۔

جیوں میری بولی منہ بات   عرب عجم مل ایک سنگھات

نثر میں اپنے خیال کی وضاحت اس طرح کی ہے۔

"من بزبان گجرات کہ الفاظ عربی و عجمی آمیز است گفتہ ام"

اس سے یہ مراد لی جاسکتی ہے کہ خوب صاحب نے اس ابھرتی ہوئی مروجہ زبان میں کہا ہے جو گجرات میں مقبول تھی۔ اسی زبان کو رسالہ بھاؤ بھید میں "بولی گجرات" کے نام سے یاد کیا ہے!

جیوں دل عرب عجم کی بات   سن بولے بولی گجرات

[1] اردو کی ابتدائی ... ص۲۰

سید حسن جی

سید حسن بن سید فتح اللہ عارف وحید عالم وقت گذرے ہیں۔ نہروالا پٹن (گجرات) حضرت کی جائے ولادت ہے۔ والدین کا انتقال ہوجانے کی وجہ سے حسن جی اپنے بڑے بھائی سید محمد کے سایۂ عاطفت میں بمقام سورت قیام پذیر تھے۔ حضرت شیخ محمد نائب رسول اللہ برھانپوری بہ تفضل اللہ حج بیت اللہ سے واپسی پر اپنے ہمراہ حسن جی کو برھانپور لے گئے۔ برھانپور میں حسن جی نے تکمیل علم کی اور ۱۰۲۹ھ تک اپنے مرشد سے کسب فیوضات کرتے رہے۔ مرشد کی وفات کے بعد حسن جی سورت لوٹ آئے اور رشد وہدایت کی خدمت انجام دیتے رہے۔ موصوف نے چورانوے ۹۴ سال کی عمر میں بروز چہارشنبہ ذی العقدہ ۱۰۹۲ھ میں وفات پائی[1] مزار سورت میں محلہ سید پورہ کے قریب ٹیلہ حسن جی میں واقع ہے۔

حسن جی نہایت پرگو شاعر تھے۔ فن خطاطی سے بھی حضرت کو شغف تھا۔ وہ نہایت خوش نویس تھے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں چالیس ہزار فارسی اشعار موزوں کئے تھے اور ہندی (اردو) میں پانچ ہزار اشعار میلاد النبی کے سلسلہ میں قلم بند کئے تھے۔ سرور کائنات کی مدح میں چند بے نقط قصیدے بھی کہے تھے اس طرح تقریباً ایک لاکھ اشعار حسن جی سے منسوب کئے جاتے ہیں[2] افسوس کہ ان کا کلام دستیاب نہ ہوسکا۔ قصیدۂ بے نقط کا صرف ایک شعر حقیقت السورت، میں درج ہے۔ شعر یہ ہے:

علوم آمد ہمہ او عدل و کرم   محمد آور و السلام کرد دو عالم

---

[1] تذکرۃ الانساب، برکات الاولیا، حقیقت السورت میں آپ کے حالات درج ہیں تذکرۃ الاولیا میں سنہ وفات ۱۰۰۴ھ ہے اور حقیقت السورت میں ۱۰۹۲ھ درج ہے۔

[2] حقیقت السورت۔

نمونہ کلام

باجن :

نقل از مخطوطۂ احکام اللہ حضرت

صفت دنیا ایں درویش بزبان ہندی گفت است

یہ فتنی کیا کسے ملتی ہے   جب ملتی ہے تب چھلتی ہے
ان چھل بہت چھلائی ہے   ان رو کر بہت رولائی ہے
ان چھو کر بہتی گھائے.

ان بہت گھیکے پارے   اس بلگی ویراں پچھارے
وے جے رہے اس تھی نیارے   وے جائے نہ اس تھے پارے
اس کارنہ تپنہ ترسنہ   چک ملے تو اس سنہ بلسنہ
یہ فتنی انھوں تپاوے   چک پاس ناتھوں آوے
جے اسم کدھی نہ لورنہ   جو ملے تو بھی اس چھوڑنہ
جے دیکھت اس تھیں بھاگے   یہ نیلج انہ منہ لاگے
دیکھ باجن یہ تو جھوٹی   مکھ میٹھی چت ایٹھی
یہ اہے ایسی دھیٹی .

شیرانی صاحب کی نقل کردہ نظم یہ ہے

صفت دنیا بزبان دہلوی نیشتہ :

یہ فتنی کہا کسے یہ ملتی ہے   جب ملتی ہے تب چھلتی ہے

چھو کر = مل کر۔ گھائے = زخمی کرے۔ پچھارے = کرے۔ جے = جو۔ نیارے = الگ۔ کارنہ = کارن۔ تپنہ = تپیں = جوش کریں۔ ترسنہ = ترسیں۔ سنہ = سوں = سے۔ بلسنہ = بلسیں = استعمال کریں خوش ہوں۔ تپاوے = ترسائے۔ ناتھوں = نہ انھوں = نہ ان کے پاس۔ اسم = اس کی طرف۔ لورنہ = لوریں = خواہش کریں۔ کدھی = کبھی۔ چھوڑنہ = چھوڑیں تھیں = سے۔ ایٹھی = دھوکے باز۔ کپٹی دھیٹی = ڈھیٹ

اول ان چھل بہت چھلائے　　ان چھوہری بہتی کھلائے
ان روکر بہت رولائے
یہ فتنی کہا کسے یہ ملتی ہے　　جب ملتی ہے تب چھلتی ہے
ان بہت گھیرے پارہے　　جے اس تھی لکے وے ان چھارے
جے اس تھی تارنے　　وے نہ جانے اس تھی پارے
جے اس کارنہ تپنہ ترسنہ　　جے چکہ لے تو اس سنہ بلسنہ
یہ فتنی انھوں نے تپاوے　　چکہ پاس انہوں ناوے
جے اس اکدھی نہ نوریں　　جے چکہ لے تو بھی اسی چھوڑنہ (ریں)
جے دیکھ اس تھے بھاگے　　یہ نیلج ان سنہ لاگے
تخلص: دیکھ باجن یہ تو جھوٹی　　مکہ میٹھی چت نیٹھی
یہ ابے ایسی دھیٹی/　　یہ کیا کسے یہ ملتی ہے
مخطوطہ مملوکہ احکام اللہ حضرت

تیکر پنتھ کوئی چل نہ سکے　　چیری چلے سو چل چل تھکے
پڑھ پنڈت پوتھیں دھویاں　　سبہ جانا سدھ بدھ کھویاں
سبہ جوگیوں جوگ بسارے　　یہ تپنی تپ بکارے
ایک درشنی درشن بھولے　　سرناگے پانو نہ کھولے
ایک سیوری ہوئی کرسیوکرنہ　　ہوئی برتپٹی کیا وکھ دھرنہ
ایک درویش ہوئی کرآئے　　ہوئی قلندر روپ بھرائے
ایک ابدال ہوئی ابدہوئے　　ایک باڈھیں ہا ہا ہوئے
ایک کھلی ہوئی دیوانے　　ایک باول ہندہ راتے

پنتھ = راستہ۔ چیری = جوگیا۔ سبہ = سب۔ تپنی = تپ کرنے والے۔ بکارے = بگاڑے
پانو نہ = پاؤں۔ کھولے = کھلے۔ سیوری = جین سادھو۔ سیوکرنہ = سیوکریں = عبادت کریں۔ برتپی = بڑے
مشکل تپ کرنے والے۔ ابد = عبادت۔ باڈہ = آوارہ گردی۔ کھلی = گھلے = گھیلے = دیوانہ۔ باول = پاگل
ہندہ راتے = آوارہ گردی کرے۔

ایک ماتی ہوئی ارراویں   بہی بے سدہ ہو ہو جاویں
ایک جنگم جٹا دھاری   ہور بندہ نس اندھیاری
ایک کابری ہوئی کرکنپہ   منڈہ سیویں تجہی جنپہ
ایک منہ کنکل کیل کرنہ   ایک پھونک پھونک پاوے بھتیں دھرنہ
ایک رہیں اپاسی راتنہ جاگنہ   ایک ہوئی بہکاری تجہ بہی مانگنہ
یوں ٹولی ٹولی ہوئی کرے   سبہ رل رل گھل گھل گھوئی کرے
وے کمت منیں یوں دیکھے   ری باجن توں کس لیکھے

سونا روپا بہر بہرے ہور بہتی دام   بہت بڑایاں کہہ خاصے موٹا نام
تجہ بن یہ جی مج بہی کچھ نہ آوے کام   بہتر باہر بیرے رہے تجہ سوں سب بسرام
جی جیو ہوئی پیو سوں تجہ تو بہی سب کچھ   بہی گہورے گہر بیرے مجہ ناہیں رچہ
باجن کیئی یہ بنتی شیخ رحمت اللہ پاؤں   دنہ جگ واری دئی کر ہو سرجن رایوں

یہ جیو دیسوں یہ جیو دیسوں   تس دن تمنہ بھوگ کریسوں
یہ جیو پیارا منجہ تری تائیں   بہیت تماری کروں گسائیں
باجن جیو تمہاری تائیں   جیو جیو اسے تونہیں گسائیں

ماتی = محبت کے ماتے۔ ارراویں = چلائیں۔ کابری = پاگل۔ کنپہ = کانپے = لرزے۔ منڈہ سیویں = سر منڈھائیں۔ جنپہ = چپیں (۱) منہ = چپکے۔ کنکل کیل کرنہ = افسوں پڑھ پڑھ کر تالو میں لائیں دھرنہ = دھریں = پکڑیں۔ مسخر کریں۔ اپاسی = اپاس کرنے والا۔ راتنہ = رات کو = جاگنہ = جاگیں۔ بہکاری = بھکاری۔ تجہ بہی = تجھی کو ماگنہ = مانگیں۔ گھوئی کریں = رس نکالے ہوئے گنے کی طرح کرلیں۔ وے = وہ۔ منیں = میں۔ کس لیکھے = کس شمار میں۔ (۲) بہتی = بہت ہی۔ مج بہی = مجھے۔ کچھ = کچھ۔ بسرام = آرام۔ گہورے = گھوڑے۔ بیرے = بڑے بڑے خاص ہاتھی۔ ناہیں = نہیں۔ رچہ = دلبستگی۔ کیئی = کہی = کی۔ دنہ = دونوں۔ واری دئی = نثار کرکے۔ (۳) تری تائیں = تیری وجہ سے۔ بہیت = بھیٹ = نذر۔ جیو جیو = رگ رگ میں۔ اسے = ہے۔ تونہیں = تو ہی۔

باجن تنتے ہولبھاری۔جی دہیان دنی کی لاگیں
کہری کہری اور کہک جگاویں پہری پہری بیٹھے جاگیں
راجی کے دربارسی نت ساری راتو نہ پہری پہری
رن بن بکہرو کرل کریں مندر مندر دیورے بلینہ
آپیں جاگیں اورن بی جگاویں پہری پہری سبد سناویں
النگ النگ بیٹھہ ہیں چوکے ات جاگو لوکا جانی رات[1]

مندرجہ ذیل اشعار میں شریعت، طریقت، حقیقت کو سمجھایا گیا ہے۔ اس پر لفظ گوجری لکھا ہوا ہے۔

گوجری:۔

جی توں اچھے بدکارو　　　　اودھنا دیکھ پسارے پاؤ
شریعت کی توں بات نچھوڑ　　　جے تجہ جنم نہ لاگے کہور
طریقت اچھے نبی کا فعل　　　　بکھیں بات نہ اچھے کھیل۔
حقیقت دریا اچھے بے کنار　　　بھوت ڈوبے کچہ اترے پار[2]

گوجری:

جہت مشاکھیلت سیج پیج ہوئی　　　سیج پرم کھیلے بدلا ہوئی
باجن ساجن وسے نرملی　　　　جونہ لینہ چھپا نہ
جب ساجی آگنہ ہو چلنہ　　　　جھوٹ چھوڑ ست جانہ[3]

---

[1] تنتے، ان کو۔ لبھاری، خوشی۔ جی، جو۔ دہیان، دھیان۔ کہری کہری، گھڑی گھڑی یا کھڑے کھڑے۔ کہک جگاویں، شور غل۔ پہری پہری، باری باری۔ بیٹھے، بیٹھیں۔ راتو نہ، رات بھر۔ بکہرو، پکھیرو، پرندے۔ کرل، آوازیں، کراہنا۔ دیورہ، دیئے۔ بلینہ، جلیں۔ سبد، نیک باتیں (رشد)۔ النگ، الگ۔ بیٹھہ ہیں، بیٹھیں۔ چوکے ات، چوکیات، چوکیاں۔

[2] اچھے، ہے۔ بدکارو، بدکار۔ اودھنا، اوڑھنا، چادر۔ جے، جو۔ کہور، کھوڑ، عیب۔ بکھیں، کہیں۔ بھوت، بہت۔ [3] بدلا، شاذونادر۔ جونہ، دیکھنا۔ لینہ، لینا۔ چھپانہ، چھپانا۔ ساجی، ساجن۔ آگنہ، آگ، محبت کی آگ۔ جلنہ، جلیں۔ جانہ، جانیں۔

جب راوت جانوہ جہو جہیں باجن تب تو اکہو جائیں
جہہ جہہ جیت کریا ہورنہ تب ہوئی پاچہیں آئیں [۱]

باجن جی کیسکے عیب دہانپے — اس تھی درجن تہر تہر کانپے
نمت علی ایسے بہی پائی — میجا اکھیا جاری تھائی [۲]

اللہ سیتی جیکوئی ہوئے — اللہ اور جگ اس کا ہوئے
من مراد گھر بیٹھی پاوئی — تب اس مارنسکی کوئی [۳]

باجن دعا خدا ایسکے قبولے — کھاوے حلال او ساج بولے [۴]

محمد سرور پر مکان رحمت اللہ بہریا — باجن جیورا وار کرا کین ہریا [۵]

باجن کوئی نہ جانے وہ کدتھا اور کدھن کت تہیلا — اوہی جانیں اپ کوں جن سب جگ نہ پایا [۶]

قاضی محمود دریائی

جا پوچھو پیو کس ٹھاناں — ییں پیو منہ پیو مجہ مانہاں
دود مانہ گھی جوانہاں — یو پیو جیو من مانہاں
جی کو تن اپنائے ناوے — اس پرکت پیو دکھلاوے
کچہ پیو تہیں الگا ناہیں — مجہ لکھن یوں من ماناہیں

---

[۱] راوت = سپاہی۔ جانوہ = جاتے ہیں۔ جہو جہیں = جنگ پر۔ اکہو = آگے۔ باہورنہ = باہوریں واپس آئیں۔ پاچہیں = پاچہیں = پیچھے [۲] درجن = شیطان = بدکار۔ میجا = میچا = میچ کر جاری = چاڑی = چغلی۔ [۳] سیتی = سے۔ گھر = گھر۔ [۴] ساج = سانچ [۵] پرمکاں = پریم کا = محبت کا۔ بہریا = بھرا ہوا۔ اکین = اگیں = آگے۔ [۶] کد تھا = کہاں سے۔ کدتھیں = کب سے۔ برکت = پرگٹ = ظاہر۔ نہ پایا = بنایا۔

جی کو مرم سودھا پاوے   سب الجھن اس کی جاوے
قاضی محمود اتنا مانے   میٹھی پیو کوں الگا نجانے
بہت بات ایک آکھی   وی جھوٹ نہیں چکہ ساچی [1]

در رام کلی

آئی نہ دیکھو مجکوں میرے تن لوھو نہ ماسا   ہوں تیو تجہ کارنے روئی روئی بھرن نسا سا
ہوں پیو تجہ کارنے تجہ دیا ناوے   آہیں پرت اپاے کوئی کی آپ چھپاوے [2]
جدکے بچھڑے تجہ تھیں تل آئی نہ پوچھی   نیہ تیری میں پڑ کر ہوں کھڑی
باچ نہ باے اپنے پیو کیوں تپاوے   تیرے چرنوں کیری محمود وارن نے جاوے [3]

در ملہار

آیوری مجہ ملن کے کاج   تجہ پر پیار میرا ہے آج
تپتی تھی نت جیتی تھی   تجہ کارن بھی کھپتی تھی
کہہ سکھی تو یوں مجہ راکھیں   جن جن آگیں کرج ناکھیں
چھپا رہتا ہوں تجہ پاس   کیوں نہ ملے توں راسکہ راس
محمود پرگٹ نیچیں پیار   لوک جانے تو آنے کھار کہ

بھولا تو سیوک تر امجہ تو نہیں بھاوے   اس من میرے تو بسے چنت اونا وے
جا پیا پھوری ہوں پھری تیری پرت کے باندھے   میں بھولیں جنم گنوایا اب سو تم سوں ساندھے
بینوا محمود بنتی من کر رہے سائیں   اس من میرے توں بسے چنت اونڈ لائیں

---

[1] تھاناں = ٹھاؤں، جگہ۔ منہ = ماں = میں = مانہاں = مجھ میں۔ تن = جو۔ تاوے = تپاوے = پرکٹ پرگٹ = ظاہر۔ الگا = الگ = نا نہیں = ناں بیا = نہیں۔ نیکھن = خیال واسطے۔ سودھا = چین۔ آکھی = کہی۔ [2] تیو = تیوں = دلوں۔ کارنے = واسطے لئے۔ نسا سا = ہاے ہاے = آہیں۔ دیا = رحم۔ پرت = محبت اپاے = دے۔ کوئی کی = کسی کو
[3] جد = جب۔ تل = گھڑی۔ نیہ تیری میں = تیری محبت میں۔ باچ نباہے = عہد کرے۔ تپاوے = اعتبار کرے
کیری = کے لئے۔ وارنا = نثار کرنے کو۔ تپتی = جلتی۔ کھپتی = گھلاتی۔ آگیں = آگے۔
ناکھیں = ڈالیں۔ راسکہ راس = رد بدرشتہ آنے۔ لائیں۔ کھار = خار حسد۔ تو نہیں = تو ہی۔
پھوری = پھرنا۔ بھولیں = غلطی سے۔ ساندھے = ملے۔

علی جیوگام دھنی

مکاشفہ نکتہ اوّل درعقدہ

میں کسی کی بات نہ جانیں　　بیٹھے اپس آپ بکھانیں [1]

نکتہ دوم : شاہ علی جیو ناٹوں دھراوں　　سلطان عالم آپ کہاؤں
سارے شاہوں کا ہوں شاہ ہوں

نکتہ سوم: علی علی کا راتا ماتا　　علی علی منہ کریو باتا
علی سوں جنی بنا تا

نکتہ چہارم: علی علی ہنس آپ کہاوے　　علی علی سوں لاوَن لاوے
علی علی پروار یا جاوے

نکتہ پنجم درتخلص: علی محمد آپ کہاوے　　علی محمد سب رنگ لاوے
علی محمد سہاگ لٹاوے [1]

مکاشفہ نکتہ اوّل عقدہ

پرگٹیا سیری سیریاں　　یہ بہیں باتاں لوچھیاں تیریاں [2]

نکتہ دوم : یہ روپ بیا کر چاوتوں　　جگ کیری بھیس آوتوں
سب مانہ بھیس کرتا بھاوتوں

نکتہ سوم : پیو بلبل تجہ سنوارنیں　　جیورہے نہ میرا دھارنیں
اس گھونگھٹ اوپر وارنے

نکتہ چہارم: تو اپنا روپ بکھیر کر　　ہر لوکوں اوپر بول دھر
ہورا تا دیکھی آپ پر

نکتہ پنجم درتخلص　　ری شاہ علی جیو موتوں　　کر چھند چھپاوے کیوں توں
سب بھیسوں مانہ ہیں جیو توں

---

[1] بکھانیں = تعریف کرے ہوں = میں۔ راتاماتا = عاشق۔ منہ = ماں = میں جنی = جس نے جس کو۔ لاوَن = لذت
[2] پرگٹیا = ظاہر ہوا۔ سیری = کوچہ گلی۔ بہیں = ماں میں۔ راتا = خوش وخرم = چھند = فریب = ناز

نکتۂ اول: آپیں کھیلوں آپ کھلاؤں — آپیں اپس لیکل آؤں
نکتۂ دوم: میرا ناؤں منجے اتی بھاوے — میرا جیو منجی پر جاوے
میری نیہہ سو منجہ سوں (؟) — دھری اپنیں روپ لبھاوے
نکتۂ سوم: لاگا نیہہ سو منجہ سوں میٹھا — جدکا سو دھن اپس دیٹھا
جیکوا پننن روپ ابھاوے — سبھی سوکیوں نہ آپ سہاوے
نکتۂ چہارم: میں منجہ دھریا ناؤں سنگھاتے — شاہ علی جیو ہے منجہ ساتے
منجہ میں کوئی نہیں چھلنہاں — جیری سہاگن ہوں تس نانہاں

مکاشفہ نکتۂ اول۔ درعقدہ

نکتۂ اول: اونچی پیپل لانبی ڈور — ہم دکھلائے سو کاڈھے چور
آپیں آپ ٹھوکا دیتا — پرگٹ ہو جگ کیری کیتا
ہوں تجہ بوجھوں یری ساتھے — کہہ کس آگھی یہ توں باتے
نکتۂ سوم: پرہوں کیری آنکھ چھپانی — تل منہ کھل کر کئی سمانی
جب اُدھوپ کھل کھلاڑی — اُوجت آوکر سادہ کیاری
نکتۂ چہارم: گلی گلی کی کینی پھیری — پن ٹولھیا توں ہیں میری
بیس علی جیو میری مانہاں — پرگٹ ہو جب کہیا نانہاں

معراج نبی

آدم آدھیں ہور جن سارے لے نبی نور تھے کیتے — تھیں بھرا کر آپ دکھلایا ہم تم اوپر ہوں سو دیتے
دُنگر میواں ہور نباتات لے سب نور نبی کا جانوں — احمد محمد ناؤں احد کے دو جا من منہ کوئی نہ آنوں
توریت ماں خدا ایں کہیا جتہر موسیٰ ہاتھ — محمد رسول حبیب نہہا کا ساروں کہہ یہ بات
احمد بھی ہے توریت مانہیں محمد کرا ناؤں — انجیل ماں بھی احمد کہیا کے تھیں بس ہولد ٹھاؤں

لیکل: نکل۔ آتی: بہت۔ اپنیں: اپنا ہی۔ جدکا: جب سے۔ دیٹھا: دیکھا۔
جیکو: جس کو۔ سنگھاتے: ساتھ۔ منج میں: مجھے۔ جیری: جس کی۔ کاڈھے: نکالے۔ ٹھوکا: آواز۔
آوکر: آکر۔ سادہ: آواز۔ ٹولھیا: ڈھونڈھا۔ بیس: بیٹھ کر۔

احدیت تھیں وہ ہووا ظاہر حضرت نبی محمد میرا — آئے صلب عبداللہ کے سگلے ٹھانوں.....
باجت گاجت سہیلا گاویں لاتے تجہ روپ اجاگل کرے — آج ہماری عید بھی ہے نین سلونے دیکھے تیرے
حبیب خدا کا خاتم انبیا ساروں کا سرتاج — جس کے مولود باجت گاؤ عید ہماری آج
علی محمد ایکیس نور ہے بکھر گیا چوندیس سوے — بھیس انپڑے آپیں لیا رہیا آپس آپیں جوئے[1]

شیخ احمد کبیر کی مدح[2]

سلطان سید احمد میرے — لے سب نور نوازے تیرے
جد تمہارے امت شاہ نبی ابیں معراج کی رات — امت سگلی تجکوں بخشی مرید کئے سب تیرے نھا
شاہ شہاں ہیں جیسے جگا نہاں سیوا کریں تو تجہ بالا — غوث قطب سب عالم کیرے واریں جاویں تجہ پر اپارا
سانچا شاہ حسینی راجا نو کھنڈ تیری آن — سارے مرید تمہارے پیار انے کریں بکھان
سلطان انبیا کل جگ داتار شاہ علی تن جیو — سلطان سید احمد جے ساروں کا تیں جیو[3]

رجز مربع سالم[4]

بہ جیو تو رہتا نہیں بھور من دکھ سہتا نہیں — کو جاے پیو کہتا نہیں۔ رے بھائیو ہوں کس کروں
مج جگ کہے جیتا نہیں۔ پیو باج مج گمت نہیں — من مانہہ نیر سمتا نہیں۔ رے بھائیو ہوں سوں کروں
کچہ بات ہے پن کیوں کہوں۔ من مانہہ کی من لے رہوں — تو جیکہ کرے ہوں دوکہ سہوں۔ رے بھائیو ہوں سوں کروں
مجکو دکر دہیں۔ جانو جو ایسا کو سہیں — مج باج علی جیو کے کہیں۔ رے بھائیو ہوں سوں کروں

---

[1] منہ، ماں، میں، میا۔ آنوں، لاؤں۔ ماں، میں سایں۔ یہ۔ مانہیں، میں۔ کرا، کوکے۔ ٹھانوں، مقام۔
ہووا، ہوا۔ اجاگل، اجاگر، چمکیلے، جس کے۔ ایکیس، ایک ہی۔ انپڑے، وے۔ جوئے، دیکھے۔

[2] اوریئنٹل کالج میگزین فروری ۱۹۳۱ء۔ محمود شیرانی۔ مخطوطہ پیر محمد شاہ اول آخر ناقص ہے۔

[3] ابیں، یہ۔ سگل، ساری۔ جگا نہاں، جگ میں۔ آنے، ادب۔ بکھان، تعریف۔ تن، ان میں سے۔
تیں، تو۔ کو، کوئی۔ سوں، کیا۔ گمتا، اچھا لگنا۔ مانہہ، میں۔ نیر، آنسو یا نیہ، محبت۔
سمتا، سماتا۔ پن، لیکن۔

[4] مضمون محمود شیرانی

باباشاہ حسینی

غزل[1]

روبرو ہے شہہ درسن بے نقاب　　دیک ناسک بولتے ہیں درحجاب
کس اوپر رکھتے ہیں خواہش دید کی　　دید کر آپس کا مانند حباب
اس عبادت بیچ مین ہے حق رسی　　حوض مسجد کا کریں پانی خراب
حق رسی کی ہے عبادت عین دید　　چوں صنم کا مبتلا مست شراب
دل ترا از آب ریا ظا ہر منے　　بہرا ستنجا رہیں در پیچ و تاب
گھر سے نکلیں رہ گذر کی دید کوں　　وقت جانا گر جماعت کا شتاب
طعنہ زن نیں ہے حسینی بر عباد　　دل سیں کرتا ہے اپس کے یوں خطاب

خوب محمد چشتی

آغاز کتاب خوب ترنگ

ہے موجود سو کیتی شان　　پہلوں اس کا کر عرفان
ایک موجود وجودی ہوئے　　کس کی چھٹ پر چھٹانہ سوے
وہ آپیں ذاتیج چھٹا ج　　ذات نہ وہ چھٹ ماں محتاج
ہب دو جا موجود پچھان　　وے موجود سو ذہنی جان
دھریا اس کا ناؤں صفات　　ھاتھ لاؤ تب پانی ذات
سمع بصر نہیں لاگے ھاتھ　　ذہنی ہے لازم چھٹ ساتھ

---

[1] بحوالہ اُردو کی نشوونما ... کام از مولوی عبدالحق۔

خوب محمد چشتی

عذر خواہی

جیوں میری بولی منہ بات — عرب عجم مل ایک سنگھات
تیوں ھیں کھوٹگا کریں نہ گھور — آیا بول کیا نہیں چھور
اینہا شعر کا قصہ نہ لیکہ — اینہا مراتب کہوں سو دیکہ
ارض و سما منہ جے نہ سمای — وزن شعر منہ وی کیوں آئی
دوریا ہوں نقطہ ول کی سان — دیکہ مراتب ستہ اس مان
کل مراتب جس منہ لیاؤں — کر نسخا تصنیف دکہاؤں
نعت نہیں کرتا ہوں سیر — با اللہ تمم بالخیر
غلط نہ پکریں اھواَن جان — درس کہوں وی توں من آن
جو کچھ خطا اس منہ توں پائے — آوے صحی کر برائے خدای
پن اتنا کہوں گود بچھای — مت اَن سمجیں بول پھرای

حکایت مرتبہ خلافت

جیوں محمود سو تہاں سلطان — عبد ایاز تخت فرمان
اوس پر حکم کیا کے آج — ہوں بندا توں ہیں سو راج
تخت ایاز سو بیٹھیا جانے — سوی کرے جی وہ فرمانے
چل محمود ہیں کیا سلام — کہیا کہ ہوں تجہ آج غلام
حاکم ہی محمود سو سب — جیوں سلطان عبدگی جب
جد محمود عبد کی شان — عشق کہے پورا سلطان
تخت ایاز سو بیٹھیا جانہ — حاکم نتسہ محمود اوس ٹہانہ

لہ تیوں = اسی طرح ۔ گھور = غور ۔ لیکھ = سمجھ ۔ اینہا = یہاں ۔ منہ = میں ۔ دوریا = لکھا ۔ نقش بنایا
جہیں = میں ۔ اھو = ہوکر ۔ ان جان = انجان ۔ من آن = دل میں لا ۔ گود بچھای = دامن پھیلا کر ۔
اَن سمجیں = بے سمجھے ۔ بول پھرائے = انکار کرے

حکم سو اوس پر کیتا جب — تخت بیں جا بیٹھا تب
انہیں قبولیا حکم تمام — تخت بیٹھیں ہوا غلام
حکم سو حاکم کا اس ٹھانہ — ہے محکوم غلامی مانہ
حاکم شخص سو ہے معبود — جہانہ محکوم ھوی مسجود
اینہا خلافت پائی تمام — ہوی سلطان جو عین غلام
ایک بلونت سو ہوا سوار — آیا راج کنور کے بار
کہیا کہ میرا زور آزماؤں — آج تماشا یک دکھلاؤں
بڑا زلیچہ اک بچھوای — سونا چیتا تس اوپر جای
دوھوں ہاتھ لا سیچے ناکھ — زور پیٹھ کے رہیا سو راکھ
کہیا اینہاں تھیں منجے اچاؤ — لاکھوں مل ایک تسو ہلاؤ
سب بلونت ملے یک ٹھور — کہیا زلیچہ پھرتے دور
ایسا بل اکھٹے مل کیت — جیوں زلیچہ اوچا سو ویت
جنہ بلونت سوتا تھا ٹھانہ — اتنا ٹوٹ رہیا سو ٹھانہ
ٹوٹا یوں زلیچہ سوی — جیوں پوتلا چیترایا ہوی
ایتا بھار سو تھا اک زور — جس کا اب لگ آیا شور
بھار تو اتنا تھا سب بل — جیوں لے جای ٹٹو منزل
پن سب قدرت زور سو بھار — بھی سن اس کا کہوں بچار
بودھا ہوا سو وے بلونت — تب اوس کی ہوئی کیسی بھنت
ھلکا ھوی گیا جیوں پھول — کل رھوی جنہ چھاچھی دھول

ھوں ، میں ۔ سو اور راج کو الگ الگ پڑھئے ۔ جبہ ، جب ۔ تنہ ، تینوں ، اس کا ۔ کیتا ، کیا
بیٹھیں ، بیٹھ کر ۔ ٹھانہ ، جگہ ۔ مانہ ، میں ۔ جہانہ ، جہاں ۔ زلیچہ ، غالیچہ ۔ سوتا ، سویا ۔ چیتا ، چیت
تس ، اس ۔ اچاؤ ، اٹھاؤ ۔ اکھٹے ، اکھٹے ۔ جنہ ، جہاں ۔ کیت ، کیا ۔ ویت ، رہا ۔ پوتلا ، پتلا ۔
چیترایا ، نقش پڑا (چترنا ، نقش بنانا) بودھا ، بڈھا ۔ کل ، گل (گلنا سے) بھنت ، حالت

ادبی تبصرہ

اس دور کے جو کارنامے منظر عام پر آچکے ہیں ان کے مطالعے سے اُردو بولی، زبان اور ادب کی تاریخ کی کئی اہم کڑیاں مل جاتی ہیں۔ ان تخلیقات کے خالقوں میں سے ہر ایک نظام تصوف کے کسی نہ کسی خانوادہ کا نمائندہ تھا اور ان میں سے ہر ایک روحانی رہبر، وحدانیت کا پرچارک اور انسانیت کے علمبردار کی حیثیت سے بلند درجہ رکھتا تھا جب انھوں نے اپنے مقصد حیات اور اپنے مشن کی تکمیل کے لیے تیغ زبان کے ساتھ ساتھ تیغ قلم کو بھی کام میں لیا تو نثر پر نظم کو ترجیح دی کیونکہ نظم کے جادو اور اس کے اثر سے یہ لوگ بخوبی واقف تھے۔ اس دور کے کارناموں میں دوہا، مثنوی، نظم، غزل وغیرہ جیسی مختلف اصناف پائی جاتی ہیں۔ ان کے کلام کا موضوع سلوک و معرفت ہے۔ سلوک و معرفت کے نکتوں اور عقدوں کو جگہ جگہ تشبیہوں، استعاروں، تمثیلو اور کہانیوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔

اس دور کے دو بزرگوں شیخ احمد کھٹو اور باجن کے کلام میں دوہے ملتے ہیں۔ دوہا ہندی اثر کا نتیجہ ہے۔ ان بزرگوں نے جب ہندی زبان کو اپنایا تو اسی کے معیاروں کو کام میں لیا۔ اس دور کے بزرگوں کے ہاں جو دوہے ملتے ہیں وہ بھی تقریباً اسی ہندی میں ہیں جو اس وقت رائج تھی مثلاً

دو کہا کا جل جی کروں تو سوکن دکھ دینہ — نہ پیو دیکھن دینہ مجہ نہ آپ دیکھ سکینہ
باجن جیو امر ہے موو انکہیو کوئے — جے مووا کہے وہی سووا ہوئے
روزے دھر دھر نماز گذاری دینی فرض کوٹہ — بن فضل تیرے چھوٹک ناہیں آگیں کہیں بات

تیسرے دوہے میں غیر زبان کے الفاظ اور مذہبی اصطلاحوں کا استعمال غور طلب ہے۔ یہ دوہا اس دور کے بدلتے ہوئے رجحان اور غیر زبان کی ملاوٹ کا غماز ہے۔

باجن اور علی جیو کے کلام میں نظم کی ایک خاص قسم ملتی ہے۔ باجن کے ہاں بعض نظمیں ایسی ہیں جن میں پہلا بند عقدہ کہلاتا ہے۔ اس کے بعد تین چار شعر کا بند ہوتا ہے اسے بین کہا جاتا ہے اور آخری بند تخلص کا بند ہوتا ہے۔ اس طرح علی جیو کے ہاں ایک مخصوص قسم کی نظم ہے۔ جس میں پہلا شعر مکاشفہ ہے اور اس کے بعد ایک شعر اور دوسرا ٹیپ کا مصرع ہے اس کو نکتہ کہا جاتا ہے۔ اس کا آخری نکتہ یا بند تخلص کا بند ہوتا ہے۔ جکری ذکر کی بگڑی ہوئی شکل ہے جکری

جگری کی شکل بھی ہو سکتی ہے۔ جیسے موسیقی میں ایک اصطلاح ہے جگری تے یعنی دل سے پیدا ہونے والی لے اسی طرح دل سے نکلنے والی آواز کو جکری یا جگری (کلام) کہا گیا ہے۔ جکری ہیئت میں مثنوی ہے مگر بہ اعتبار خیال غزل ہے۔ اس کا موضوع حسن و عشق ہے۔ اس کا ہر شعر ایک دوسرے الگ ہے یعنی مربوط خیالی نہیں ہے۔ گجراتی ہندی کی ترکیب پر ہر ایک جکری کے ساتھ ایک ایک راگ راگنی کا نام بھی دیا گیا ہے۔ ان جکریوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہندو فلسفہ کے مطابق اللہ کو عاشق اور انسان کو محبوب کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ قاضی محمود کا کلام سن کر ان کے زمانے کے مشائخ نے اعتراض بھی کیا اور قاضی صاحب کے مرشد شاہ عالم بخاری سے شکایت کی۔ شاہ عالم نے جواب دیا کہ بہتر ہے کہ اس کا جواب خود قاضی سے ہی طلب کرو کہ خلاف شرع باتیں کیوں کرتے ہیں؟ ایسی جکریاں حضرت نظام الدین اولیاء کے زمانے میں بھی رائج تھیں۔

اس دور کے آخری زمانے کے بزرگ خوب محمد چشتی کے ہاں اُردو کی چھوٹی چھوٹی مثنویاں ملتی ہیں انھوں نے سلیس و سادہ زبان میں مثالوں کے ذریعے تصوف کے اہم اور باریک نکات سمجھائے ہیں۔ خوب صاحب نے اُردو زبان و ادب کے تعمیری کام میں بطور خاص خدمات انجام دی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ خوب صاحب اُردو زبان کے پہلے نقاد گذرے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ عروض و صنائع میں ان کے رسالے چھند چھنداں اور بھاؤ بھید قابل قدر ہیں۔

اُردو شاعری میں صنف غزل اولین دور سے پائی جاتی ہے۔ اس قصر کی تعمیر میں صدیاں لگ گئیں اور آج یہ ہمارے دور میں ایک پختہ سیزنڈ (SEASONED) سرد و گرم دیکھے ہوئے صنف کی حیثیت سے ہے۔ آغاز میں اس کی صورت شکل اور نام تمام مختلف تھے۔ اولین دور میں یہ ریختہ کے نام سے وجود میں آئی اور ایک مدت تک غزل کے ساتھ ساتھ اس نام سے بھی پہچانی جاتی تھی۔ زیر بحث دور میں باجن اور دوسرے بزرگ بابا حسن کے ہاں ریختہ اور غزل ملتی ہیں۔ باجن کی غزل یا ریختہ کا موضوع تصوف ہے اور حسن کے ہاں غزل پند و نصیحت سے تعلق رکھتی ہے اس دور کی غزل کو صرف تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

اس دور کے کلام کا جائزہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ ایک طرف دوہوں اور بعض لفظوں میں پنگل کا استعمال کیا گیا ہے اور دوسری طرف فارسی بحور و اوزان کو بھی روشناس کرایا گیا ہے۔ جہاں تک کلام کی مقصدیت اور اس کی فضا کا تعلق ہے تمام تر کلام تصوف سے تعلق

رکھتا ہے اور موضوع خاص حسن و عشق ہے۔ فلسفۂ حیات و اخلاق و عالم خاکی کے مسائل بھی ان کی شاعری کے موضوع ہیں۔ وحدت الوجود کو مختلف طریقوں سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس دور کے کلام کی فضا خالص ہندوستانی ہے زبان وہی ہے جو اس دور میں بولی کی حیثیت سے بازاروں میں مروج تھی جیسا کہ خوب محمد نے کہا ہے۔

جیوں میری بولی منہ بات　　　　عرب عجم مل ایک سنگات

تیوں ہی کہوں گا کریں نہ گھور　　　　آیا بول کیا نہ چھور

اس لحاظ سے اس دور کا کلام اپنے دور کی بولی کی اہم تحریری شہادت ہے جس میں ابھی صناعی اور تراش خراش کا کام عمل میں نہیں آیا تھا۔ اس دور کے آخری حصے میں زبان کی صفائی سے اس کی ادبیت کے آثار نظر آتے ہیں۔ ان بزرگوں کے کلام تشبیہوں اور تمثیلوں پر جب نظر ڈالتے ہیں تو ان کے طرزِ تخیل کی ہندوستانیت واضح ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دہلوی، ہندی، گجری وغیرہ کا بھی طرزِ تخیل ہندوستانیت اور صوبائیت کا غماز ہے۔ اس دور کے کلام کی ہندوستانی و صوبائی فضا کلام کی بعض اہم لسانی خصوصیات سے ظاہر ہوتی ہے مثلاً

۱ گجراتی الفاظ کا استعمال (مندرجہ ذیل الفاظ اور بعض خصوصیات راجستھانی اور دوسری زبانوں میں بھی پائی جاتی ہیں)

جوئے، دیکھے، سیری، کوچہ، ایوے، ایسے، لیکھے، سمجھے، دیٹھا، دیکھا، ساتھے، ساتھ، سادہ، آواز، ٹھولیا، ڈھونڈا، آنوں، آنڈوں، لاؤں، ایہاں، یہاں، لاون، لذت و سالن کو بھی کہتے ہیں)

۲ ضمیروں کی قدیم شکلیں (گجراتی میں ابھی یہی استعمال ہوتی ہیں)

ہوں بمعنی میں، تمہ یا تمہیں بمعنی تم۔ جنہ۔ جینے «જેણે» بمعنی جس نے، تیں یعنی تو نے۔

گجراتی :-

۳ بعض جگہ صیغۂ ماضی بنانے کے لیے گجراتی قواعد کی پیروی کی گئی ہے۔ گجراتی میں ماضی بنانے کا یہ طریقہ ہے کہ مصدر میں آخری حرف سے قبل کے حرف کو 'ی' سے بدل دیا جاتا ہے جیسے دیکھنا کا گجراتی جوؤں اور اس کا ماضی جویوں «જોયું» ہوگا اور ماضی دیکھیا۔ اسی طرح دھروں یا پوچھوں کا ماضی دھریا اور پوچھیا ہے۔ آگے چل کر یہی دھرا اور پوچھا ہو گئے۔ کہنا، کہوں اس کا ماضی کہیا کہیوں اور آگے چل کر کہا ہو گیا۔

۴۔ بعض جگہ 'نے' کی جگہ 'سے' استعمال کی گئی ہے جیسے 'محمود نے' کی بجائے 'محمود سے' یا محمود یں 'سے' کیلئے 'تھی یا تھے' استعمال کیا گیا ہے مثلاً

جسے دیکھ اس تھے بھاگے۔ یہ تبلیغ ان سنہ لاگے (گجراتی میں سے کے لئے تھے یا تھی مستعمل ہے میں (اندر) کے لئے گجراتی منہ۔ ماں استعمال کیا جاتا تھا (نے) کے لیے (سے) گجراتی میں بھی مستعمل ہے۔

۵۔ مستقبل کی سے بنانے کی ترکیب گجراتی کے علاوہ کئی زبانوں میں ہے۔ مثلاً کریسوں دیسوں وغیرہ یعنی کریں گے۔ دیں گے۔

ارے رائے کا ساتھ داؤ تاوے ھانک ۔۔۔۔ پیچھیں مار گے رہسے تھاک

یہ جیو دیسوں یہ جیو دیسوں ۔۔۔۔ سبہ ہر ہر تھ سوں بھوگ کریسوں

الفاظ کی جمع بنانے کے دو طریقے پائے جاتے ہیں ایک برج کے مطابق جیسے راتیں، راتنہ، لنتیں، نینہ۔ درویشوں، درویشنہ۔

اور ان یا یان لفظ کے آخر میں بڑھا کر بھی جمع بنائی گئی ہے جیسے سیری سے سیریاں، آنکھ کی آنکھیاں لوگ (لوگ) سے لوگایا لوکاں۔

۷۔ جمع مضارع: کریں، دھریں، بھاگیں، مانگیں، مانگیں کے لئے برج کی ترکیب پر کرنہ، دھرنہ، جاگنہ، مانگنہ عام طور پر پایا جاتا ہے۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کریں۔ دھریں کی املا کرنہ، دھرنہ ہو۔ (کرنہ میں نون غنہ پڑھا جائے)

۸۔ بعض الفاظ اس طرح بولے جاتے تھے۔

اہے، ہے۔ منجہ، مجھ، چکہ اور کچہ، کچھ، ابہی، یہی، جد، جب، سبہ، سب، ابب، اب وغیرہ

۹۔ بعض فارسی الفاظ کا تلفظ اور لہجہ یہ ہے

نگہواں، نگہبان، درس، درست، آرس، عروس، زلیچہ، غالیچہ، نسخا، نسخہ، صحی، صحیح رازی، راضی، بیست، مسجد، بندا، بندہ، مصرے، مصرعے، ذہنی، ذہین وغیرہ

۱۰۔ ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اکثر فارسی محاوروں کا اردو میں ترجمہ کر لیا گیا ہے ممکن ہے عام بولی میں ایسے ترجمے پہلے ہی سے موجود ہوں اور جیسے جیسے ضرورت پڑتی گئی نئے نئے محاورے اردو میں منتقل ہوتے گئے یہ خصوصیت ادب کے ہر دور میں پائی جاتی ہے۔ ولی کے ہاں بھی ایسا

ہی کیا گیا ہے بلکہ غالب و مومن، اقبال وغیرہ نے ترجمے کے علاوہ نئی نئی ترکیبیں بھی بنائی ہیں۔

قدیم عہد کی چند مثالیں دیکھئے:

دفن کردن سے دب کردن۔ محبت داشتن سے پیار دھرنا۔ روزہ داشتن سے روزہ دھرنا۔ رقص سے رقصے۔ نواختن سے نوازے ہے وغیرہ

عا فارسی کے واو عطف کی جگہ ضمہ سے کام لیا گیا ہے جیسے ارض و سما کو ارضُ سما۔

ان بزرگوں کے کلام میں لفظ کے املا کے لئے کوئی ضابطہ نہیں پایا جاتا۔ مثلاً ح کے لئے ایک ہی نقطہ لگایا جاتا ہے۔ "ڑ" کو "ر" لکھتے ہیں۔ جھ کو جہ لکھتے ہیں اور کسی جگہ چار نقطوں سے حرف بناتے ہیں۔ مٹھی کو موٹی لکھا ہے۔

صوفیا نے شعر گوئی کو ادبی نقطۂ نظر سے نہیں اختیار کیا تھا اس وجہ سے ان کے ہاں تلفظ اور املا کا کوئی التزام نہیں پایا جاتا۔ انھوں نے اپنا پیغام رائج الوقت بولی میں دوسروں تک پہنچایا اس طرح بولی نے زبان کی شکل اختیار کرلی۔ رفتہ رفتہ زبان منجھتی گئی اور صفائی پیدا ہوتی گئی جو اس دور کے صوفی خوب محمد چشتی کے کلام میں نمایاں ہے۔

دوسرا باب

سیاسی سماجی پس منظر

۱۶۵۷ء تا ۱۷۰۷ء

سیاسی حیثیت سے یہ دور اورنگ زیب کا دورِ حکومت تھا اور ادبی حیثیت سے عہدِ ولی۔ ۱۶۵۷ء میں شاہجہاں کی علالت کی خبر عام ہوتے ہی شہزادوں نے تخت و تاج کے حصول کے لئے جدوجہد شروع کردی اور انجام کار اورنگ زیب نے اپنی سیاستدانی اور زورِ شمشیر سے تخت و تاج حاصل کرلیا۔ ۱۶۵۹ء میں (دوبارہ) دہلی میں تاجپوشی کی رسم ادا کی گئی۔ اس کے بعد سے عالمگیر کی شمشیر جو میان سے نکل چکی تھی آخر دم تک چلتی ہی رہی۔ عہدِ قدیم میں شورشیں اور بغاوتیں کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ آج بھی بدلی ہوئی شکلوں میں یہی ہوتا ہے [illegible] ب اور دشمنوں نے اس کو کٹر ملاں کہہ کر اس کے لاکھوں دشمن پیدا کردیئے تھے۔ سوائے خدا کے اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ اس کے اردگرد نمک حرام جمع تھے اور ان کی زبان تیغ ان کے اپنے آقائے ولی نعمت پر چلتی رہتی تھی۔ اس وجہ سے اس بادشاہ کو کبھی چین سکون دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

اس دور میں مقامی بلوے، جاٹوں اور سرحدی امراء کی شورشیں، راجپوتوں کی زورآزمائی مرہٹوں کے منصوبے اور سلاطین دکن سے نبرد آزمائی خصوصیت رکھتے ہیں۔ پورے ملک میں کوئی علاقہ ایسا نہیں تھا جہاں حکومت کے شمشیریں میان سے باہر نہ آئی ہوں۔ شمالی ہند میں جاٹوں اور راجپوتوں سے مقابلے، سکھوں کی سرکشی، سرحدی پٹھانوں کی لوٹ مار، باج گذار رئیسوں کی بغاوتیں، بنگالہ میں بدنظمی، آسام کوچ بہار کی بغاوتیں۔ دکن میں مرہٹوں کی لوٹ کھسوٹ کے بغور مطالعہ سے عالمگیر کے ہمت و حوصلہ کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ (۱۶۸۱ء میں

راجپوتوں کو زیر کرنے میں سات سال گذر گئے۔ شہزادہ اکبر نے راجپوتوں سے ساز باز کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا لیکن عالمگیر کے سیاسی تدبر نے سازش کو ناکام بنا دیا۔

۱۶۸۲ء میں عالمگیر نے دکن کا رخ کیا۔ دکن میں مرہٹوں اور سلاطین سے نبرد آزمائی میں اس کی عمر عزیز کے پچیس سال گذر گئے اور ۱۷۰۷ء میں وہیں پیوند خاک ہوا۔ مرہٹوں سے اپنے تمام قلعے حاصل کر کے ان کا زور توڑ دیا اور اس کے بعد ۱۶۸۵ء میں بیجاپور اور ۱۶۸۷ء میں گولکنڈا کو فتح کر لیا۔ مرہٹوں کا اگرچہ زور ٹوٹ چکا تھا، ۱۷۰۰ء میں راجہ رام بھی مر گیا مگر اس کی بیوہ تارا بائی نے چوتھ اور سردیش مکھی کے محصول کے سلسلہ میں مغلوں کو کافی پریشان رکھا۔ دکن کی مسلم سلطنتوں کے آخری فرمانرواؤں کے عہد میں ریشہ دوانیاں، سازشیں اور خلفشار راہ پا چکے تھے اور وہ اتنے کمزور ہو چکے تھے کہ اگر عالمگیر بیجاپور اور گولکنڈا کو اپنی قلمرو میں شامل نہ کر لیتا تو مرہٹے ان ریاستوں پر قابض ہو جاتے۔

جنگ و جدال کی وجہ سے تقریباً ہر جگہ نظام حکومت درہم ہو چکا تھا لیکن تجارت کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ سمندر پار کے تاجروں کی وجہ سے تجارت میں ایک توازن قائم رہا جنگوں اور فوجوں کی نقل و حرکت کی وجہ سے زراعت کو بہت نقصان پہنچا۔ کھیتیاں یا تو روندی گئیں یا فوجیوں نے جلا دیں۔ اس وجہ سے کسان بہت ہی بے دلی سے کاشت کرتے تھے۔ اقتصادی حالات بد سے بدتر ہو چکے تھے اور ہر جگہ رشوت ستانی کا بازار گرم تھا۔

اس دور میں گجرات کئی آفتوں سے دوچار رہا۔ ۱۶۸۱ سے ۱۶۹۶ء تک چھ قحط پڑے۔ مرہٹوں کی یورش ایک بلائے ناگہانی ہوتی تھی۔ ۱۶۷۰-۷۱-۷۵-۷۹- ۱۷۰۲ء-۵-۶-۷-۱۲، ۱۷۲۰ میں شیواجی اور شیواجی کے بعد مرہٹہ سرداروں نے سورت کو لوٹا۔ یہ احمد آباد تک دھاوے بولتے تھے۔

اس دور میں گجرات کی صوبیداری قابل لوگوں کے تفویض کی گئی تھی۔ ان میں شجاعت خاں مقبول ترین صوبیدار گذرا ہے۔ اس کا دور صوبیداری ۱۶۸۵ء تا ۱۷۰۱ء تھا۔ جودھپور کی فوجداری بھی اس کے ذمہ تھی۔ اس نے ۱۷۰۱ میں وفات پائی۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ گجراتی میں اس کے نظم و نسق کی تعریف میں گیت لکھے جاتے تھے جو تقاریب کے موقعوں پر ہندو عورتیں گاتی تھیں۔ احمد آباد میں ایک عالی شان مسجد اور مدرسہ اس کی یادگار ہیں۔ اسی جگہ اس کی آخری آرامگاہ ہے۔

جہاں تک علماء وصوفیاء کا تعلق ہے سلاطین گجرات کے عہد کی علمی و ثقافتی روایات اور درس و تدریس کا سلسلہ اس عہد میں بھی پائے جاتے تھے۔ مولانا احمد گردی متوفی ۱۶۷۶ء سید جعفر حسینی رضوی متوفی ۱۶۹۹ء، شیخ جمال الدین چشتی متوفی ۱۶۸۰ء مولانا شیخ نورالدین صدیقی سہروردی متوفی ۱۷۴۲ء سید علی بن سید جلال بن سید محمد رضوی متوفی ۱۶۸۰ء وہ نادر روزگار ہستیاں ہیں جن کے علمی، مذہبی اور روحانی فیض سے بہت فائدہ پہنچا۔ اس دور کے قاضیوں میں قاضی عبدالوہاب اور ان کے بیٹے پوتے خصوصیت رکھتے ہیں۔ عبدالوہاب کے ایک پوتے قاضی اکرم الدین قابل ذکر ہیں۔ انہیں شاہ عالم بادشاہ نے شیخ الاسلام کا خطاب عنایت کیا تھا۔ اکرم الدین نے اپنے استاذ و مرشد علامہ شیخ نورالدین صدیقی کے لیے ایک عالی شان مدرسہ تعمیر کرایا تھا مسجد و ہاسٹیل بھی مدرسہ سے منسلک تھے۔ ولی گجراتی نے اس مدرسہ ''ہدایت بخش'' اور مسجد وغیرہ کی تعریف میں رسالہ نورالمعرفت تصنیف کیا تھا۔ اس دور میں جو مدارس ادائش کدے، درس و تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے ان میں علامہ شاہ وجیہ الدین کا مدرسہ، مدرسہ ہدایت بخش، شجاعت خاں کا مدرسہ، شہر سورت میں حضرت سید محمد بن سید عبداللہ العیدروس کا مدرسہ اور مرجان شامی کی مسجد سے متصل ایک مدرسہ قابل ذکر ہیں۔ اس دور کی تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دور سیاسی نقطۂ نظر سے دور خلفشار و انتشار ہونے کے باوجود گجرات میں علم و عمل کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پایا تھا۔

اس باب میں ولی، اشرف، رضی، نثار، فراقی، راجارام، احمد، احمدی اور صبائی کا تذکرہ پیش کیا جائے گا۔

ولی

ولی اردو ادب کی ان برگزیدہ شخصیتوں میں سے ایک ہے جنہیں قافلۂ ادب کی سالاری کا فخر حاصل ہے۔ اس کی شخصیت جامع کمالات تھی۔ یہ صوفی باصفا عالم باعمل مصلح و مفکر، ادیب و انشا پرداز، مجتہد العصر امام متغزلین اور خالق فن تھا۔ اس کی ادبی خدمات نہایت پہلو دار ہیں۔ اس کی تخلیقات اس کے عہد کی بھی آئینہ دار ہیں۔ اس نے اپنی تخلیقات کے ذریعے سے اپنے عہد کے علمی ادبی، سماجی، مذہبی تقاضوں کو بہ طریق احسن پورا کیا۔

ولی کا نام محمد ولی اللہ اور اس کے والد کا نام شریف محمد ہے۔ یہ علامہ شاہ وجیہ الدین علوی

گجراتی متوفی[1] ۹۹۸ھ سے نسبی تعلق رکھتا ہے۔ اس کا سلسلۂ نصب چھے واسطوں سے علامہ موصوف کے بھائی شاہ نصراللہ تک پہنچتا ہے[2]۔ ولی کے بعض خاندانی دستاویزوں کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۰۶۰ھ/۱۶۴۹ء سے قبل پیدا ہوا ہوگا مگر یہ محض قیاس ہے۔

ولی کے مسئلہ وطنیت پر ایک مدت تک اختلاف رائے رہا۔ اورنگ آباد کے ایک اور شاعر شمس ولی اللہ حسن کو شاہ نعمت اللہ سے نسبی تعلق ہے ولی گجراتی سے خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ شمس ولی اللہ کا کلام انڈیا آفس میں محفوظ ہے[3]۔ تذکرہ نویسوں کے بیانات اور اس کے کلام کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچا جا چکا ہے کہ ولی احمد آباد گجرات کا باشندہ ہے[4]۔

عہد عالمگیر کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور علمی ادبی حالات کی روشنی میں جب ولی کے سوانح حیات کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو یہ اپنے دور کا سچا نمائندہ پایا جاتا ہے۔ اس کے ذہنی ارتقا کے لیے گھر کے اندر اور گھر سے باہر کا ماحول بہت ہی سازگار ثابت ہوا۔ اس کی صوفی منشی اور علمی لیاقت اس دور کی خانقہی تربیت اور علما کی صحبتوں کا نتیجہ تھی۔ گمان غالب ہے کہ اس نے علامہ شاہ وجیہہ الدین اور علامہ نورالدین سہروردی کے مدارس میں تعلیم حاصل کی ہوگی۔ اس کے کلام اور اس کی فارسی تصنیف رسالہ نورالمعرفت سے واضح ہوتا ہے کہ یہ علوم عقلی و نقلی اور فارسی عربی زبان و ادب میں مہارت رکھتا تھا۔ شاعری میں یہ انوری، عرفی، خاقانی، شیرازی وغیرہ سے ہم سری و برتری کا دعوا کرتا ہے۔ اسی طرح یہ اپنے دور کے گجری و دکنی زبان و ادب سے بھی بہ خوبی واقف تھا۔

ولی کے کلام میں اس کے بعض اعزا، احباب و معاصر شعرا اور شاگردوں کے نام ملتے ہیں۔ ولی نے اپنے محبوب کے حسن کو رعایت لفظی کے پردے میں بہت ہی پاکیزہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان میں احمد آباد کے ایک سید زادے سید ابوالمعالی کا سراپا بھی باندھا ہے۔ شمس الدین، کامل، اکمل اس کے اعزا میں سے تھے۔ کلام میں بعض ہندو دوستوں کے بھی نام پائے جاتے ہیں۔ مثلاً گوبند لعل، بھیم داس، امرت لعل، بیر لعل وغیرہ۔ ایک جگہ دِلّی کے صوبے دار محمد یار خاں کا نام بھی ملتا ہے[5]۔ اس کے شاگردوں اشرف، رضی اور معاصرین میں فراقی، آزاد وغیرہ کے نام بھی آئے ہیں۔

---

[1]، [2] بہ حوالہ ولی گجراتی [3] بہ حوالہ اختر جوناگڑھی [4] بہ حوالہ ولی گجراتی، تفصیلات کے لیے ولی گجراتی، دیکھیے۔

[5] دہلی کا صوبے دار ۱۰۸۰ھ تا ۱۱۰۱ھ

تذکرہ گلشن گفتار میں ولی کے سفر دکن کا ذکر ملتا ہے۔ اس نے یقیناً دکن کا سفر کیا ہوگا۔ اس کے خاندان کے بعض افراد بیجاپور اور اورنگ آباد میں سکونت پذیر تھے۔ بیجاپور کے صوفی بزرگ شاہ ہاشم اس کے چچا تھے۔ اس نے دکن کے کئی شہروں کی سیر کی ہوگی جس کا ہمیں علم نہیں ہے۔

تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ اس نے ۱۷۰۰ء (۱۱۱۲ھ) میں یا اس سے قبل دلی کا سفر کیا تھا۔ دلی میں اس کی مدت قیام سے ہم لاعلم ہیں لیکن گمان غالب ہے کہ وہ دلی میں کافی عرصے تک رہا ہوگا کیوں کہ اس کے استاد شاہ گلشن بھی دلی میں سکونت پذیر تھے۔ ولی نے اپنے ایک شعر میں دلی کے صوبے دار محمد یار خاں کے جشن کی تعریف کی ہے۔ یہ غزل اس نے دلی ہی میں کہی ہوگی۔ ولی نے فریضۂ حج بھی ادا کیا تھا۔ اس عہد میں سورت باب المکہ تھا۔ اس لیے جب یہ سورت آیا تو یہ وہاں کے حسن ملیح سے بہت متاثر ہوا اور اس نے شہر سورت پر ایک مختصر مثنوی یادگار چھوڑی ہے اس مثنوی کے آخری شعر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عازم حرمین شریفین تھا۔ اس کا ایک قصیدہ در مدح بیت الحرام بھی اس کے سفر حج کا غماز ہے۔

ولی نے ۱۷۰۷ء (۱۱۱۹ھ) میں بہ تاریخ ۴ شعبان بہ وقت عصر بہ مقام احمد آباد انتقال کیا۔ اس کو اس کے جدی قبرستان میں گنبد شاہی باغ میں دفن کیا گیا ہے۔ اس کی قبر پر چینی کے ٹکڑے جڑے ہوئے ہیں اس لیے یہ چینی پیر کے نام سے مشہور ہے۔ احمد آباد کے مفتی محمد احسن نے قطعہ تاریخ وفات کہا ہے۔

مطلع دیوان عشق سید ارباب دل   والی ملک سخن صاحب عرفان ولی
سال وفاتش خرد از سر الہام گفت   بادشاہ ولی ساقی کوثر علی

۱۱۱۹ھ

ولی نے اپنے عہد کے جیدری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے صنف غزل کو اپنایا اس کے ذہن طبع کا تقاضا بھی یہی تھا۔ ولی کی غیر معمولی صلاحیتوں اور لیاقتوں کو دیکھتے ہوئے یقین کی حد تک قیاس کیا جا سکتا ہے کہ چھوٹی عمر ہی سے شعر کہنا شروع کیا ہوگا اور اس کا شوق و ولولہ ہی ریختہ میں اس کا استاد ہوگا۔ کیوں کہ کسی جگہ اس نے اس امر کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔ شاہ گلشن کو نور المعرفت میں اپنا استاد گردانتا ہے اس لیے گمان غالب ہو کہ فارسی میں شاہ گلشن کے سامنے اس نے زانوے ادب تہ کیے ہوں گے۔ کیوں کہ شاہ صاحب فارسی کے شاعر تھے۔ ان سے ایک ضخیم دیوان بھی یادگار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ولی دلی پہنچا تو شاہ گلشن کے مشورے سے اس نے دلی کے محاورے میں ریختہ

کہنا شروع کیا[1] یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ولی ۱۷۰۰ء (۱۱۱۲ھ) میں دہلی گیا تھا اور ۱۷۰۷ء (۱۱۱۹ھ) میں وفات پائی۔ اس حساب سے سات سال کی مدت ولی نے شعر و سخن کا اتنا ذخیرہ جمع کر دیا ہو ممکن نہیں۔ دہلی میں شاہ موصوف سے ملاقات بھی پہلی ملاقات نہیں ہوگی۔ شاہ صاحب کا احمد آباد سے دیرینہ تعلق تھا۔ ان کے جدِ بزرگوار اسلام خاں گجرات میں سلاطین کے عہد میں وزارت کے عہدے پر فائز تھے۔ اکبر کی فتح گجرات کے بعد موصوف کے اسلاف نے برہان پور میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ شاہ صاحب نے برہان پور کو بھی خیر باد کہا اور دہلی چلے گئے۔ ایک مرتبہ شاہ صاحب بہ غرض سیر و سیاحت احمد آباد آئے تھے اور سیر کے بعد دہلی لوٹ گئے جہاں ۱۱۴۱ھ میں وفات پائی[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب سے استادی شاگردی کا سلسلہ احمد آباد یا برہان پور میں قایم ہوا ہوگا۔

ولی کی شاعری متصوفانہ تصوراتِ حسن و عشق کی آئینہ دار ہے۔ ان تصورات کی مدد سے اس نے مجاز و حقیقت کی باریکیاں بیان کی ہیں۔ اور اس طرح کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کا تماشا دکھلایا ہے۔ اس کے کلام کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کی مادی اور روحانی زندگی حسن و عشق کے محور پر گھومتی رہتی ہے۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا   کیا حقیقی و کیا مجازی کا

اس کا تصورِ غم بھی متصوفانہ انداز لیے ہوئے ہے۔ اس کے ہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں میں ایسی وحدت ہے کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اس نے عاشق و محبوب، رقیب روسیاہ اور زاہد خشک وغیرہ سے علامتوں کا کام لیا اور کش مکش حیات کی گتھیاں سلجھائی ہیں۔ صنائع بدائع میں صنعت ایہام خصوصیت رکھتی ہے۔ اس صنعت کے استعمال میں ولی نے اپنی سلیقہ مندی اور قدرت زبان کا نہایت عمدہ ثبوت پیش کیا ہے۔ ولی سے پہلے کے دور میں یہ صنعت مفقود تھی مگر ولی نے ایک طرف ہندی اور فارسی کے شعراے متاخرین کے رجحان صنعت حسن تعلیل کے پیش نظر اور دوسری جانب تصوف کے زیر اثر اس صنعت کو اپنایا۔ تصوف میں ذو معنین سے بڑا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح رعایت لفظی کو بھی خوش اسلوبی سے برتا ہے۔

قافیہ، ردیف، بحر وغیرہ کا استعمال ولی کے فن و کمال کا ایک خصوصی پہلو ہے۔ اس نے

---

[1] مخزن نکات، تذکرۂ سروِ آزاد

اپنی تخلیقات میں استادانہ کمالِ فن سے موسیقیت و ترنم پیدا کیا ہے۔ خصوصاً چھوٹی بحروں میں اس کی غزلیں بہت ہی جاندار ہیں۔

ولی صوفی گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت متصوفانہ ماحول میں ہوئی۔ اس کے عہد کے تقاضوں نے اس کے صوفیانہ رجحانات کو اور بھی پختہ کر دیا۔ اس کے خانقہی تعلیم و تربیت اور زمانے کی الٹ پھیر نے ولی کو وسعت نظر، بصیرت، فکر اور جمالیاتی احساس دیا۔ اس کے شاعرانہ کرشموں کی بلندی کا راز اس کے اسی فکر و نظر میں مضمر ہے۔

ولی نے اپنے پاکیزہ تصورات کو اس خوبی سے تخلیقات میں سمویا ہے کہ اس کے کلام پر مجاز یا حقیقت کا کوئی ایک لیبل لگانا مشکل ہے۔ اس کی شاعری کا تھوڑا سا حصہ ایسا ضرور ہے جس میں اس نے تصوف کے نکات کو پیش کیا ہے مگر بیشتر حصہ ایسا ہے جہاں مجاز و حقیقت کے دو رویوں کو ایک کر دکھایا ہے۔ لہٰذا ایسے کلام کو جس عینک سے دیکھا جائے ویسا ہی نظر آئے گا۔ اس کمالِ فن سے ولی خود خوب واقف تھا۔ اس نے بعض مقامات پر اسی لیے اپنا مقابلہ حافظ شیراز سے کیا ہے۔

شاعر کی حیثیت سے ولی زبردست فن کار تھا۔ وہ جب اپنے جذبات و واردات کی ترجمانی کرتا ہے تو اس کا طائرِ خیال بہت ہی بلندی پر پرواز کرتا ہے اور شرح جذبات و خیالات کے سلسلے میں موزوں تشبیہ استعارہ، رمز و کنایہ وغیرہ کو لفظ و صوت کی ہم آہنگی کے ساتھ جس طریقے پر کام میں لیتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ اس کا طرزِ ادا نہایت سلیس و سادہ ہے۔ مشکل سے مشکل خیالات کو بھی پیش کرتا ہے تو کہیں گنجلک پیدا نہیں پائی جاتی۔ اس کے طرزِ ادا کے انوکھے پن میں ولی کے لسانی اجتہاد کو بھی بڑا دخل ہے۔ اس نے اپنے مافی الضمیر کو پیش کرنے کے لیے اچھوتی ترکیبیں بنائی ہیں۔

شاعری میں ولی کا خاص میدان صنفِ غزل ہے لیکن اس نے دوسرے اصنافِ سخن میں بھی آزمائی کی ہے۔ اس کے قصیدے حمد و نعت و منقبت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک مثنوی کے علاوہ مستزاد، مخمسات، ترجیع بند، قطعہ، رباعی میں بھی کلام ملتا ہے۔ ولی کی فارسی تصنیف رسالہ نور المعرفت فارسی انشا پردازی کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس رسالے میں ولی نے مدرسہ ہدایت بخش اور علامہ نورالدین صدیقی سہروردی کی تعریف بیان کی ہے۔

ولی نے فکر و فن یا کی ہم آہنگی سے ایسا نمونہ پیش کیا کہ جنوب و شمال میں غزل کا آہنگ

مقبول خاص و عام ہوا۔ اور اُردو شاعری اور خصوصاً اُردو غزل کا چرچا عام ہوگیا۔ گجرات میں اشرف، رضی، تنا، فراقی، صبا وغیرہ دکن میں داؤد، سراج وغیرہ اور شمال میں آبرو، حاتم، فائز، شاکر، مضمون وغیرہ ایسے متغزلین پیدا ہوئے جنھوں نے قافلہ غزل کی ہدی خوانی کی۔

اشرف

محمد اشرف نام اور اشرف تخلص تھا۔ اشرف کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں گلشن گفتار میں اس کا ذکر صرف اس قدر ملتا ہے۔

"محمد اشرف اشرف تخلص گجراتی بلاواسطہ شاگرد ولی محمد طبع رنگین داشت شعرش در نواح گجرات شہرت دارد و دیوان لطیف تصنیف نمودہ۔"

اس کے نام کے متعلق اشرف کے دیوان میں ایک شعر اس طرح پایا جاتا ہے۔

نام میرا ہے اس سبب اشرف — مشت از خاک پائے احمد ہوں

وطن کے متعلق بھی کوئی سراغ نہیں لگتا۔ لیکن چند شواہد سے ہمیں ماننا ہوگا کہ اشرف گجرات کا شاعر تھا۔ سب سے بڑی شہادت تو صاحب گلشن گفتار کا بیان ہے، دوسرے اس کے دیوان میں ایک شعر ملتا ہے۔

ملک گجرات میں حبیب اللہ — تیری فرقت نے ہم کو مارے ہیں

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اشرف کو گجرات سے لگاؤ تھا، تیسرے اس کے دیوان میں "اشرف الموسوی مدنی شاہی" لکھا ہوا ملتا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اشرف یا تو شاہ عالم گجراتی کے خاندان سے ہو یا اس خاندان میں مرید ہو۔ کیوں کہ شاہ عالم کے خاندان کے افراد نیز مرید شاہی کہلاتے ہیں اور قطب عالم کے مرید قطبی کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اشرف کی غزلوں کا ایک دیوان پایا جاتا ہے اس کا ایک نسخہ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس میں قریب دو سو غزلیں ہیں۔ اشرف کے کلام کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ ولی کے دور کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ کلام بالکل ولی کا تتبع معلوم ہوتا ہے۔ ولی کی طرح اشرف نے بھی اپنے دوست احباب کا ذکر جا بہ جا کیا ہے۔ دیوان میں دو غزلیں امیر الدین کے

لہ ولی کی شاعری کی تفصیلات کے لیے "ولی گجراتی" مندرجہ ذیل دیکھیے۔

نام ہیں:

وصف تیرے میں بولے ہیں   شاعران دکن امیر الدین
عاشق پاک ہے تیرا اشرف   اس سوں مت مکھ چھوپا امیر الدین

ایک غزل اسی طرح کسی دوست انبائی داس کے نام لکھی ہے۔ ایک شعر میں رضی کا اس طرح ذکر کیا ہے:

اس مصرعۂ رضی کا اشرف ہے دل سے بھوکا   ہے غم ہمارے غم کوں کھاتا نہیں سبب کیا

ولی کی طرح اشرف نے بھی لفظ "نکو" کو دو غزلوں میں ردیف قرار دیا ہے۔ دیوان میں جابجا تعلّی کے اشعار بھی ملتے ہیں اور ان سے صاف مترشح ہے کہ اشرف اپنے کلام کو ولی کے کلام سے کسی طرح کم نہیں سمجھتا تھا۔

ولی کے طور پر مجسا نہیں کوئی ریختہ بولیا   سخن ہے مبتذل جگ میں زبان اصفہانی کا
ہے جب سوں شعر تیرا ولی سوں ہم رنگ   اشرف تیرے سخن کی نت آرزو ہے دل میں
شعر ہندی بیچ اشرف کا سخن ہے بے نظیر   آج وہ اوستاد ہر ایک اوستاد ہند ہے
شعر کہنے میں ہے اشرف کوں ولی کا مرتبہ   اس سبب شاعراں نہیں صدق سوں مرید

اشرف نے مرثیہ اور مثنوی کے میدانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اڈنبرا یونی ورسٹی لائبریری میں اشرف کے تیرہ[13] مرثیوں کا ایک مجموعہ ہے جس میں ایک سو چالیس[140] اشعار ہیں[1]۔ اشرف کے مرثیے معلوم ہوتا ہے پسند کیے جاتے تھے خود لکھتا ہے۔

لکھیا ہوں بے بدل یو مرثیہ جب سوں اماموں کا   ہوا مشتاق ہر ایک شاعر ملک دکن میرا

برٹش میوزیم میں اشرف کی ایک مثنوی "جنگ نامہ" بھی پائی جاتی ہے اس کا سن تصنیف ۱۴۷۱ء (۱۱۲۵ھ) ہے یہ کسی فارسی تصنیف کا ترجمہ ہے جس کا ذکر خود مصنف نے ورق ۳ پر کیا ہے۔ شاعر نے سن کے ساتھ اپنا نام بھی لکھا ہے۔ اشرف کے جنگ نامہ کا ایک ناقص نسخہ سید نجیب اشرف ندوی صاحب کے کتب خانے میں بھی ہے۔

رضی

محمد رضی نام رضی تخلص تھا۔ اس کے وطن کے متعلق صاحب ب شعار کا بیان ہے کہ یہ احمد آباد کا رہنے والا تھا۔ حدیقۂ احمدی میں صرف یہ عبارت پائی جاتی ہے "یکی از شعرائے گجرات بود"

---

[1] رسالہ اُردو ۱۹۳۵ء مضمون از ڈاکٹر زور، یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۳۷۹

اُردو شہ پارے میں مرقوم ہے کہ غالباً یہ گجرات کا شاعر تھا۔

گلشن گفتار میں اس کا نام محمد رضی لکھا ہے۔ حدیقۂ احمدی میں صرف رضی لکھا ہے۔ ہاشم علی نے ایک جگہ حافظ رضی لکھا ہے۔

رضی ولی کا ہم عصر نیز شاگرد تھا۔ اس کے تلمذ کے متعلق ہمیں گلشن گفتار کے سوا اور کوئی شہادت نہیں ملتی جناب نصیر الدین ہاشمی کا خیال ہے کہ رضی ولی کا شاگرد نہیں تھا لیکن ہاشمی صاحب نے اس کی تردید میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ بہرحال ہم صاحب گلشن گفتار کے بیان کے مطابق رضی کو ولی کا شاگرد قرار دیتے ہیں۔

رضی ولی کا ہم عصر تھا یہ یقینی ہے۔ ولی، رضی اور اشرف کی ہم طرح غزلیں دیکھ کر شخص سید محمد ایم اے مرتب گلشن گفتار کے بیان سے اتفاق کرے گا کہ ہم طرح غزلیں کسی مشاعرے میں پڑھی گئی تھیں یا اشرف اور رضی نے اپنے استاد کی تقلید میں اسی زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ دوسرے ولی اشرف اور رضی کا ایک دوسرے کے مصرعے کو تضمین کرنا بھی یہ بتاتا ہے کہ یہ تینوں ہم عصر تھے۔

رضی کا تو کوئی ایسا شعر نہیں ملتا لیکن اشرف کا ایک شعر ہے۔

اس مصرعۂ رضی کا اشرف ہر دل کسو کا   بے غم ہمارے غم کوں کہا آتا نہیں سبب کیا

رضی نے مرثیے بھی کہے ہیں[1] اس کے نو مرثیے اڈنبرا کے کتب خانے میں ہیں۔ ان مرثیوں کے کل اشعار تیاسی ہیں ڈاکٹر سید محی الدین زور کا خیال ہے کہ رضی کے مرثیوں میں غزلیت پائی جاتی ہے۔ گجرات کے مرثیہ گو شاعر ہاشم علی نے بھی ایک مرثیے میں حافظ رضی کا ذکر کیا ہے[2] سید محمد ایم اے مرتب گلشن گفتار نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ مذکورہ مجموعہ مراثی میں یہی رضی اور اشرف (معاصرین ولی) کے مرثیے ہیں۔ اس کی کوئی تاریخی شہادت نہیں۔ یہ قیاس درست ہے لیکن چوں کہ دکن میں مرثیوں کی زیادہ مانگ تھی اور مرثیہ گو بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اس لئے ممکن ہے رضی اور اشرف نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہو۔

ہاشم علی کا اپنے مرثیے میں رضی کا ذکر کرنا اسی خیال کی تائید کرتا ہے۔ راقم کے کتب خانے میں ایک بیاض میں رضی کا ایک مرثیہ پایا جاتا ہے۔ یہ مرثیہ نمونہ کلام میں درج کیا گیا ہے۔

---

[1] رسالہ اُردو ۱۹۳۵ء مضمون از سید محی الدین زور، یورپ میں دکھنی مخطوطات ص ۹۳۶

[2] اُردو شہ پارے

ثنا

شیخ ثناء اللہ احمد آباد کے شیخ زادوں میں سے تھا۔ ثنا تخلص تھا۔ ولی کا شاگرد تھا۔ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں ثنا کے ہاتھ کا دیوان ولی کا نسخہ محفوظ ہے۔ نسخے کی کتابت ۱۱۴۸ھ ہے [1]

کسب فیض باطنی مولانا محمد نور الدین صدیقی سہروردی سے کیا تھا، جو ولی کے بھی استاد تھے۔ محمد شاہ کے زمانے میں کسی ہنگامے میں زخمی ہوا اور جام شہادت پیا۔

افسوس کہ صاحب مخزن شعرا نے اس کا کلام اصلی حالت میں نہیں دیا ہے قدیم محاوروں کو متروک سمجھ کر تبدیل کر دیا گیا ہے۔

صادق فراقی

نام صادق تھا اور تخلص فراقی۔ حدیقۂ احمدی میں مرقوم ہے کہ یہ احمد آباد کے مشہور شاعروں میں سے تھا۔ فراقی قصیدہ گو اور ریختہ گو شاعر تھا، صاحب دیوان گزرا ہے۔ راقم کو اپنے کتب خانے کی ایک بیاض میں اس کا یہ شعر ملا ہے جو اس کے گجراتی ہونے کی مزید شہادت ہے۔

گجرات نگر میں یا رب توں مجکوں لیجا کر — کریو تو فنا مجکوں محمد کی گلی میں
مقصود فراقی کا دو عالم میں یہی ہے — لے جاوے خدا مجکوں محمد کی گلی میں

فراقی ولی کا ہم عصر تھا۔ میر حسن کا بیان ہے "فراقی تخلص از مردم دکن بود ہمراہ فقیر اللہ آزاد بہ ہند آمدہ" اور میر تقی کے بیان کے مطابق فقیر اللہ آزاد ولی کا ہم عصر تھا۔ لہٰذا فراقی ولی کا ہم عصر تھا، نیز فراقی ولی کا حریف بھی تھا۔ ولی نے ایک شعر کہا ہے:

تیرے اشعار ایسے نہیں فراقی — کہ جس پر رشک آوے گا ولی کوں

فراقی کا تھوڑا کلام پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی صاحب اور راقم کے کتب خانوں میں موجود ہے۔ دکن میں اردو میں ایک شعر ہے۔

نظر ہے علم منطق ہور علم معانی میں فراقی کوں — اگر علم حدیث مصطفیٰ ہوتا تو کیا ہوتا

---

[1] نصیر الدین ہاشمی

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو علم معانی اور منطق میں کمال حاصل تھا۔

مخزن نکات نے یہ ایک شعر یاد ہے۔

فراقی کشتہ ہوں اس آن کا جس دم کہ وہ ظالم
کرے کھینچتا خنجر چڑھاتا آستیں آوے

راجارام

عرصۂ دراز سے بزرگوں کی زبانی سنا کرتا تھا کہ آج سے دو ڈھائی سو سال پہلے سورت میں راجارام اور بینی پرشاد دو ہندو ریختہ گو شاعر گزرے ہیں جن کا کلام نایاب ہے۔ راجارام کے لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مخفی طور پر مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا۔ لیکن یہ راز زیادہ مدت تک پوشیدہ نہ رہ سکا اور جب راجارام کا انتقال ہو گیا تو اس کے مسلمان دوستوں نے تجہیز و تکفین کے بعد خواجہ سید جمال الدین قدس سرہ کی خانقاہ میں دفن کیا۔ مجھے اس کی صداقت میں شبہ ہوتا تھا اور میں اس کو راویوں کے جذبۂ مذہب و ملت کا ادبی کرشمہ اور خوش عقیدگی کا نمونہ تصور کیا کرتا تھا۔ لیکن ہمیشہ اس کی کھوج میں لگا رہا۔ کیوں کہ مجھے شاعر اور اس کے کلام سے مطلب تھا نہ کہ اس کے مذہب سے۔

ایک روز سورت کے ایک قدیم کتب خانے میں سورت کے ایک ان پڑھ شاعر کا کلام ڈھونڈ رہا تھا کہ قضارا چند اوراق پریشان ہاتھ لگ گئے۔ ان اوراق کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو مسرت کی انتہا نہ رہی کیوں کہ یہ شاعر گم نام راجا کا مجموعۂ کلام تھا۔ نسخۂ ہذا راجارام کے کلام کا مختصر مجموعہ ہے اس میں صرف پچیس۲۵ غزلیں ردیف وار ہیں۔ باب الرائے تک کتاب میں صفحے غائب ہیں۔ درمیان میں سے بھی چند اوراق گم ہیں اور آخر میں بھی نون کی ردیف تک غزلیں موجود ہیں۔ اسی کے ساتھ علاحدہ ایک ترجیع بند ہے جس میں سات بند ہیں۔ یہ مکمل ہے۔ ہر غزل سات یا نو شعر سے زیادہ کی نہیں ہے مجموعہ اصل کی نقل معلوم ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا تھا بلکہ ہر جگہ اپنا پورا نام راجارام تخلص کے طور پر استعمال کیا ہے۔ کہیں کہیں صرف راجا بھی پایا جاتا ہے۔ راجارام کے متعلق تذکروں میں کسی قسم کا ذکر میری نظر سے نہیں گزرا۔ لہٰذا اس کے متعلق ہماری معلومات کا ذریعہ صرف چند اوراق پریشان ہیں۔ اس کے وطن کے متعلق کلام سے کوئی پتا نہیں چلتا۔ لہٰذا جب تک راجارام کے متعلق دوسری تحقیقات نہ ہوں ہم

جگنوں کی رواتی روایات پر اعتبار کرتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ راجا رام کا وطن سورت گجرات تھا
اس کے کلام سے یہ قدرے واضح ہوتا ہے کہ یہ ولی کے دور کا شاعر ہونا چاہیے۔ کلام میں ولی کے دور کے
مروج الفاظ و محاورے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جیسے سجن، تجھ سری، ہور، اور، دستا، دکھا
سیتی، سے، کوں، کو، کنے، پاس، چرن، پاؤں۔ پون، ہوا، سیس، سر، نَک، ادا، انجو، آنسو
اتھا، بلہار، قربان، جلوہ، درس، گگن، آسمان، اینچا، کھینچا، پھاندا، پھندا، چک، نین، سرجن،
درس، موہن، پیٹ وغیرہ

نین نستے ہیں اوس کے سبز خط میں — کہ جوں سبزی میں دستے ہیں ہرن سبز
تصور بیچ اوس رشک چمن کے — مجھے دستا۔۔۔ زمین تا گگن سبز
جب ستی راجا سجن مجھ کوں دکھایا ہے درس — ہفت فلک کے اوپر۔۔۔ تب سیں ہیں ہیرا و ملغ
ہوا ہے سبز اب باغ محبت — میرے انجو کے پانی کی تری سوں
وہ اپنے محبت کے پھاندے میں اینچ — میرے دل کا کچھ نہیں گر گیا ہے نرکار

تذکیر و تانیث میں بھی ولی کے دور کی مطابقت کرتا ہے:

دیکھ کر شمع رو کا آرائش — آتش عشق کوں ہے افزائش
جب مجالس میں ماہ رو دوے — شمع کا واں نہیں ہے گنجائش

لفظ ساکن کو متحرک بنا دینا:

جوش حیا کا مکھ پہ ترے دیکھ کر عرق — شبنم میں گل خجل ہوا سراپا ہوا غرق

فارسی ترکیبیں:

شاخ گل ہو کے خمتی ہیں نجان اے بوالہوس — تو عروسی بلبلوں کے تیس کھاتی ہے بہار
سخن دریائے وحدت کا ہے گوہر — سخن میرے سخن کوں رکھ درگوش
پڑے کیوں کل مجھے پٹو کے بغیر از — کیا ہے عشق اوس کا دل کوں بے کل

بعض جگہ انتظار سے انتظاری، غرور سے غروری، خمار سے خماری، خم سے خمنا یعنی جھکنا بنا لیا ہے
دو چار جگہ اضافت کو ہندی الفاظ کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ جیسے

گزر گلشن میں اے گل پیرہن کر — ہر اک گل پر ترا نقش چرن ہے
گزر اک دن کیا سو اوس کی بزم میں — ہوا تب ستی رنگ پون سبز

راجا رام کے کلام میں مناسبت لفظی تشبیہ و استعارہ بھی ولی کے دور کے طرز پر پائے جاتے

ہیں۔ اس کی مثالیں تبصرے میں دے چکے ہیں۔

راجا رام کی علمی قابلیت کے متعلق اس کے کلام کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ عربی فارسی کا زیادہ نہیں تو معمولی علم اسے ضرور تھا۔ ورنہ ایک ناواقف کے لیے تجنیس، تلبیس، بلقیس، قصاص اختصاص، تفحص وغیرہ کا باندھنا مشکل ہے۔ ایک جگہ ایک حدیث کا بھی حوالہ پایا جاتا ہے۔

قول جو اول کیا ہے یار یاری کوں تباہ   الکذب پھلک ہر حدیث ہم کر کیوں ہوتا ہے لاغ

راجا رام کا مسلمان ہونا بھی اس کے کلام سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ شاعر خود اپنے کلام میں صہبائے معرفت سے سرشار، رسول کا عاشق زار، آل رسول پر دل و جان سے نثار ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ جس کے دیکھنے کے بعد زبانی روایتوں کی صداقت میں بھی بالکل شبہ باقی نہیں رہتا لکھتا ہے:

حسن ہے یار کوں خدا کا فیض   عشق ہے مج کوں مصطفےٰ کا فیض

مجھے کیا خوف راجا عاقبت کا   محمد کے وسیلہ کوں لیا ہوں

حشر کا غم نہ کر توں راجا رام   شافع حشر ہے نبیؐ کی آل

اے راجا رام مت کر راز کو فاش   ہے بے شک بہشتی مرد خاموش

ایک جگہ لکھا ہے:

اے گل نوبہار احدیت   حسن تیرا رنگیں دیکھا مجھ کوں

عشق میں گل بدن کے راجا رام   عندلیب ریاض وحدت ہوں

اگر تجھ کوں ملے مرشد خاص   خدا اور مصطفےٰ بس مت جدا کر

اے راجا رام کر ترک دوئی کوں   تو دین مصطفےٰ کوں رہنما کر

معلوم ہوتا ہے راجا رام نے شاعری کو بہ حیثیت فن اختیار نہیں کیا تھا اس نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے نظم کو ذریعہ بنایا تھا۔ راجا رام فنا فی اللہ ہو چکا تھا۔ اور اس کو ہر شے میں ذات حق کا جلوہ نظر آتا تھا۔

نیں ہے آدم نہ خلق نا ابلیس   نیں سلیماں ہے اور نہ بلقیس

سب میں ہے آپ بھیس بدلا کر   دیکھ عارف توں یار کا تلبیس

اے راجا رام سے مخفی رہا نیں ہر سجن ہرگز   اسے ہر شے میں دستا ہے آئینہ اظہار ساعظ

خودی کو مٹا کر خدا کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اول عارف توں ہستی کوں مٹا کر   تصور دل اوپر نقش بقا کر

کہاں ہے غیر جو کہنا اوسے غیر — خیال غیر سے دل کوں صفا کر
بغیر اوس کے ہر اک شے کو توں مت دیکھ — خودی کوں چھوڑ دے حاصل خدا کر
فیض سے ماہ رو کے میں پر نور ہوں — یاد سے اوس کی سدا معمور ہوں
یار مجھ میں ہے محیط ہو کر نہاں — میں سمجھتا ہوں کہ اب تک دور ہوں
راز انا الحق حسن کا پایا سوں میں — چڑھ کے سولی عشق کی منصور ہوں
درحقیقت دیکھ راجا رام میں — گوہر اسرار کا گنجور ہوں

چند مقطعوں میں تعلی پائی جاتی ہے، لیکن یہ ریختہ گوئی پر فخر نہیں ہے۔ بلکہ اپنے کلام میں معرفت و حقیقت ہونے پر راجا رام نازاں ہے۔

عام کیا پہنچیں گے راجا رام تیرے شعر کوں — مرحبا بولیں گے تیرے شعر تئیں سن کے خاص
مرے دُرِ سخن کی قدر راجا — ہے بازار براہ کے جوہری کوں
گرچہ پاوے مغز یا راجا رام تیرے شعر کا — عارفاں بولیں گے سن کر ہے عبث لوح و حرف
طفل مکتب کیا سمجھتے ہیں اے راجا مغز خاص — شعر تیرا جانتا کوئی صاحب عرفان کوں

احمد

محمد احمد نام اور احمد تخلص تھا۔ احمد تخلص کے شاعر مختلف ادوار میں متعدد ہوئے ہیں۔ احمد ہم تخلص ہونے کے باعث تذکرہ نگاروں کو بہت مغالطہ ہوا ہے۔ اس وجہ سے حالات خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اس احمد گجراتی کے متعلق صاحب حدیقۂ احمدی کا واضح بیان ہے کہ محمد احمد گجراتی معاصر ولی بودہ اور ایک شعر بھی بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے، وہ یہ ہے:

بتا تو کیا کروں اب راہ عشق میں احمد — سر پہ تو سانجھ پڑ گئی پاؤں تھک گئے

مخزن نکات میں تین شعر دیے ہیں وہ ہم نے نمونۂ کلام میں لکھ دیے ہیں

میر حسن اور قائم نے بھی احمد گجراتی ہی لکھا ہے۔ مخزن نکات میں یہ عبارت ہے۔

"احمد گجراتی شعر ہندی گفت کہ عبارتے از گیت و دوہرہ باشد و در علم سنسکرت و بھاکا ید طولیٰ داشت و در فن خود سر آمد روزگار بود والحق کہ دو سہ دوہرہ از تصنیفش شنیدہ شدہ ذوق کلامش بسیار دلنشین است چوں معاصر شاہ ولی اللہ بود گاہ گاہے فکر شعر در ریختہ نیز می نمود۔
لیکن دکن میں اردو اور اردو شہ پارے میں احمد برہان پوری اور اس کا نام شیخ اللہ لکھا

ہے۔ یہ احمد گجراتی کے علاوہ ہے۔ جناب سید مطیع اللہ راشد برہان پوری کے کتب خانے میں مقیم اللہ برہان پوری کا متفرق کلام موجود ہے لیکن اس میں یتیم اللہ ہی تخلص ہے۔ مثلاً

تجھ ہجر کا غم کیا ہے آنکھوں ستی انجھواں بہے اور یتیم اللہ کہے لے ماہ رمضاں الوداع

احمدی

احمدی تخلص تھا، نام معلوم نہیں۔ لالہ لچھمی نراین شفیق متوفی ۱۲۱۵ھ نے تذکرہ چمنستان شعرا ۱۱۷۵ھ میں احمدی کے ذکر میں یہ لکھا ہے "شاعر عالی مقام و معنی پرور قدیم الایام است سخن را بطرز قدیم گفتہ و گوہر ہستی او را جوئی نقد یر در رشتۂ گجرات سفتہ است ایں بیت طبع زاد ش میر تقی میر می نویسد"

رہے نادر خیالاں میں سطے شوریدہ حالاں ہیں ہوئے صاحب کمالاں میں کدھر آ کر کدھر نکلے

میر نے پوری غزل دی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے نکات الشعرا میں صفحہ ۹۷ پر فٹ نوٹ دیا ہے کہ "میر اور شفیق نے احمدی لکھا ہے، لیکن قائم، شوق اور حسن نے احمد گجراتی لکھا ہے۔ احمد صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کاتب نے اضافت کے بجائے ی لکھ دی ہے۔

صبائی احمد آبادی

میر صاحب نے نکات الشعرا میں صرف صبائی احمد آبادی لکھ کر ایک شعر دے دیا ہے۔ اس کا ذکر کسی اور تذکرے میں نہیں ملتا۔

کلام :

زر سے ہے آشنائی زر سے ملے ہے بھائی زر نہیں ہے تو جدائی دنیا جو ہے سو زر ہے[1]

نمونہ کلام

ولی

سجن تجھ بن ہمیں گلشن کوں گلشن کر نہیں گنتے بہ جز تیرے یہ روشن کوں روشن کر نہیں گنتے

---

[1] نکات الشعرا ص ۹۹

سکندر کیوں نہ جاوے بحرِ حیرت میں کہ مشتاقاں — تمہارے مکھ اگے درپن کوں درپن کر نہیں گنتے
نہیں تیرے رقیباں سوں عداوت دلبراں ہمنا کے — مروت دوستاں دشمن کوں دشمن کر نہیں گنتے
اگر انجھواں کے گوہر سوں مکمل نیں ہوا دامن — محبت مشرب اس دامن کوں دامن کر نہیں گنتے
ولی دل میں ہمارے حاسداں کا خوف نہیں ہرگز — بجز دزدی کسی رہزن کو رہزن کر نہیں گنتے

ہوا ہے سیر کا مشتاق بے تابی سوں من میرا — چمن میں آج آیا ہے مگر گل پیرہن میرا
پیے کے دل کی تجلی کیوں رہے پوشیدہ مجلس میں — ضعیفی سوں ہوا ہے پردۂ فانوس تن میرا
نہیں ہے شوق مجھکوں باغ کی گل گشت کا ہرگز — ہوا ہے جلوہ گر داغاں سوں سینے کا چمن میرا
ہوا ہوں تجھ جدائی کے دکھوں اے نورِ عین یوں — برنگِ مردمک انکھیا کا پردہ ہے کفن میرا
لگے پھیکی نظر میں اے ولی وو کان حلوائی — اگر ہو جلوہ گر بازار میں شیریں بچن میرا

تجھ غمزۂ خوں ریز سوں لڑ کون سکے گا — تجھ نازِ ستم گر سوں جھگڑ کون سکے گا
تجھ حسن کے بازار میں دیوانۂ دل کوں — بن زلف کی زنجیر جکڑ کون سکے گا
پھرتی ہیں سیہ مست ہو شمشیرِ نظر لے — بن نیند اس انکھیاں کو پکڑ کون سکے گا
ہیں خضر کے چشمے سوں ترے لب لبالب — بن سبزۂ خط اس کوں انپڑ[1] کون سکے گا
تجھ زلف کا بستار لکھا آج ولی نے — اس سحر کے طور مار کوں[2] پڑ کون سکے گا

فدائے دلبرِ رنگیں ادا ہوں — شہیدِ شاہدِ گل گوں قبا ہوں
ہر اک مہ رو کے ملنے کا نہیں ذوق — سخن کے آشنا کا آشنا ہوں
کیا ہوں ترک نرگس کا تماشا — طلب گارِ نگاہِ باحیا ہوں
قدم پر اس کے رکھتا ہوں سدا سر — ولی ہم مشربِ رنگِ حنا ہوں

نہ بوجھو خود بخود دل بے خبر ہے — نگہ میں اس پری رو کی اثر ہے

---

[1] انپڑنا حاصل کرنا [2] پڑ = پڑھ

مروت ترک مت کر اے پری رو
محبت میں مروت معتبر ہے
ترے قد کے تماشے کا ہوں طالب
کہ راہ راست بازی بے خطر ہے
بیان اہل معنی ہے مطول
اگرچہ حسب ظاہر مختصر ہے
ولی مجھ رنگ کوں دیکھے نظر بھر
اگر وو دلربا مشتاق زر ہے

جلوہ گر جب سوں وو جمال ہوا
نور خورشید پائمال ہوا
فیض تشبیہ قد دلبر سوں
سرو گلشن میں نہال ہوا
دیکھ کر تجھ نگاہ کی شوخی
ہوش عاشق رم غزال ہوا
ہوں[له] مجنوں کے بعد مجھکوں ولی
صوبۂ عاشقی بحال ہوا

صنم کے لعل پر وقت تکلم
رنگ یاقوت ہے موج تبسم
سجن مکتب میں جب آیا ہر اک کوں
ہوا ہے شوق تعلیم و تعلم
سمجھ کر بات کر اے مرد ناصح
نصیحت عاشقاں کو، ہے تحکم
ملامت کر تجھے ادا کی قسم
بے تکلف ہوں خدا کی قسم
زلف و رخ ہے ترا جو لیل و نہار
مجھ کوں واللیل والضحیٰ کی قسم
سرو قد کوں کشیدہ قامت یار
راست بولیا ہوں تجھ ادا کی قسم
مصحف رخ ترا ہے صورت فجر
مجھ کوں والنجم اذا ہویٰ کی قسم
ظلم مت کر سجن! ولی اوپر
تجھ کوں ہے شاہ کربلا کی قسم

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے
کیونکہ حاصل ہوں مجھ کوں جمعیت
زلف تیری قرار کھوتی ہے
ہر سحر شوخ کی نگہ کی شراب
مجھ انکھاں کا خمار کھوتی ہے
کیوں کر ملنا صنم کا ترک کروں
دلبری اختیار کھوتی ہے
اے ولی آب اس پری رو کی
مجھ سنے کا غبار کھوتی ہے

[له] ہوں۔ع۔زیل

خوب رو، خوب کام کرتے ہیں　　یک نگہ میں غلام کرتے ہیں
دیکھ خوباں کوں وقت ملنے کے　　کس ادا سوں سلام کرتے ہیں
کیا وفادار ہیں کہ ملنے میں　　دل سوں سب رام رام کرتے ہیں
کھولتے ہیں جب اپنی زلفاں کوں　　صبح عاشق کوں شام کرتے ہیں

....

اے سکندر نہ ڈھونڈ آبِ حیات　　چشمۂ خضر خوش بیانی ہے

.....

اولاً ریحان و آخر لالہ رنگ　　ظاہرا برگِ حنا شمشیر ہے

....

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا　　شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا

......

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی　　دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

......

آسماں اوپر نہ بوجھو چادرِ ابرِ سفید　　جا نماز زاہدِ عزلت نشیں برباد ہے

......

خوبی سوں تجھ حضور شمع دم زنی میں ہے　　اس بے حیا کی چرب زبانی کوں دیکھ توں

......

اپس گھر میں رقیباں کوں نہ دے بار　　چمن میں کام کیا ہے خار و خس کا

......

نہ بوجھو خود بخود موہن میں آڑ ہے　　رقیب روسیہ فتنے کی جڑ ہے

......

ولی اس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی　　مرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے

.....

موجِ بے تابیِ دل اشک میں ہوئی جلوہ نما　　جب بسی زلفِ صنم طبعِ پریشان میں آ

......

دل کوں فرحت بخش ہو دائم ترے غم کا ہجوم　　صاحب ہمت کوں نت ہے کثرت عیال لذیذ

......

ہے حقیقت گرم جوشی دل میں نئیں کرتی اثر　　شمع روشن کیونکہ ہووے شعلۂ تصویر سوں

اشرف

کلام

خاطر اشرف اگر منظور ہے　　غیر سوں مت مل توں اے نور نظر
اشرف محتاج آیا تجھ نزدیک　　دست گیر تو آیا بوجھ کر (؟)
الحفیظ الحفیظ کہتا ہوں　　چھوٹنے دیکھ تجھ نگاہ کے تیر
بسکہ رکھتا ہوں خیال کاکل پر پیچ یار　　دل میرا ہے بستۂ دام پریشانی ہنوز
غبار زنگ کلفت ہے نصیب صاحب جوہر　　نہیں ہو زنگ سوں کچھ باک ہرگز تیغ چوبیں کو
سمجھتا نئیں وہ طفل شوخ بے پروا کسی بہانوں　　ہٹیلا ہے چھند یلا رند ہے اور لاؤ بالی ہے

اری اے سنگ دل کیوں دل سی یاری توڑ بیٹھی ہے　　ہمارے شیشۂ دل کوں جفا سوں پھوڑ بیٹھی ہے
مجھے مشتاق اپنا بوجھ کر وہ چھند بھری چنچل　　اپس کے مکھ اوپر آنچل ادا سوں اوڑھ بیٹھی ہے
حقیقت میں توجہ کی نظر ہے مجھ اوپر اس کی　　اپس کے مکھ کوں ظاہر میں اگرچہ موڑ بیٹھی ہے

دل کوں اس ماہ بن ہر بے تابی　　وحشت آتش ہے سیر مہتابی
آب دیکھا اس کی تیغ ابرو کا　　دم شمشیر کوں ہے بے آبی

کہاں ہے وہ ولی والی حیدر حسن میرا　　کہاں ہے وہ حسین ابن علی صفدر شکن میرا
اگن سوں ماتم شہ کے جلا ہے تن بدن میرا　　برنگ برق خرمن سوز دل ہے ہر سخن میرا
لگا ہے بسکہ تیرا ماتم شہ دل منے کاری　　شہید کربلا کے غم ہوا ہے جگ میں من میرا

تری انکھیاں کی جن نے اے پری جادو گری دیکھا　　حقیقت میں ان نے ساحری کی ساحری دیکھا

دیکھا ہے شیشۂ دل میں اس کے بند کر تجھ کوں — نظر بھر جن نے تیرا جلوہ اے رشک پری دیکھا
ہوئے دل بستگی کیوں حلقۂ زلف پری رو سوں — گرا کئی اس نگینے کے یہی انگشتری دیکھا
نہیں بوجھا ہے عالم میں میرے جوہر کی کوئی قیمت — مگر اے دُرِ بحرِ حسن تجھ کوں جوہری دیکھا
کیا تجھ درس میں تحصیل علم عاشقی اشرف — اگرچہ حاشیہ کوں خط کے تیرے سرسری دیکھا

ہے چار موج بحر خطر بسکہ جوش میں — گرداب وار خانہ نگہدار چشم ہوں
ازبسکہ اس کی یاد میں روتا ہوں زار زار — جوں اشک شمع شبنم گلزار چشم ہوں
مجھ کوں نہیں ہے نشا دیگر کی آرزو — مست شراب ساغر سرشار چشم ہوں
بر میں میرے ہے وہ گل رنگیں بہار آج — اس واسطے رقیب کا میں خار چشم ہوں
مطلب زباں رمز سوں کرتا ہے سب ادا — اے بے خبر میں واقف گفتار چشم ہوں
دل خفتگاں نظر میں لاتے نہیں مجھے — موج طلوع اختر بیدار چشم ہوں

ریختہ بے نقطہ

وہ دل آرام آکے رام ہوا — اللہ اللہ ہمارا کام ہوا
طرۂ مہر ماہ رو ہر دم — دل ہی اہل دل کا دام ہوا
گوہر مدعا ہوا حاصل — ہر گہ آکر وہ ہم کلام ہوا
دل ہمارا ہو محو درد امام — عالم درد کا امام ہوا
اسم اللہ و احمد مرسل — ورد اشرف علی الدوام ہوا

ہوس گل گشت رضواں کی کرے کیوں عندلیب دل — محبت کی گلی میں شاہ دیں کے ہے وطن میرا
ہوا ہے بسکہ زخمی خنجر داغ غم شہ سوں — برنگ لالہ ہے لبریز خوں دل کا چمن میرا
مہ و خورشید کے جھلکار سوں اس دن ہے روشن تر — ملیا ہے حب آل مصطفےٰ سوں انجمن میرا
کیا ہوں بے بدل یو مرثیہ جب سے اماموں کا — ہوا مشتاق ہر یک شاعر ملک دکھن میرا

جو کوئی صدق دل سوں دوستدار آل پیغمبر
ہے اشرف اس کے پگ کی خاک کوں کحل نین میرا

بھولاناتھ لائبریری کے دیوان ولی کے صفحہ تیس ۳۰ کے حاشیے پر یہ نعت ہے

نعت

شفیع روز محشر ہیں محمدؐ — ہر ایک گرہ کے رہبر ہیں محمدؐ
جو ہیں شاہنشہ ملک شریعت — انوکوں سر پہ افسر ہیں محمدؐ
نہوں کیوں کافراں مخذول نگیں — مسلمانوں کے یاور ہیں محمدؐ
نہ بولوں کیوں سپہر مہربانی — کرم سوں ذرہ پرور ہیں محمدؐ
سخن میرا نہو کیوں بحر معنی — صدف میں دل کے گوہر ہیں محمدؐ
بزرگ ان سیں نہیں ہے کہ خدا بعد — ہر ایک جتنے سوں بہتر ہیں محمدؐ
عروس فکر کوں میری ہے زینت — سخن کا جب زیور ہیں محمدؐ
اگر تا حشر بولوں نعت میں شعر — لکھوں میں اس سوں برتر ہیں محمدؐ
سپہر دین حق اوپر اے اشرف — عجب خورشید انور ہیں محمدؐ

بھولاناتھ لائبریری کے مخطوطے کے صفحہ تینتالیس کے حاشیے پر یہ مرثیہ ہے:

مرثیہ

بسکہ تیرا غم ہے بھاری یا امام — رات دن کرتا ہوں زاری یا امام
زخم تیرے غم تیری ماتم سیتی — دل میں لایا ہے کاری یا امام
نقد دل حاصل ہے ان کوں جو کئی — تجھ قدم پر جاں نثاری یا امام
والیِ تخت ولایت کا چھتر — ہے تمہاری دوست داری یا امام
یوں لگی دل بیچ نیش غم ترا — جیوں لگی زخم کاری یا امام
داغ دل جیوں لالہ تیرے غم سی — دی مجھے نت یادگاری یا امام
ہیں شہنشاہ سریر ملک دیں — جو کینی خدمت تمہاری یا امام
کینہ ورزی جو شقی تم سوں کیا — ہے دو جگ میں اس کوں خواری یا امام
جیوں قوس قزح خم ہوئے فلک — بار تجھ غم کا ہے بھاری یا امام
غرق بحر جرم ہوں روز جزا — شرم تم رکھیو ہماری یا امام
اب تار چشم اشرف سوں ہے نت
جوئے خوں تجھ غم میں جاری یا امام

نعت برحاشیہ مخطوطہ صفحہ ۵۴

جیو سوں میں فدائے احمد ہوں　　دل ستی　　احمد ہوں
بے خبر کیوں نہ ہوں دو عالم سوں　　مست شوق لقائے احمد ہوں
دل میں کچھ خوف نہیں ہے دوزخ کا　　بلکہ میں مبتلائے احمد ہوں
فخر میرا یہی ہے دو جگ میں　　بندۂ با وفائے احمد ہوں

نام میرا ہے اس سبب اشرف
مشتے از خاک پائے احمد ہوں

مخطوطہ صفحہ ۵۴ کے حاشیے پر با ریختہ محمد اشرف

میں پی مے محبت مستانہ ہو رہا ہوں　　ہوش و خرد سوں اپنی بیگانہ ہو رہا ہوں
سودائے زلف خوباں ہے جب سے دل میں میرے　　کر چاک چاک سیناں جیوں شانہ ہو رہا ہوں
شیریں بچن سوں جب کا لاگیا نیہہ جگ میں　　مانند کوہکن میں افسانہ ہو رہا ہوں
احوال دل سوں میرے ہے بے خبر وہ ظالم　　غم خوار کے سوں جس کے غم خانہ ہو رہا ہوں
اے رشک حسن لیلےٰ ہے عشق جب سوں تیرا　　مجنوں ہفت مقیم ویرانہ ہو رہا ہوں
یو حسن کی چمک میں دیکھا ہوں جب سے تب تھی　　اے شمع تجھ لگن میں پروانہ ہو رہا ہوں
بیزار ہوں سدا میں دنیا و دیں سوں اشرف　　محو خیال روئے جانانہ ہو رہا ہوں

نقل از مخطوطہ بھولا ناتھ لائبریری پر حاشیہ دیوان ولی

پیشوائے رسل محمدؐ ہیں　　ہادی جز و کل محمدؐ ہیں
چشم اخلاص سوں اگر دیکھو　　معنے چار قل محمدؐ ہیں
راہ حق بیچ کیوں پڑوں بھولا　　رہنمائے سبل محمدؐ ہیں
بلبل دل کوں کیوں اچھے غفلت　　گلشن دیں میں گل محمدؐ ہیں

کیوں نہ گزروں بحر وحدت سوں
اشرف اس راہ میں محمدؐ ہیں

ایضاً ولہٗ

اے مست جام بیخودی ہشیار ہو ہشیار ہو　　خواب غفلت کب تلک ہشیار ہو ہشیار ہو
اس دور میں درکار ہے گر بادۂ گل رنگ عشق　　آیا ہے ساقی جام لے سرشار ہو سرشار ہو

اس قاتل بے رحم نے باندھی کمر منجھ قتل پر　　اے غمزۂ خونریز توں تروار ہو تروار ہو
تسخیر ملک عاشقی تجھ کوں جو ہے ارزو　　اے دل السم کے فوج کا سردار ہو سردار ہو
کر شربت لعل شفا..........　　اس کی انکھیاں کی یاد میں بیمار ہو بیمار ہو
وحدت کے میخانے منیں نہیں یاد ہرگز ہوشیاں　　یہاں اپنی عقل و ہوش سوں بیزار ہو بیزار ہو
یو مصرعہ شعر ولی اشرف توں کر ورد زباں　　غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار ہو ہشیار ہو

از مولود نامہ حافظ رحمت اللہ غیر مطبوعہ پیر محمد شاہ کتب خانہ :

مرحبا اے شاہ مرسل　　مرحبا اے ماہ اکمل
مرحبا اے جان آدم　　مرحبا اے رحمت عالم
مرحبا ختم رسالت　　مرحبا مہر ہدایت
مرحبا سب کے وسیلے　　مرحبا جگ کے رسیلے
مرحبا اے ابر رحمت　　مرحبا دُرِّ نبوت
مرحبا دلدار ہمدم　　مرحبا غم خوار ہر دم
مرحبا اے دیں کے رہبر　　مرحبا امت کے سرور
مرحبا ختم پیمبر　　مرحبا شافع محشر
مرحبا دو جگ کے سلطاں　　مرحبا محبوب یزداں
مرحبا جنت دلایا　　مرحبا حق سے ملایا
مرحبا ؟ حاصل رواں
مرحبا اشرف کے درماں

رضی　　　　کلام

خراب نرگس مستانہ ہوں نمین کی قسم　　برنگ بلبل دیوانہ ہوں چمن کی قسم
جمال انجمن آرائے شمع رخ پہ ترے　　شب وصال میں پروانہ ہوں لگن کی قسم
عذاب روز قیامت سیں کچھ نہیں پروا　　شہید خنجر جانانہ ہوں کفن کی قسم
پیا کی چشم کی وحشت کو دیکھ جیوں مجنوں　　شکار دامن ویرانہ ہوں ہرن کی قسم

دیکھا ہے جب سے رضیؔ پیچ وتاب طرۂ یار ۔۔۔ بزار خاک سی جیوں شانہ ہوں شکن کی قسم[1]

باغ ہے سیر ہے نظارا ہے ۔۔۔ سبزہ ہے لالہ ہے ہزارا ہے
کان میں یار کے دُر بالی ۔۔۔ مہر ہے ماہ ہے ستارا ہے
نگہ شوخ قاتل خون خوار ۔۔۔ سیف ہے بانک ہے دودھارا ہے
ملک دل کو خراب کرنے کوں ۔۔۔ شاہ ہے فوج ہے نقارا ہے
آ مجھ آغوش میں حجاب نہ کر ۔۔۔ گوشا ہے رات ہے اندھارا ہے
مجھ کو ہر دم جدائی سے ۔۔۔ آہ ہے نالہ ہے پکارا ہے
ہاتھ کے بیچ ساز مطرب کے ۔۔۔ بین ہے چنگ ہے دوتارا ہے[2]

غم سوں ہے بے قرار میرا دل ۔۔۔ دکھ سوں ہے زار زار میرا دل
گلشن غم سے ہے شہیداں کے ۔۔۔ لالۂ داغ دار میرا دل
لت شہیداں کے زخم غم دا سیں ۔۔۔ شق ہے جوں ذوالفقار میرا دل
نیم بسمل نمن تڑپتا ہے ۔۔۔ ہو کے غم کا شکار میرا دل
گرد غم سوں امام کے اے رضیؔ ۔۔۔ کیوں نہ ہو پر غبار میرا دل[3]

کاش ایک بار یا رسول اللہ ۔۔۔ پاؤں دیدار یا رسول اللہ
کشتی دل کی پڑی ہے گھری میں ۔۔۔ تم کرو پار یا رسول اللہ
صدق دل سے کروں میں تم اوپر ۔۔۔ جان بلہار یا رسول اللہ
نگہ لطف سیں تم کرو دارو ۔۔۔ میں ہوں بیمار یا رسول اللہ
درس کی بھیک منگتا ہے رضیؔ
تم ہو داتار یا رسول اللہ[3]

---

[1] گلشن گفتار [2] حدیقۂ احمدی۔ یہی غزل آخری شعر کے اضافے کے ساتھ راقم کے کتب خانے میں ایک نادر بیاض میں فراقی کے نام سے منسوب پائی جاتی ہے۔ حدیقۂ احمدی میں آخری شعر نہیں ہے۔ [3] قلمی بیاض مملوکہ راقم ۱۲

ثناء

کلام

یہ ہوگئی ہے اسے نام سی ثنا کے ضد — کہ ثنا خدا کی بھی وہ بیت نہیں کیا کرتا
ثنا کا کام یہی ہے کہ اپنے منہ سوں بس — سدا ثنا دہن یار کی کیا کرتا

آگے اس قاتل خون ریز کے مقتل میں ثنا — جس نے سر اپنا جھکایا وہ سرافراز ہوا[1]

فراقی

کلام

یاکھا غلام کر کر تیرے حسن نے مجھ کوں — آخر قتل کیا ہے تیری نین نے مجھ کوں
میں بے خبر پڑا تھا مستانہ ہو زمیں پر — پھر کر کے ہوشیار کینا تیرے سخن نے مجھ کوں
خدمت میں سو تیری ثابت قدم رکھا ہوں — جھلا لیے ہے جوں شمع کر تیری اگن نے مجھ کوں
توں گل ہے یا سمن کا خوبی کے باغ اندر — بلبل کیا ہے جانی تیری چمن نے مجھ کوں
صادق فراقی مت کر پھیری گلی میں ہر شب — رسوا کیا ہے جگ میں تیری لگن نے مجھ کوں

مخمس

لیا ہے دل میرا جانے تیری ناگن دو زلفاں مل — کمان ابرو نین خنجر لگاویں تیری پلکاں مل
تیرے دیکھن کوں کھڑیاں ہیں میری جوگن چھپیاں مل — تیرا دیدار منگتیاں ہیں میری جوگن دو اکھیاں مل
لطف سے آج اے دلبر توں آ خلوت ... مل

بعد از صبح کے .... دعا تجھ کوں کہلاتا ہوں — نظر کر دیکھنا میری طرف یکبار چپاتا ہوں
دو تارا تن تنی تن کر سرود عشق گاتا ہوں — ہمیشہ تیری گلیوں میں صبح تا شام آتا ہوں
کھڑے ہیں میرے مارن کوں کئی زہرن رقیباں مل

نہ دیکھا ہم تیری مانند حسن غمزہ نزاکت میں — نہ در ہند و سمرقند و یمن ہرمز ولایت میں

---

[1] تذکرۂ شعرائے حدیقۃ احمدی...

پکاریں مدعی فریاد قاضی کی عدالت میں — کہو جا محتسب مفتی کوں نہیں کھتا حمایت میں

سخن سنگ آیں خلوت میں ہمن پیتے شراباں مل

مخمس جب لکھا ہمنیں قلم سیاہی سوں تر کر کر — سخن شیریں ورق اوپر لکھا دل سوں فکر کر کر

پروئے جوہری سارے سخن گوہر کے لڑ کر کر — عیاں صادق فراقی دیکھ مجلس میں نظر کر کر

تیرے شعراں کوں پڑھتے ہیں شہ دبیر و وزیراں مل [1]

یارب توں لے جا مج کوں محمد کی گلی میں — کر خاک بچھا مج کوں محمد کی گلی میں

احمد کے قدم دیکھنے میں خاک ہوا ہوں — اے باد لے جا مج کوں محمد کی گلی میں

ای قادر قیوم میری یہی دعا ہے — رکھیو توں سدا مج کوں محمد کی گلی میں

گجرات نگر سیں توں مج کوں لے جا کر — .... مج کوں محمد کی گلی میں

مقصود فراقی کا دو عالم میں یہی ہے — لے جاوے خدا مج کوں محمد کی گلی میں [2]

وہ منہ رگھ سے نکلے ہر بہانہ لے کے جانے کا — دکھاتا ہے تماشا مج کوں ہنگام جوانی کا

کیا مصرعہ نازک ہے فراقی کی غزل میں — یک بار میرے ہاتھ میں وہ نازک کمر آئے

(حدیقۂ احمدی)

مدینے میں اگر پیدا ہوا ہوتا تو کیا ہوتا — محمد کی گلی بھیتر فنا ہوتا تو کیا ہوتا

حبشت خوباں کی گلیوں میں اگر توں صرف نا کر دل — مدینے کے زیارت کوں گیا ہوتا تو کیا ہوتا

ارے مجنوں ہوا بدنام توں لیلے کوں دل دیکر — اگر میرے نبی کوں دل دیا ہوتا تو کیا ہوتا

ازل کے دین میں یارب اگر مفلس بھکاری ہوں — نبی کے آستانے کا گدا ہوتا تو کیا ہوتا

منجہ اس مکتب مجازی میں جو عشق استاد نا ہوتا — تو میرے دل کی کثرت کا سبق برباد نا ہوتا

نظر ہے علم منطق ہور معانی میں فراقی کوں

اگر علم حدیث مصطفےٰ ہوتا تو کیا ہوتا

(دکن میں اردو)

---

[1] [2] بیاض مملوکۂ راقم [3] از قلمی بیاض مملوکۂ راقم

راجارام

کلام

عشق میں چھوڑ کر عزیز و خویش — شاہ خوباں کے پاس ہو درویش
حسن دکھلا کے وہ کمانِ ابرو — عشق کے تیر سے کیا دل ریش
کیوں لگے دل کے تئیں میرے آرام — عقرب عشق نے لگایا نیش
پارسا کیوں رہے صنم کے پاس — زلف اس کی ہے کافر بدکیش
عشق میں شمع کے راجا رام — مثل پروانہ جل مت اندیش

اے دل شتاب چل توں اس یار کی طرف — خورشید حسن صورت انوار کی طرف
اے عندلیب دل توں نظارے کوں چل شتاب — گل وہ گیا ہے سیر کوں گلزار کی طرف

اے دل توں گل عذار طرف جھک کہیں جھک — بلبل ہو تو بہار طرف جھک کہیں نہ جھک
تجھ کوں اگر جہان میں شہیدی کا شوق ہے — ابرو کی ذوالفقار طرف جھک کہیں نہ جھک
رکھتا ہے گرچہ ساغر و صہبا کی آرزو — اوس چشم پرخمار طرف جھک کہیں نہ جھک
راجا توں رام ہے تو کہیں گے تجھے ولی — بندہ ہو کر دگار طرف جھک کہیں نہ جھک

شمع رو صحن چمن میں چل بستاں سے نکل — بلبلاں پرواز ہو آئیں گلستاں سے نکل
تجھ لب رنگیں کا شہرت سن کے و ے خورشید رو — لعل سب آئے یہاں کان بدخشاں سے نکل
شام میں تجھ زلف کے دنداں تجھ کر شب چراغ — ناگ لے آتے ہیں من ملک سلیماں سے نکل
سیر کوں جاوے اگر توں باغ میں اوگل بدن — پیشوا آویں گے گل اپنے خیاباں سے نکل

خواب مخمل مجھ کوں کیوں خوش آوے راجارام آج
دل ربا جاتا رہے دور انکھیاں سے نکل

کلام کا مجموعہ راقم کے کتب خانہ میں ہے۔ کلام اسی سے نقل کیا گیا ہے

سجن کے دیکھ چشم غمزے کوں — بھلا ہے ساحری و ساخری کوں
ہمیشہ آفتاب ہوتا ہے قرباں — بندھا سو یار دستار زری کوں

سجن پر دل کوں دیوانہ کیا ہوں — وہ اپنا تھا سو بے گانہ کیا ہوں
سجن کے درد کی سرن بتانے — ہر ایک انجو کوں دُردانہ کیا ہوں

جو کچھ ہے راز پنہاں احدیت کا — سنا مج کوں تیرے شیریں دہن سوں (ف زباں)
چھپیا رکھ عاشقوں کا گنج اسرار — نہ کر اظہار زاہد بے ادب سوں
تیرا مکھ مخزن نور الٰہی — تیری تعریف کیوں ہووے بشر سوں

اے راجا جو موا مرنے کے آگے
وہی ہے بے فکر روز حشر سوں
(متحرک) (متحرک)

احمد

کلام

بتا تو کیا کروں اب راہ عشق میں احمد — سر پر تو سانجھ پڑ گئی پاؤں تھک گئے[1]
شب چھوٹے وعدوں پر جو تیرے ہم بہک گئے — کوئی لاکھ بار گھر سے اُٹھے در تلک گئے[2]
پوچھے تھے کل میاں سو اپس دل کے بیچ ہم — سو آج لا کے سر اسے میرے ٹپک گئے[2]

احمد بتا میں کیا کروں راہ عشق میں
ایک سانجھ پڑ گئی ہے دوجے پاؤں تھک گئے[1]

سانجھ پڑ گئے ہے دراصل سانجھ پڑ گئی ہے
گلزار ابراہیم میں بھی یہی شعر ہے اور مصرع ثانی یہ ہے
سر پر تو سانجھ پڑ گئی اور پاؤں تھک گئے

---

۱ حدیقۂ احمدی ۲ مخزن نکات

کلام

ہوئے دیدار کے طالب خودی سوں خود گزر نکلے — نہ پائی راہ دانش میں خرد شاہ بے خبر نکلے
نشانِ بے نشاں ہم ملک یک رنگی میں پائے ہیں — خبر چھوڑی دوئی کا ہم نے جب سینے ہٹ نگر نکلے
بھرے دو مین کے چھگلاں بسوری ساتھ لے توشہ — کر ہمت سے باندھے ہو پریت کی باٹ پر نکلے
ہمن کے ہاتھ کھپرے پھریں درسن کی بھکیاں کو — نہ پائی ایک در بھی بھکاری در بدر نکلے

رہے تا در خیالاں سے شوریدہ حالاں میں
ہوئے صاحب کمالاں میں کدھر سے آ کدھر نکلے[1]

تبصرہ

اُردو ادب کی تاریخ میں عہدِ ولی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں زبان و ادب اپنے ایک نئے روپ میں رونما ہوئے۔ یہ وہ مبارک دور ہے جب کہ لسانی وحدت نے جنوب و شمال میں ادبی اخوت قائم کرکے اُردو برادری کے رشتے مستحکم کر دئے۔ اسی دور سے اُردو غزل نے اپنے عشوہ ناز سے پیر و جواں کے دلوں کو مسخر کرنا شروع کیا۔

گجرات میں اردو ادب پر ایک ہی دور گذرا تھا مگر دکن میں اُردو زبان و ادب کو سرکاری درباری سرپرستی حاصل ہونے کی وجہ سے ادب نے تیزی سے ترقی کی۔ اساتذہ فن کے بیسیوں کارنامے منظرِ عام پر آ گئے جن کی وجہ سے ایک ادبی زبان و اسلوب رائج ہو گئے جس کو دکھنی کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ شاعروں نے مثنوی، قصیدہ، مرثیہ وغیرہ میں خوب طبع آزمائی کی اور جہاں تک صنفِ غزل کا تعلق ہے اس کو اُردو سانچوں میں ڈھالنے کا فخر تاجدارانِ دکن کو حاصل ہے۔ غزل گو سلاطین صاحب دیوان گذرے ہیں۔ ان کا کلام الملوک ہونے کی وجہ سے دکن میں ہر سمت گیا ہوگا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام زیادہ مقبولیت حاصل نہیں کر پایا۔ یہی وجہ تھی شاید کہ دکن کے چند گنے چنے شعرا نے اس صنف کو اپنایا۔

---

[1] مخزن شعراء

دکھنی متغزلین کے کلام کی فضا ہندوستانی ہے۔ ان کی تخلیقات میں حسن و عشق سے متعلق جذبات و کیفیات اپنے رومانی رکھ رکھاؤ کے ساتھ موجود ہیں اور ان کا ذریعۂ اظہار دکھنی زبان ہے۔ غرض دکھنی متغزلین نے غزل کا ایک نقش اول پیش کر دیا جس کا بہتر نقش ثانی پیش کرنے کا سہرا ولی کے سر ہے۔

شمال میں اُردو زبان ایک عوامی زبان کی حیثیت سے عوام کی لسانی ضروریات پوری کر رہی تھی لیکن اس کو ادب کے لئے قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ فارسی کی لطافت و شیرینی نے ایک ادبی ذہن بنا دیا تھا اس لئے اس ذہن کو اُردو کی کم مائیگی اور کھردراپن متاثر نہیں کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ افضل جھنجھانوی متوفی ۱۰۲۵ھ کی 'بکٹ کہانی' کے بعد مولانا عبداللہ عبدی کا رسالہ فقہ ہندی (۱۰۷۴ھ) جھجر کے ایک بزرگ محبوب عالم کی تصانیف محشر خیال، دردنامہ، خواب نامۂ پیغمبر، جہز نامۂ بی بی فاطمہ اور زٹل اٹل وغیرہ کے ریختے چند گنی کے کارنامے ملتے ہیں۔ گجرات میں صوفیا کے بعد ان کے عقیدت مندوں اور تصوفی مذہبی رجحان رکھنے والے شاعروں کی مذہبی اخلاقی مثنویاں اور نظمیں اس دور کی نمائندگی کرتی ہیں۔

ایسے زمانہ میں ولی نے اپنی ادبی کرامات سے اُردو ادب کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ ولی کا مقصد حیات صرف ادبی اصلاح و اجتہاد نہیں تھا۔ اس کا مشن ملٹی پرپز مشن تھا۔ اس نے اپنے زمانہ کے تصوفی، مذہبی، سماجی، ادبی تقاضوں کو بیک کرشمہ انجام دینے کے لئے صنف غزل کا انتخاب کیا۔ غزل کے ذریعہ ولی نے ایک طرف مجاز و حقیقت کے رومانی و روحانی پہلوؤں کے پردے میں اخلاقی، تصوفی، اور سماجی دروس پیش کئے اور دوسری جانب غزل نے ادبی نف... ...ش... ...ناس کرایا۔

ولی نے اپنے عہد کی ادبی زبان کو رفعت خیال اور ذکر جمال کے لئے موزوں و مناسب نہ پاتے ہوئے تراش خراش کا عمل شروع کیا۔ ان کی زبان میں فارسی عنصر کو زیادہ دخل ہے۔ اس کا یہ اجتہاد فارسی لفظوں، محاوروں، ترکیبوں، تشبیہوں، استعاروں وغیرہ کے استعمال میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس نے ذوق لطیف سے کام لے کر نئے مرکبات، استعاروں، ترکیبوں، تشبیہوں کو اختراع کر کے زبان میں بیش بہا اضافہ کیا۔ اس کے کلام میں ہندی عنصر ضرور موجود ہے لیکن فارسی کے

سامنے پھیکا پڑگیا ہے۔ اگلے دور کی کئی خصوصیات ولی کے ہاں ناپید ہیں کیونکہ دور اول اور ولی کے درمیان دکھنی دور میں زبان ایک حد تک ترقی کر چکی تھی۔ ولی کے دور کی مروجہ ادبی شاخوں گجری اور دکھنی کے الفاظ جیسے، تجھواں، چیرا، سجن، درشن، درس، نین، اتنا، کتے، کید دھر، گجراتی الفاظ جیسے اڑکنا، چترنا، جوکھنا، ہلاس، ناٹھنا وغیرہ ضمائر جیسے ہمن، تمن، تم، صیغہ ماضی جیسے سنیا، دیکھیا، بعض ترکیبیں جیسے مجھ پاس، اس پاس، تغافلی، انتظاری سوں، سیں، کوں وغیرہ ولی اور اس دور کے تمام شعرا میں عام ہیں۔ الفاظ اور ترکیبوں کو غور سے دیکھنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ولی کی زبان دہلوی، گجری اور دکھنی شاخوں کی خصوصیات کا مجموعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شمال و دکن کسی جگہ ولی کی زبان کو اجنبی نہیں سمجھا گیا بلکہ اس کو اپنے ہی علاقہ کی زبان تصور کیا گیا۔

اس دور کے سخنوران شمال و جنوب کے کلام کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ شعرا نے ولی کی شعری اصلاحوں کو سر آنکھوں پر لیا۔ ولی کے گجراتی شاگرد اور ہم عصر ولی کے نقش قدم پر چلنے کے سختی سے پابند نظر آتے ہیں۔ ولی کے کلام میں صنعت ایہام و رعایت لفظی خصوصیت رکھتی ہے۔ ولی نے اس سے بہت ہی سلیقہ مندی سے کام لیا ہے لیکن اس دور کے شعرا میں اس کی سی حسن و خوبی نہیں پائی جاتی۔ ولی نے مشکل زمینوں میں اچھی غزلیں کہی ہیں۔ اس کے شاگردوں اور ہم عصروں نے بھی اس کا تتبع کیا ہے۔ اس دور کے شعرا میں عشق حقیقی کا تصور نمایاں ہے۔ شمال میں اس تصور نے مجازی صورت اختیار کر لی تھی۔

ولی اور اس دور کے دیگر شعرا کے کلام کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے!

ولی

مشکل قافیے

مجھے گھٹ میں لے گھر گھٹ ہے شوق تجھ گھونگھٹ کا
دیکھیں سوں لٹ گیا دل تیری زلف کا لٹکا

کر دیا تجھ کپٹ کوں پڑتے ہیں اشک ٹپ ٹپ
مکھ بات بولتا ہوں شکوہ تیری کپٹ کا

تجھ نین دیکھنے کوں دل ٹھاٹھ کر چکا تھا — غمزے کے دیکھ ٹھٹ کوں ناچار ہوئے ٹھٹکا
تجھ خط کے بن توجہ کھلنا ہے اس کا مشکل — حلقے میں تجھ زلف کے جو جیو جا کے اٹکا

اشرف

اری اے سنگدل کیوں دل ہی یاری توڑ بیٹھی ہے ‏ ‏ ہمارے شیشۂ دل کو جفا سے پھوڑ بیٹھی ہے
مجھے مشتاق اپنا بوجھ کر وہ چھند بھری چنچل ‏ ‏ اپس کے مکھ اُپر آنچل اداسوں اوڑ بیٹھی ہے
حقیقت میں توجہ کی نظر ہی مجھ اُپر اس کی ‏ ‏ اپس کے مکھ کوں ظاہر میں اگرچہ موڑ بیٹھی ہے

راجارام

دیکھ صحن چمن میں اوس سرو قامت کا لٹک ‏ ‏ خاک میں مل گئی ہے قمری پر کٹیں اپڑ ٹپک
یار کی چاہ زنخداں میں ہی میری زندگی ‏ ‏ پڑکے غفلت میں لئے دل مت سکندر سلیھٹک
نیم بسمل ہو تڑپتا ہے اداسے دل میرا ‏ ‏ تس اوپر تیغ اداکوں یار یکدم تب جھٹک
شاد دل اب کیوں نہ ہو وہ یار راجارام کا ‏ ‏ وصل کی دولت کوں پایا تیری الفت میں اٹک

رعایت لفظی کی چند مثالیں دیکھئے :

ولی

جو ہوا راز عشق سوں آگاہ ‏ ‏ وہ زمانے کا فخر رازی ہے
کیوں ہوا ہے تو ہم سوں نافرماں ‏ ‏ داغ دیتا ہے تجھ بنا لالا
جب لگ ہمارے تجھ گل میں رقیب بیباک ‏ ‏ تب لگ ہمارے حق میں ہر اک صبح شام ہے

اشرف

آب دیکھا اس کی تیغ ابرو کا ‏ ‏ دم شمشیر کوں ہے بے آبی
کیا تجھ درس میں تحصیل علم عاشقی اشرف ‏ ‏ اگرچہ حاشیہ کو خط کے تیرے سرسری دیکھا

راجارام

سجیلا دیکھ اوس کے سبز خط کوں ‏ ‏ غلامی خط دیا ہے مکھ کے سنبل
لے شکر لب توں ترش کر کر بات ‏ ‏ کیئں مٹھائی میں مت کھٹائی کر

تبصرے کے آخر میں ولی اشرف رضی اور راجارام کے ہم ردیف اشعار ملاحظہ کیجئے

ولی

دل کوں ہے تجھ کوں دلبری کی قسم ‏ ‏ کھوں انکھیاں کوں ساحری کی قسم
بیت برجستہ معنی رنگیں ‏ ‏ ہے تیری چشم عنبری[1] کی قسم

---

[1] کلیات ولی میں عبہری ہے

ہے بہت جھلجھلاہٹ اس رخ پر　　مجھ کوں اس چہرۂ زری کی قسم
ہے تصور ترا میرے دل میں　　رات دن شیشہ و پری کی قسم
ایک ولی کوں صنم گلے سوں لگا　　تجھ کوں ہے بندہ پروری کی قسم

راجا رام

بلبل ہوا ہوں عشق کے گلزار کی قسم　　اوس گلبدن کے چیرئی کنار کی قسم
دیکھا ہوں جب سے آئینہ رو کا جمال صاف　　حیرت سیں دل ہے صورت دیوار کی قسم
دیکھا سو لکھ کتاب کوں مکتب میں عشق کے　　لیتا ہوں درس مصحف رخسار کی قسم
تیغ نگہ کی وار سے بسمل ہوا ہے دل　　اوس خوش نین کے ابروئے خمدار کی قسم

اشرف

ہوا ہوں بستہ زلف سمن شکن کی قسم　　ہوا ہوں بعدم مین ہرن کی قسم
یہ شعر سن کے کہے ہیں صد آفریں اشرف　　تمام شاعر ملک دکن سخن کی قسم

رضی

خراب نرگس مستانہ ہوں نین کی قسم　　برنگ بلبل دیوانہ ہوں چمن کی قسم
مجال انجمن آرائے شمع رخ پہ ترے　　شب وصال میں پروانہ ہوں لگن کی قسم
دکھا ہے جب سے رضی پیچ و تاب طرۂ یار　　مزار خاک سے جیوں شانہ ہوں شکن کی قسم

تیسرا باب

سیاسی سماجی پس منظر

۱۷۰۰ / ۱۱۱۲ تا ۱۸۵۰ / ۱۲۶۷

بابر سے عالمگیر تک ایک سو اسّی سال دلی کے تخت پر چھ مغل حکمران بیٹھے اور ۱۷۰۷ء تا ۱۷۴۸ء چالیس سال کی مدت میں دس بادشاہ نامزد کئے گئے۔ عالمگیر کے بعد کوئی قابل حکمران نہیں آیا جو اتنی وسیع سلطنت کو سنبھال سکتا۔ عالمگیر کے بعد انتشار پھیل گیا تھا لہٰذا شر پر عناصر پھر ابھر آئے سکھوں اور جاٹوں نے موقع پاتے ہی سر اٹھایا۔ عہد محمد شاہ میں روہیلوں نے سکون غارت کر دیا۔ مرہٹوں کی لوٹ مار اپنے شباب پر تھی۔ بنگال اور مالوہ بھی ان کی تیغ بے دریغ سے نہ بچ سکے۔ مرہٹہ سرداروں نے ناگپور، اندور، گوالیار، بڑودہ میں خود مختار حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ ۱۷۲۴ء میں نظام الملک نے حیدرآباد میں خود مختار ریاست قائم کر لی۔ ۱۷۳۹ء میں نادری حملہ ہوا۔ ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ ابدالی نے حملے کئے۔ ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں نے بہ زعم خود پانی پت کے میدان میں ابدالی کا مقابلہ کیا لیکن چند گھنٹوں میں مرہٹوں کی ایک لاکھ فوج تتر بتر ہو گئی۔ اس جنگ میں مرہٹوں کا طلسم ٹوٹا اور پھر گجرات و دکن سے آگے نہ بڑھے۔

بادشاہ نا اہل تھے اور امراء لوٹنے کے اہل تھے۔ بدنظمی کا یہ عالم تھا کہ صوبیدار شاہی احکامِ فرامین کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے تھے۔ امراء اور شاہی افسران چور ڈاکوؤں سے سازباز کرتے رہتے اور کوتوال چور ڈاکوؤں سے ڈرتے تھے، فوجیوں کو تنخواہیں مہینوں اور برسوں میں ملتیں جس کی وجہ سے بلوے رونما ہوتے۔ شاہی قلعہ رذیلوں اور کمینوں سے بھرا ہوا تھا۔

میراثی ڈوم خطاب یافتہ امیر بن گئے تھے۔ ادنیٰ درجہ کے نااہل لوگوں کو اعلیٰ عہدے دئے جاتے تھے شعرا نے اپنی تخلیقات میں اس دور کی بدحالی کی ترجمانی کی ہے۔

گجرات اس دور میں مغل، مرہٹہ، نظام الملک اور انگریز ایسے چار حریفوں کا زور آزمائی کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ نظام الملک اور انگریزوں کی سازشوں نے صوبیداروں کو خودمختاری سے کام لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ پیشوا اور گائکواڑ کی خانہ جنگیوں کا میدان بھی گجرات تھا۔ مختلف مقامات کے متصدی اور فوجدار بھی ذاتی مفاد کے لئے آپس میں دست و گریبان رہتے تھے۔ ۱۷۰۶ء تا ۱۷۱۶ء کھنڈیراؤ دھباڑے گجرات میں چوتھ وصول کرنے کے سلسلہ میں غارت گری کرتا رہا۔ ۱۷۱۹ء میں پلاجی راؤ نے سون گڈھ پر پڑاؤ ڈالا اور گجرات خاندیس پر حملوں کا آغاز کیا۔ ۱۷۳۶ء میں مرہٹوں نے گجرات کے کروڑ پتیوں کے شہر ویسل نگر اور وڈنگر کو لوٹا۔ ۱۷۲۰ء میں آصف جاہ اپنے ایک عزیز حامد خاں کو گجرات کا صوبیدار مقرر کر کے چلا گیا۔ نائب ناظم شجاعت خاں حامد خاں کے قدم جمنے نہیں دیتا تھا لہٰذا آصف جاہ نے مرہٹہ سردار کنھاجی سے سازباز کر کے شجاعت خاں کا کانٹا نکلوا دیا۔ جنگ میں شجاعت اور اس کا بھائی ابراہیم خاں مارے گئے۔ ان کا بھائی رستم علی جو سورت کا متصدی تھا بھائیوں کا بدلہ لینے مرہٹوں کے مقابلے میں آیا۔ اس جنگ میں رستم علی بھی مارا گیا۔[1]

سربلند خاں ناظم گجرات تھا جو نائب کے ذریعہ نظامت کرتا تھا لیکن شجاعت کے بعد ۱۷۲۵-۳۶ء میں وہ دہلی سے گجرات آیا اور مرہٹوں سے نبرد آزما ہوا اور دہلی سے مدد نہ ملنے کی صورت میں مرہٹوں کو چوتھ اور سردیش مکھی کا حق دے کر معاہدہ کر لیا۔ مرکز نے معاہدہ منظور نہیں کیا اور سربلند خان کی جگہ پر دہلی سے ابھے سنگھ کا تقرر کیا گیا۔ ابھے سنگھ اپنے نائب رتن سنگھ کو اختیارات دے کر اپنے وطن چلا گیا۔ آخر دہلی سے کھمبایت کے متصدی مومن خان کو ناظم مقرر کیا گیا۔ مومن خان نے رتن سنگھ سے اختیارات حاصل کرنے کی غرض سے مرہٹوں سے معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدے کی رو سے گجرات کا آدھا محصول اور شہر احمد آباد کی آمدنی کا نصف حصہ کے مرہٹے (پیشوا) حقدار ہو گئے۔ مرہٹہ سرداروں کے مفاد میں یہ نہیں تھا لہٰذا ان سرداروں اور پیشوا کے درمیان ۱۷۲ء میں مقام ڈبھوئی پر جنگ ہوئی۔ پیشوا پلاجی کو اپنا نمائندہ مقرر کر کے دکن چلا گیا۔

---

[1] ایک شاعر نے جنگ رستم علی کے نام سے ایک رزمیہ مثنوی لکھی ہے۔

یہاں پلاجی کے بیٹے داماجی نے اپنے قدم جماکر بڑودہ میں ایک خود مختار حکومت قائم کردی۔

۱۷۴۳ء میں مومن خان کے بعد فخر الدولہ ناظم گجرات مقرر کیا گیا۔ یہ خود دہلی میں رہتا اور گجرات میں اس کا نائب جواں مرد خان بابی نگرانی کرتا تھا۔ ۱۷۴۸ء میں فخر الدولہ گجرات آیا تو جواں مرد خان اس کو شکست دے کر خود ناظم بن گیا۔ صفدر خان بابی کا ایک بیٹا جواں مرد خان اول پٹیلاکا فوجدار تھا اس کے انتقال پر سربلند خان نے اس کے بیٹے کمال الدین کو جواں مرد کا خطاب دیا تھا۔ دوسرے بیٹے صلابت خان کے مرنے پر اس کے بیٹے شیر خان کو سربلند نے نائب ناظم بنا کر جوناگڑھ بھیجا تھا اس نے ۱۷۴۸ء میں جوناگڈھ میں خود مختار ریاست قائم کرلی۔

سورت میں رستم علی کی شہادت کے بعد ۱۷۲۲ء میں اس کے بیٹے سہراب خان کو متصدی مقرر کیا گیا۔ اس عہد میں تقریباً دس سال تک متصدی، قلعہ دار بیگلر خان اور کروڑپتی تاجر ملا محمد علی نے ادھم مچا رکھی تھی[1] یہ تینوں اپنے مفاد کے پیش نظر کبھی مرہٹوں کی مدد کرتے اور کبھی انگریزوں سے ساز باز کر لیتے ان مناقشوں کی وجہ سے کمپنی سرکار نے اہمیت حاصل کرلی اور یہ سیاست میں دخل دینے لگے۔ ۱۷۵۹ء میں کمپنی نے مرہٹوں کی مدد سے سورت پر حملہ کردیا اور معاہدہ یہ کیا گیا کہ کمپنی کو قلعہ دار بنادیا جائے۔ ۱۷۴۲ء تا ۱۷۴۶ء تیغ بیگ خان سورت کا نواب رہا اور اس کے انتقال پر اس کا بھائی بیگلر خان مقرر کیا گیا۔ ۱۷۴۶ء میں بیگلر خان کی وفات پر اس کے داماد صفدر خان کو جانشین قرار دیا گیا۔

۱۷۴۸ء میں احمد شاہ دہلی کے تخت پر بٹھلایا گیا۔ اس وقت تک ہندوستان میں ہر جگہ خود مختار ریاستیں قائم ہوچکی تھیں۔ ۱۷۲۷ء میں کاٹھیاواڑ میں مانگرول، کتیانہ، آمنا سوترا پاٹڑہ، سومناتھ کے تھانیداروں نے ان مقامات کو اپنی جاگیریں بنالی تھیں ۱۷۲۲ء میں بھاؤنگر ۱۷۳۰ء میں دھرانگدار ریاستیں وجود میں آئیں۔ ۱۷۴۸ء میں شیر خان بابی نے جوناگڈھ کو خود مختار ریاست قرار دیدی۔ ۱۷۳۹ء میں بھروچ خود مختار ریاست بن گیا۔ مومن خان دوم ناظم گجرات نے احمد آباد مرہٹوں کے سپرد کرکے کھمبایت میں خود مختار ریاست بنالی۔

اس عہد میں دکن بھی میدان کارزار بنا ہوا تھا فرانسیسی قدم جما رہے تھے اور انگریز ان کے قدم اکھاڑنے کے درپے تھے۔ کرناٹک اور حیدر آباد میں جانشینی کے جھگڑے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے ضمیمہ ما نواب سورت کا خاندان اور ملا خاندان

نکلے۔ فرانسیسیوں نے ایک فریق کا ساتھ دیا تو انگریزوں نے دوسرے فریق کی ہمنوائی کی۔ میدان جنگ میں انگریز فتح مندر ہے اس طرح ان کی ساکھ قائم ہو گئی۔ بنگالہ میں انگریزوں نے پلاسی کے میدان میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۷۶۴ میں شاہ عالم، اودھ کے نواب اور بنگالہ کے میر قاسم نے متحد ہو کر انگریزوں کا زور توڑنا چاہا لیکن خود ان کا زور ٹوٹ گیا۔ جنگ بکسر میں شکست کے بعد بنگالہ، بہار، اڑیسہ کی دیوانی کا حق دے کر انگریزوں کو مشرق ہند کا مالک بنا دیا۔ حکومت برطانیہ کی بھی نیت خراب ہونے لگی ۱۷۷۳ء سے پارلیمانی ضابطے عمل میں آنے لگے اور گورنر جنرل آتے رہتے تھے۔ وارن ہیسٹنگز، ولزلی، ڈلہوزی وغیرہ وہ سیاستداں آئے جنھوں نے برطانیہ کے چنگل کو مضبوط بنایا۔ عہد معاونت، مسئلہ الحاق، قانون استقراض وغیرہ کی رو سے انگریز اپنا اقتدار بڑھاتے رہے۔ نظام، مرہٹہ سردار اور نواب اودھ انگریزوں کی ٹولی میں شامل ہو گئے۔ دکن میں ہنوز ایک شیر غرا رہا تھا لیکن ۱۷۹۹ء میں اس کو مکر و فریب کے جال میں پھانس کر ختم کر دیا۔

احمد آباد کے نظم و نسق اور آمدنی میں پیشوا اور گائیکواڑ دونوں ساجھے میں تھے۔ دونوں کے نمائندے احمد آباد میں رہتے تھے۔ کئی معاہدے ہوئے اور ٹوٹے بھی آخر ۱۸۰۰ء میں گائیکواڑ کو احمد آباد کا ٹھیکہ دیا گیا اور پیشوا کو اس کا سالیانہ ادا کیا جاتا۔ ۱۸۱۴ء میں جب ٹھیکہ کی تجدید کا وقت آیا تو پیشوا نے انگریزوں کو اپنا حق دیدیا۔ انگریز نے گائیکواڑ کو بھی چند پرگنے دے کر احمد آباد کی نظامت کا حق لے لیا۔ اس طرح ۱۸۱۸ء میں انگریز احمد آباد پر قابض ہو گئے۔ احمد آباد تقریباً ۶۲ سال مرہٹوں کے قبضہ میں رہا۔ مصنف مرآت احمدی کا بیان ہے کہ:

"جب مرہٹوں کے ہاتھ سے ۱۸۱۸ء میں انگریزوں نے احمد آباد کا قبضہ لیا اس وقت شہر ایک ویرانہ تھا۔ شہر پناہ جگہ جگہ سے شکستہ تھی صرف آدھے شہر میں آبادی تھی دوسرے نصف حصے میں جہاں بڑے بڑے محلات، مساجد و منادر تھے وہاں درندوں کا شکار کھیلا جاتا تھا۔"

سورت میں ۱۷۴۶ تا ۱۷۵۸ء جو زور آور ہوتا وہ نواب بن بیٹھتا آخر انگریزوں نے اپنے مفاد کی خاطر تیغ بیگ خان کے داماد سید اچھن کو جانشین مقرر کیا اور ۱۷۶۳ تک

رفتہ رفتہ اختیارات حاصل کر کے نوابی کو ٹھکانے لگا دیا[1]

اس دور کے شعراء میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں :

(۱) عزلت (۲) تجرد (۳) فاضل (۴) مضطر (۵) اقدس (۶) رحمت (۷) محمود (۸) بہادر (۹) حامد (۱۰) بخشش (۱۱) کریم (۱۲) محب (۱۳) نصیری (۱۴) صاحب۔ (۱۵) ضاحک (۱۶) لطف (۱۷) کمتر (۱۸) عباس (۱۹) شرفو (۲۰) لطیف۔

عزلت

عبدالولی نام تھا۔ عزلت تخلص کرتے تھے۔ عزلت کے والد سید سعداللہ اودھ میں مقام سلون کے باشندے تھے۔ سید سعداللہ عالم متبحر تھے۔ فقر و سلوک میں بھی اونچا درجہ رکھتے تھے۔ اورنگ زیب کو سید موصوف سے عقیدت تھی اور دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی قائم تھا سعداللہ نے حج بیت اللہ سے لوٹنے کے بعد سورت میں مستقل اقامت اختیار کرلی تھی۔ ۲۵-۱۷۲۴ء/۱۱۳۸ھ میں موصوف نے وفات پائی۔ مزار کی نشاندہی محلہ مغلی سرائے میں ان کے اپنے ذاتی مکان کے پہلو میں ایک مسجد کی جاتی ہے[1]

سید سعداللہ کے تین بیٹے تھے۔ عبدالعلی، عبدالولی اور عبداللہ ان کے نام تھے۔ عزلت ۱۶۹۲/۱۱۰۴ء میں بمقام سورت پیدا ہوئے۔ عزلت کی تکمیل علم سے ہم لاعلم ہیں لیکن تصانیف کے پیش نظر بلا پس و پیش کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے والد کی طرح منقولات و معقولات میں مہارت رکھتے تھے۔ انہیں فنون لطیفہ سے بھی شغف تھا۔ شاعری کے علاوہ مصوری و موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا۔ فن خطاطی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ عربی فارسی کے علاوہ ہندی میں بھی عزلت کو کافی دخل تھا۔ تقریباً تمام تذکرے عزلت کے علم و فضل کے بارے میں رطب اللسان ہیں۔ عزلت نہایت خوش خلق درویش صفت، متوکل، خوش صحبت شخص تھے۔ ان کا زمرۂ احباب و شناسا نہایت وسیع تھا۔ میر تقی میر، خان آرزو، گردیزی، شفیق، آزاد بلگرامی وغیرہ ان کے احباب میں خصوصیت رکھتے ہیں۔ امرا کی محفلوں اور صحبتوں میں بھی انہیں بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

تخلص عزلت تھا مگر عزلت نشین نہیں تھے۔ ۱۷۹۰/۱۱۶۴ھ میں عزلت نے دہلی کا

[1] دیکھئے ضمیمہ ،نواب صورت کا خاندان

سفر کیا تھا اور دہلی جانے سے قبل نظام الملک کے عہد میں اورنگ آباد بھی گئے تھے۔ آزاد بلگرامی کے حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عزلت ۱۷۵۶ء/۱۱۶۶ھ میں دہلی میں تھے۔ دہلی سے یہ مرشد آباد گئے جہاں علی وردی خاں مہابت جنگ ان کا قدردان تھا مہابت جنگ کے انتقال کے بعد عزلت نے دکن کا رخ کیا۔ حیدر آباد میں صلابت جنگ نے انہیں دو گاؤں بطور وظیفہ دیے تھے۔ عزلت نے آخری بیس سال حیدر آباد میں گذارے اور ۱۶ رجب کو ۱۷۷۵ء/۱۱۸۹ھ میں وفات پائی ان کا مزار میر مومن کے دائرہ میں واقع ہے۔

عزلت کی تصانیف میں دیوان اُردو، راگ مالا، بارہ ماسہ، ساقی نامہ، دیوان فارسی؛ تعلیقات بر حواشی میر زاہد، شطرنج کبیر جدید اور ایک بیاض کا پتہ چلا ہے۔ دیوان اُردو جناب عبدالرزاق قریشی ریسرچ سکالر اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی نے ۱۹۶۲ء میں مرتب کیا تھا جو انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شائع کیا جا چکا ہے۔

شعر گوئی عزلت کو ودیعت الٰہی تھی۔ اُردو، فارسی، ہندی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کی اُردو شاعری کے متعلق بعض تذکرہ نویسوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دہلی کے سخنوروں کی صحبت کی وجہ سے عزلت نے اُردو میں شعر کہنا شروع کیا تھا مگر عزلت کے بارے میں میر کا بیان اس گتھی کو سلجھا دیتا ہے۔ میر کہتے ہیں:

"مشق شعر فارسی ہم کردہ اند اما مزاج اوشان میلان ریختہ بسیار دارد"

شوق اور میر حسن کے ہاں بھی ایسے ہی بیان ملتے ہیں!

"اگرچہ مشق شعر فارسی زیادہ می کرد لیکن مزاج او بہ طرف اشعار ریختہ مائل بسیار بود"

"فارسی ہم می گفت لیکن مائل ریختہ بسیار بود"

تینوں بزرگوں کے بیانات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عزلت کے اُردو کلام کو فارسی کے مقابلہ میں زیادہ پسند کیا گیا۔ اس سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ عزلت نے دہلی میں اپنا پختہ و شگفتہ ریختہ سنایا ہوگا جس کے پیش نظر یہ رائے قائم کی گئی تھی۔ عزلت تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں دہلی گئے تھے۔ دوسرے عزلت ۱۶۹۲ء/۱۱۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور ولی نے ۱۷۰۹ء/۱۱۱۹ھ میں وفات پائی یعنی عزلت کا بچپن اور ولی کا بڑھاپا تھا اور عزلت کی پیدائش کے وقت ولی کا کلام شمال و جنوب میں مقبول ہو چکا تھا لہٰذا اغلب ہے کہ عزلت نے چھوٹی عمر سے ہی اُردو میں شعر کہنا شروع کیا ہوگا۔ الغرض یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ عزلت نے دہلی میں درس ریختہ لیا۔

عزلت کے زمانہ میں ولی جگت گرو مانا جاتا تھا اور غزل گوئی کی دھوم مچی ہوئی تھی لیکن تعجب ہے کہ عزلت نے ولی کے شاعرانہ اجتہاد و کمالِ فن کی طرف اپنی تخلیقات میں ایک آدھ جگہ بھی اشارہ نہیں کیا ہے حالانکہ ان کے کلام سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ عزلت ولی ہی کے خوشہ چینوں میں سے تھے۔ حسن و عشق کی کیفیتوں، ہجر و فراق کی وارداتوں، یاس و حرماں اور مسرت و شادمانی کے اظہار میں عزلت کے ہاں ولی ہی کا انداز پایا جاتا ہے۔ غرض زبان و انداز بیان میں ولی ہی کا تتبع ظاہر ہوتا ہے۔

تجرد

عبداللہ شاہ نام اور تجرد تخلص تھا۔ لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ علوم فارسی کی تکمیل کے بعد حج بیت اللہ کے لئے گئے اور فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد واپسی پر برہانپور گئے جہاں مولوی غلام محمد سے علوم عربی میں درس لیا۔ مولوی صاحب کے انتقال کے بعد تجرد نے سورت میں بود و باش اختیار کرلی۔ ابتدا میں محلہ مغل سرائے میں ملا محمد علی کی مسجد میں قیام کیا اور بعد میں محلہ سید پورہ میں مولوی خوب محمد صاحب کی مسجد میں مستقل اقامت اختیار کرلی۔ ۲۹ ربیع الثانی ۹۲ ۱۷ء/ ۱۲۰۷ھ میں رحلت فرمائی۔ اسی مسجد میں سپرد خاک کئے گئے ہیں۔

تجرد عالم متجر تھے اور شاعر بھی تھے[1] عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ کثرت مطالعہ کی وجہ سے بینائی جاتی رہی تھی مگر طلبہ کو درس دیتے تھے۔ میر نکات الشعرا میں لکھتے ہیں: "سید عبدالولی میگویند کہ شاگرد من است" حدیقۂ احمدی میں بھی انہیں عزلت کا شاگرد بتایا گیا ہے۔

نواب وزیر عماد الملک غازی الدین حج بیت اللہ کو جاتے وقت سورت میں تجرد کی خدمت میں گئے۔ دیکھا کہ ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ غازی الدین نے صائب کا مصرعہ پڑھا۔

خامشی مرتبۂ مہر نبوت دارد

تجرد نے فوراً جواب دیا:

بستہ لب سکۂ فیض ید قدرت دارد

چار چھ شعر سے زیادہ کلام دستیاب نہ ہو سکا ہے۔ سرور کائنات کی مدح میں ذو معنی شعر

---

[1] بیانات بحوالہ تاریخ سورت از ضیا ابیال عیدروس اور حقیقت السورت از عبدالمنعم

کہا ہے جس سے اپنے مرشد بھی مراد ہیں :

آسود مرغ روح بدام محمد است ۔۔۔۔ اے آنکہ من فدائے غلام محمد است

فاضل

شیخ محمد فاضل فاضل تخلص کرتے تھے ۔ فاضل سورت کے مشہور و معروف شاہ سوداگر عمدۃ التجار شیخ حامد کے فرزند ہیں ۔

مرأت احمدی، مرأت سکندری، حدیقۂ احمدی، حقیقت السورت وغیرہ میں اس خاندان کے مفصل حالات مرقوم ہیں ۔ ۱۷۰۱ء/۱۱۱۲ھ میں اپنے والد کے انتقال پر فاضل جانشین ہوئے ۔ ان کے زمانہ میں ان کا تجارتی کاروبار اس قدر ترقی پر تھا کہ عالمگیر کی جانب سے ۴۴ جلوس میں خطاب عمدۃ التجار مع خلعت فاخرہ عطا ہوا اور عہد شاہ عالم بہادر شاہ ۳ جلوس میں ایک لاکھ کے محصول کی معافی کا اعزازی پروانہ ملا تھا ۔ دولت و ثروت کے ساتھ اللہ نے فیاض دل بھی دیا تھا سالانہ ساٹھ ہزار روپیہ بطور زکاۃ ادا کرتے تھے ۔

فاضل عالم اور علوم کے قدردان تھے ۔ انھوں نے تیس لاکھ روپیہ خرچ کر کے چالیس ہزار کتابیں جمع کی تھیں ۔ دنیا کے کسی گوشہ میں اگر کسی نایاب کتاب کا پتہ چلتا تو ان کا کاتب وہاں بھیجا جاتا جو کتاب کی نقل لے کر آتا ۔ فاضل نے تکمیل علوم شیخ زین العابدین احمدی سے کی ۔
فاضل صاحب تصنیف گذرے ہیں ۔ معدن الفضائل، شرح شمائل کتاب نصیحت الصغار، کتاب ہدایت المسکین، حاشیہ در رمز فقہ، کتاب حزب المخزوب شرح دلائل الخیرات وغیرہ ان کی تصانیف ہیں ۔ شاعری سے بھی شغف تھا ۔ عربی، فارسی، ہندی، گجراتی میں اشعار کہتے تھے ۔ افسوس کہ ان کا ایک شعر بھی دستیاب نہیں ہوا ۔

فاضل ۱۷۱۵ء/۱۱۲۸ھ میں زیارت حرمین شریفین کے لئے گئے تھے رسول اکرم نے خواب میں بشارت فرمائی کہ تمہارے لئے خلعت مقرر ہوئی ہے ۔ گجرات میں عطا ہوگی ۔ زیارت سے لوٹنے کے بعد اپنے بیٹوں شیخ سلیمان اور شیخ محمد صدیق کی کتخدائی کے لئے سورت سے تمام جاہ و حشم کے ساتھ احمد آباد جا رہے تھے کہ بتاریخ ۲۴ ذی الحجہ ۱۷۱۶ء/۱۱۲۹ھ بڑودہ کے قریب حیدر قلی خاں منصبدار سورت کے اشارہ پر کولیوں نے حملہ کر دیا ۔ اس موقع پر فاضل نے اپنے دونوں بیٹوں کو فرار کرا دیا اور خود اپنے چار جاں نثار سپاہیوں کے ساتھ شہید ہو گئے ۔ بڑودہ میں تجہیز

تکفین کے بعد نعش احمد آباد سے جائے گئی جہاں بی بی جی کے مقبرہ میں ان کے دادا شیخ عبدالمجید کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ وفات کے وقت فاضل کی عمر صرف پینتالیس ۴۵ سال تھی۔

حیدر قلی خاں کے ساتھ تنازعہ کی وجہ کوئی مذہبی معاملہ تھا۔ (حیدر قلی شیعہ تھا)

مضطر

نام فخرالدین محمد اور تخلص مضطر تھا۔ ان کے والد ملا محمد علی سورت کے شاہ سوداگروں میں سے تھے۔ اس خاندان کو بھی خطاب عمدۃ التجار، خلعت اور ایک لاکھ روپیہ محصول کے معافی کا اعزاز حاصل تھا۔ ملا محمد علی سورت کی مقامی سیاست میں بڑا دخل رکھتے تھے۔ نواب متصدی تیغ بیگ خان سے انہیں بڑی پرخاش تھی۔ اس نے ملا صاحب کو ۱۷۳۳ء/۱۱۴۶ھ میں زہر دیکر مار ڈالا تھا۔ تیغ بیگ خان سے پرخاش ہونے کی وجہ سے مضطر نے سورت میں عافیت نہ دیکھتے ہوئے اپنے مشفق و مہربان آصف جاہ کے دامن میں پناہ لی۔ ۱۷۴۴ء/۱۱۵۷ھ میں تیغ بیگ خان کے انتقال کے بعد حیدرآباد سے سورت لوٹے۔ سورت میں مضطر کی نواب سید اچھن سے چھڑ گئی اور نواب نے انہیں قید کر لیا۔ ان کا ایک دوست کوٹھی دار مسٹر لام (LAMB) اپنے اثر رسوخ سے انہیں رہا کرا لیا اور بمبئی بھیج دیا۔ مضطر نے آصف جاہ کو اس بات کی شکایت لکھ بھیجی تو آصف جاہ نے کنایۃً جواب میں لکھا۔

نہ تو نے گل کیا بلبل نہ تو نے باغباں اپنا	چمن میں کس بھروسے باندھتی ہے آشیاں اپنا

ملا صاحب نے اس کے جواب میں لکھا۔

بلبل بیکس کی گنجائش چمن میں کیوں کہ ہو	ایک تو صیاد تھا اور باغباں دشمن ہوا

مضطر ۱۷۷۹ء/۱۱۹۳ھ میں بمبئی سے سورت آ گئے۔ ۱۷۸۷ء/۱۲۰۲ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ عمدۃ التجار شیخ بہادر نے تاریخ وفات کہی ہے۔

مسمّیٰ بود فخر الدین محمد	ممبئی صاحب اسرار بودہ
عجب خلق حسن با خود داشت	کہ وصف ہر طومار بودہ
بفضل آں کریم بندہ پرور	بہ زیر ابر رحمت بار بودہ
زباے بر شمر تاریخ رحلت	بلبل آل طہ جا زبودہ
۲	۱۲ ، سنہ ۱۲۰۲ھ

کتب خانہ پیر محمد شاہ (احمد آباد) میں دیوان کا مخطوطہ محفوظ ہے۔ اس مخطوطہ کے سرورق شیخ بہادر کی مہر ہے اور اسی صفحہ پر قطعہ تاریخ وفات درج ہے۔ اسی صفحہ پر تاریخ وفات ۱۲ ربیع الثانی ۱۲۰۲ھ بھی درج

ہے۔ دیوان میں ردیف وار غزلیں ہیں۔

اقدس

پیر محمد شاہ متخلص اقدس کا وطن بیجاپور دکن ہے۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ احمد آباد میں گذرا ہے۔ اقدس کا نام سید محمد المعروف بہ پیر محمد اور لقب حبیب اللہ تھا۔ اقدس اور شہید تخلص کرتے تھے۔ والد کا نام شاہ امین الدین اور جد امجد کا نام شاہ علاء الدین تھا۔ حسنی حسینی قادری سید تھے۔ اقدس کے نسب نامہ میں بعض مورخین کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ مولانا سید ابوظفر ندوی مصنف سوانح اقدس نے اس طرح پیش کیا ہے۔

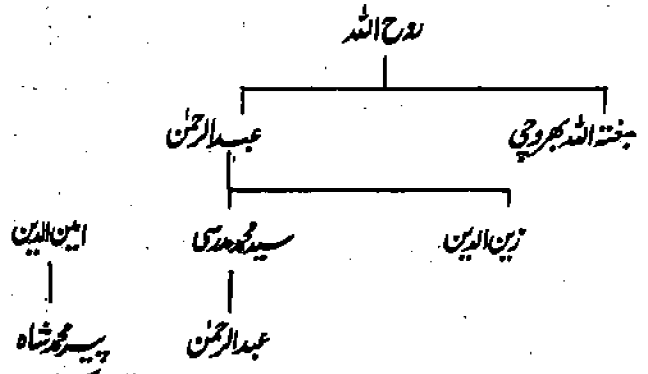

اقدس ۱۵ شعبان ۱۱۰۱ھ مطابق ۱۶۸۹ء میں بمقام بیجاپور پیدا ہوئے۔ اقدس کی ولادت سے پہلے ہی والد کا انتقال ہو چکا تھا لہٰذا سید عبدالرحمٰن کے سایہ عاطفت میں تربیت پائی۔ اقدس نے سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا۔ ۱۱۰۶ھ/۱۶۹۵ء میں بزرگوار نے قادریہ سلسلہ کے ساتھ منسلک کر دیا۔ بچپن ہی میں اقدس سے کرامات ظاہر ہونے لگی تھیں۔ لہٰذا ان کے مرشد نے انہیں نو (۹) سال کی عمر میں مکہ معظمہ جانے کی ہدایت کی۔ مکہ معظمہ میں اکتساب علوم کے بعد ۱۱۲۳ھ میں احمد آباد تشریف لائے۔ اور شہر کے باہر محلہ راجپور بی بی کی مسجد میں قیام کیا۔ وہاں اپنا وقت عبادت اور ریاضت میں گذارتے اور اکثر لوگوں کو ان کے کارخانوں میں اور مکانوں میں جا کر نیک ہدایت دیتے اس کے کچھ عرصہ کے بعد محلہ کالوپور میں معتقدین میں سے ایک شخص کے مکان میں رہنے لگے لیکن یہاں سے بھی بہت جلد چلے گئے اور کچھ مدت شاہ وجیہہ الدین کی خانقاہ میں چلہ کشی کرتے رہے۔ اور بعدۂ احمد آباد کی جامع مسجد (مانک چوک) میں معتکف ہو گئے۔ صرف روزانہ شاہ وجیہ الدین

اقدس سرہٗ کے مزار پر فاتحہ کے لئے جایا کرتے تھے اور واپسی پر موجودہ روضہ پیر محمد شاہ کے قریب ایک بڑھیا کی جھونپڑی کے قریب چند منٹ توقف کرتے۔ بڑھیا اکثر از راہ احترام جھونپڑے کے اندر آنے کے لیے استدعا کرتی تو حضرت ہمیشہ فرماتے کہ انشاءاللہ ہمیشہ کے لئے یہیں قیام کروں گا۔ اقدس کے انتقال کے بعد اسی جگہ دفن کیا گیا۔ رفتہ رفتہ اقدس کے کشف و کرامات کا بہت چرچا ہونے لگا اور شہر کے عمائدین اور حاکم وقت بھی حضرت کے معتقد ہوگئے زندگی کے اخیر دنوں میں اقدس پر وجد طاری ہو گیا تھا اور اس قدر جلال تھا کہ بدن گرمی سے دھکنے لگتا تھا۔ حرارت کی یہ شدت تھی کہ مریدین بار بار اقدس کو غسل دیتے لیکن حرارت کسی طرح کم نہ ہوتی تھی۔ تین روز و شب اقدس کا یہ حال رہا اور آخر ۲۴ جمادی الاول ۱۱۶۳ھ مطابق ۱۷۴۹ء میں بروز دوشنبہ رات کو دس بجے داعی اجل کو لبیک کہا۔ تجہیز و تکفین کے بعد موسیٰ سہاگ کے قبرستان لے جانے کے ارادے سے موجودہ مقبرہ کے پاس نماز جنازہ ادا کی گئی اور اس کے بعد جنازہ اٹھانے کی ہر چند کوشش کی گئی مگر کسی سے نہ اٹھا آخر یہی فیصلہ کیا گیا کہ جہاں اس بڑھیا کی جھونپڑی تھی اسی جگہ دفن کیا جائے۔

اقدس کی زندگی میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا جس کو مصنف مرآت احمدی نے پیش کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ ایک واعظ زین العارفین بن آخوند عبدالعزیز احمد آباد کی سنی بوہرہ جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ جماعت کی تقاریب میں اکثر اسی کے وعظ ہوا کرتے تھے۔ اس نے پیری مریدی کا بھی سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ چند بوہروں کو اس کے طریقے اچھے معلوم نہ ہوئے۔ جماعت میں اس وجہ سے دو خیال کے گروہ بن گئے اور تنازع شروع ہوا۔ اس کے متعلق مرآت احمدی میں مذکور ہے :-

"چون اکثر بوایہر مرید سید گردیدہ و اعتقاد بایشاں آوردہ بودند و زین العارفین پسر آخوند عبدالعزیز بشیوۂ مشیخت اختیار کردہ اکثر بواہیر را مریدی گرفت ایں معنی بر سید و مریدانش بسیار شاق آمد بنا برآں بعض مریدان و معتقدان سید موجب استخراج ایشاں زین العارفین بہ بجبر مبتی تمام کشیدہ آوردہ مچلکہ گرفتند کہ من بعد کسی را مرید نہ گیرم" وغیرہ

ان دونوں کے عقیدت مندوں میں نزع کی صورت پیدا ہوگئی پیر شاہ اس کے ذمہ دار نہیں ہوں گے کیونکہ اقدس پیری مریدی کو بطور دکانداری نہیں کرتے تھے۔ اس جھگڑے نے طول پکڑ لیا تھا اور آخر احمد آباد کے مشائخین نے صلح صفائی کرا دی۔ زین آخوند کے مریدوں نے یہ بات صوبیدار جواں مرد خاں تک پہنچائی جو اقدس سے پرخاش رکھتا تھا۔ جواں مرد نے اقدس کو بلا بھیجا مگر جواں مرد خاں کو اس کے بھائی نے جو اقدس کا مرید تھا سمجھا لیا اور بات آگے بڑھنے نہیں پائی۔

اقدس کا اُردو فارسی کلام کا ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ فارسی میں اقدس اور اُردو میں شہیدا تخلص تھا بعض فارسی کلام میں تراب القدم تخلص ملتا ہے اور بعض جگہ تخلص کی جگہ پورا نام ملتا ہے۔ فارسی میں مجموعۂ رسائل ۲ مکاشفات ۳۔ معمات و غزلیات اور اردو میں رسالۂ عشق اللہ ۲ مجموعۂ غزلیات ۳ مراثی محفوظ ہیں۔ فارسی میں ردیف وار صرف پچیس غزلیں ہیں اور تئیس صحیح ہیں۔ اردو کلام میں عشق اللہ چھوٹی مثنویوں کا مجموعہ ہے اس میں دس سبق ہیں جیسے کسر نفسی، سنگریزے سے سبق خاک سے، سبق آب سے۔ آتش سے، بادِ صبا سے وغیرہ۔ عشق اللہ میں کل چار سو تیس اشعار ہیں۔ غزلوں میں تصوف کے نکات اور پند و نصائح ہیں۔ اور اٹھارہ مرثیے ہیں۔

اقدس کے مزار سے متصل ایک کتب خانہ ہے اس میں اقدس کی تصانیف موجود ہیں۔ اس کتب خانہ میں نادر و نایاب عربی، فارسی اُردو کتابیں ہیں۔ یہی کتب خانہ پیر محمد کتب خانہ کے نام سے مشہور ہے۔

رحمت

حافظ رحمت اللہ احمد آباد کا ایک شاعر ہے۔ اس کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ اس کی مثنوی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ احمد آباد کے ایک ہندو محلہ کھاڈیا میں اس کا مکان تھا۔ اس جگہ ایک مسجد بھی تھی۔ رحمت کا کلام اتنا مقبول تھا کہ تقریباً ہر بیاض میں اس کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ یہ صوفی شاعر تھا اس کا جو کلام دستیاب ہوا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزل سے زیادہ مثنوی اس کا میدان تھا۔ اس کا نظم کیا ہوا مولود نامہ کتب خانہ پیر محمد شاہ میں محفوظ ہے۔ سنہ تصنیف ۱۷۳۹/۱۱۵۲ھ ہے۔ اس کے نعتیہ کلام میں بھی اس دور کی زبان کی ترقی یافتہ شکل نہیں ملتی۔

محمود

شیخ محمود عمدۃ التجار شیخ فاضل شہید کے بیٹے ہیں۔ جس وقت فاضل بڑودہ کے قریب شہید کیے گئے اس وقت شیخ محمود کی عمر سات سال تھی۔ شیخ فاضل کے ایک سپاہی نے انہیں کولیوں کے ہاتھ سے یہ کہہ کر بچا لیا کہ وہ اس کا بچہ ہے۔ اپنے بھائی محمد صدیق متوفی ۱۷۳۳/۱۱۴۶ھ کے بعد محمود جانشین ہوئے۔ ۱۷۷۰/۱۱۸۴ھ میں بتاریخ چار محرم انتقال کیا۔ مزار مرجان شامی کی مسجد میں چبوترے پر ہے۔

شیخ محمود نے تکمیل علم حافظ بہادر سے کی تھی۔ شعر و سخن سے بھی لگاؤ تھا۔ حدیقۂ

احمدی میں ان کا صرف ایک شعر درج ہے۔

بہادر

شیخ غلام حافظ بن عمدۃ التجار شیخ محمود ۱۲ ذی قعد ۱۱۷۲ھ / (جون ۱۷۵۹ء) کو پیدا ہوئے۔ شیخ محمود کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی اس لئے ان کے پیر و مرشد شیخ غلام حافظ نے بچہ کا نام اپنے نام پر رکھا۔ گیارہ سال کی عمر تھی کہ ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بہادر کی صغر سنی کے خیال سے پہلے ہی سے شیخ محمود نے زبدۃ التجار شیخ صالح چلپی کو بہادر کا ولی مقرر کر دیا تھا شیخ صالح شیخ محمود کے انتقال کے بعد ان کی کوٹھی سے بہت مال متاع اپنے ہاں محفوظ رکھنے کے بہانہ سے لے گئے مگر شیخ صالح کے انتقال (۱۷۹۳ء/۱۲۰۸ھ) کے بعد بہادر کو ایک حبہ بھی نہ ملا۔ غلام حافظ بہادر تخلص کرتے تھے۔ اکتساب علم شیخ حسام الدین سے کیا تھا۔ بروز شنبہ رجب ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء کو وفات پائی۔ مزار مسجد مرجان شامی میں ہے۔

تاریخ وفات

عمدۃ التجار شیخ نامدار — شہ بہادر نام آن والا حسب
با سر یاس از پئ تاریخ فوت — گفت ہاتف ہفتم شہر رجب

۱۲۴۵ھ

حامد

شیخ حامد بن شیخ بہادر متخلص بہادر ۲ ذیقعد ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء تا ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء سرکار کمپنی کی جانب سے ضلع سورت میں بعہدۂ امینی خدمت انجام دے کر مستعفی ہو گئے اور یہ منصب اپنے فرزند محی الدین احمد عرف بخشو میاں مصنف حدیقۂ احمدی کو دلوا دیا۔

علوم فارسی میں سید امان اللہ ان کے استاد تھے۔ حدیقۂ احمدی میں مرقوم ہے کہ کبھی کبھی اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ حامد تخلص کرتے تھے۔ ۱۰ شوال المعظم ۱۲۵۵ھ / دسمبر ۱۸۳۹ء میں انتقال کیا۔ مسجد مرجان شامی میں ان کے مزار میں دفن کیا گیا ہے۔

بخشش

شیخ رضی الدین احمد عرف بخشو میاں شیخ حامد کے بیٹے بخشش تخلص کرتے تھے ۔ ان کا شمار عالموں اور مورخوں میں ہے ۔ حدیقۂ احمدی اور حدیقۃ الہند جیسی ضخیم کتب تاریخ و سیر کے مصنف ہیں ۔ مذکورہ تصانیف فارسی میں ہیں اور کئی جلدوں پر مشتمل ہیں ۔ شعر و سخن سے موروثی لگاؤ تھا ۔ اردو گجراتی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ان کے دوستانہ مراسم تھے ۔

بخشش بہت خوش مزاج اور ظریف الطبع شخص تھے ۔ ایک دفعہ منشی عبدالحکیم کمتر مصنف تاریخ سورت نے دوران گفتگو میں بخشش کے حقہ کی چلم کی طرف اشارہ کرکے کہا شیخ صاحب یہ آگ ہے یا پانی ۔ شیخ موصوف نے جواب دیا آگ ہے ۔ کمتر نے اپنی منطق سے اسے پانی ثابت کرنے کی کوشش کی شیخ صاحب نے موقع پاتے ہی چلم کمتر کی داڑھی کی طرف بڑھادی ۔ کمتر چونک کر کہنے لگے جلانا چاہتے ہیں ۔ شیخ صاحب نے کہا پانی کا کام بجھانا ہے ۔

بخشش کے انتقال پر شیفتہ نے تاریخ کہی ہے ۔

بخشو میاں پہ نور جو برسا دم وصال   سال وفات آگیا میرے خیال میں

کریم

نواب سیدی عبدالکریم خان بن سیدی عبدالرحیم خان بن سیدی سرور یاقوت خان زنجیرہ (جزیرہ قریب بمبئی) کے نواب سیدی جوہر کے بھائی تھے ۔ کریم اپنے بھائی سے ناراض ہوکر پیشوا کے پاس گئے ۔ نانا فرنویس نے جھگڑے کا منہ کالا کرنے کی غرض سے کریم کو سورت کے قریب سترہ گاؤں بطور جاگیر دے اور زنجیرہ کی ریاست میں سے اپنا حق اٹھا دینے کو کہا ۔ نواب موصوف ۱۷۰۶ء/ ۱۱۱۸ھ میں سورت آئے اور مقام سچین (قصبہ) کو صدر مقام بناکر ریاست قائم کرلی ۔ شاہ عالم بادشاہ غازی نے انہیں خطاب محمد یاقوت خاں مبارز الدولہ نصرت جنگ عنایت کیا تھا ۔ ۱۸۰۲ء/ ۱۲۱۷ھ میں وفات پائی ۔

موصوف کو شعر و سخن سے شغف تھا ۔ کریم تخلص کرتے تھے ۔ صرف تین شعر دستیاب ہوئے ہیں ۔

محب

نواب سیدی عبدالکریم خاں کریم کے انتقال کے بعد فاتحہ کے روز ان کے ولی عہد سیدی ابراہیم محمد یعقوب خاں کو مسند حکومت پر بٹھایا گیا۔ سیدی عبدالکریم خاں اور محب سید احمد عیدروس کے خاندان میں مرید تھے۔ لہٰذا انھوں نے ایک وصیت نامہ لکھا تھا جس کی رو سے سید احمد عیدروس کے ہاتھ میں ریاست کے کل اختیارات تھے۔ لیکن نواب صاحب نے اپنے احباب کے کہنے سننے پر سید احمد کے ہاتھ سے ریاست کے اختیارات لے لئے تھے۔

نواب صاحب جتنے دریا دل اور فیاض تھے۔ اتنے ہی فضول خرچ بھی تھے۔ اس قدر خرچ کرتے تھے کہ ۱۲۳۵/۶۱۸۱۹ھ میں اپنے ایک فرزند سیدی عبدالرحمن خاں اخلاص کی بسم اللہ کی تقریب پر پچاس ہزار روپے خرچ کر دیئے۔ اسی طرح اپنے بھائیوں کی شادیوں میں بھی کافی خرچ کیا۔ غریب پروری بھی بدرجۂ اتم تھی ۱۲۳۴/۶۱۸۱۸ھ میں ایک جہاز بنوایا اور حرمین شریفین جانے والے حاجیوں کے لئے وقف کر دیا بلکہ خورد و نوش کا بھی انتظام نواب صاحب کی طرف سے کر دیا گیا تھا۔ ایک وقت کا ذکر ہے کہ دو بھائی مراد آباد سے غربت کی وجہ سے گجرات چلے آئے۔ پہلے تو سورت کے نواب صاحب کی خدمت میں نذر دینی چاہی لیکن نواب صاحب کے دیوان نے صاف انکار کر دیا کہ نواب صاحب نذر قبول نہیں کرتے۔ جو ظروف تم نذر کرنا چاہتے ہو کہو تو ان کی قیمت ادا کر دی جائے۔ یہ مایوس ہو گئے۔ لیکن کسی نے ان کو سچین جانے کو کہا۔ یہ وہاں گئے اور باریابی ہوئی۔ ان کی مصیبتوں کی کہانی سنکر فوراً نواب صاحب نے دونوں بھائیوں کے ہاتھوں میں ایک ایک سونے کا کڑا اور ایک ایک گھوڑا اور نقدی دے کر وداع کیا۔

اس فیاضی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں جاگیر کا کچھ حصہ سرکار برطانیہ میں رہن رکھنا پڑا۔ اور ماہانہ خانگی خرچ کے لئے (۱۵۰۰) روپے لیا کرتے۔ ایک تو خود خراچ اور ان کے پچیس لڑکے اور اس سے کچھ کم لڑکیاں یہ سب مل کر ۴۰ آدمیوں کے شاہی خرچ پر نظر رکھنی پڑتی تھی۔ اور اس کے علاوہ سید و میاں اخلاص بھی بہت خراچ تھے۔

نواب صاحب نے قریب سو سال کی عمر پائی تھی۔ ۴ر جمادی الثانی ۱۲۶۹/۶۱۸۵۲ھ کو وفات پائی۔

نواب صاحب کو شعر و شاعری سے بہت شغف تھا۔ محبؔ تخلص کرتے تھے۔ ہر ہفتہ اپنے

محل میں مجلس مشاعرہ منعقد کرتے جس میں سورت کے شعرا حصہ لیا کرتے۔ مشاعرہ کے بعد ناچ رنگ کا سلسلہ رہتا تھا۔

مصنف مخزن شعرا کا بیان ہے کہ یہ صاحب دیوان تھے۔ ایک فارسی اور ایک اُردو دیوان تھا۔ حدیقۃ احمدی میں مرقوم ہے کہ ایک کتاب حکایات فارسی اور یوسف زلیخا کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا اور بدر منیر کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ راقم کی نظر سے مذکورہ تصانیف نہیں گذری ہیں۔

نصیری

نواب میر امین الدین نواب میر کمال الدین کے بیٹے اور نواب میر نور الدین حسین خاں نواب بڑودہ کے پوتے ہیں۔ نواب موصوف نہایت متقی و پرہیزگار اور خوش خلق انسان تھے۔ تصوف کی طرف بہت زیادہ رجحان تھا۔ حضرت غلام نصیر الدین عرف کالے میاں کے عقیدتمندوں میں سے تھے۔ عمر بھر حصول علوم دینی میں مشغول رہے۔ اپنے والد میر کمال الدین کے انتقال کے بعد نصیری جانشین مقرر ہوئے اور ۲۶ سال کے بعد بعمر ۴۹ سال ۸ رجب کو ۱۲۵۳ھ بمقام بڑودہ انتقال کیا۔ نواب موصوف کی نصیحت کے مطابق انہیں بڑودہ میں کیمپ کے قریب حمید پور باغ میں دفن کیا گیا ہے۔

نواب صاحب نے کئی شادیاں کیں اور اولادیں بھی بہت ہوئیں لیکن نواب صاحب کی زندگی ہی میں سب بچوں کا انتقال ہوگیا، لہذا میر امیر الدین کے بعد ان کے بھائی نواب میر حسام الدین جانشین قرار پائے اور سرکار گائیکواڑ کی جملہ داری ان کے نام پر منتقل ہوگئی۔

نواب امین الدین اچھے خوش نویس تھے انہیں شاعری سے بھی شغف تھا۔ اپنے پیر و مرشد غلام نصیر الدین کے نام مبارک کی مناسبت سے نصیری تخلص کرتے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

صاحب

نواب رفیع الدولہ بیگ معروف بہ نواب حامد بیگ مرزا محمد بیگ نواب بھروچ کے بیٹے تھے۔ چودہ سال مسند حکومت پر متمکن رہے اور ۴ جمادی الاول ۶۷،۶۱. ۱۱۸۱ھ میں وفات پائی۔ موصوف علم دوست تھے۔ شعر گوئی سے بھی شغف تھا۔

ضاحک

مرزا احید الدین خان نواب امتیاز الدولہ معز خان کے بیٹے تھے۔ ریاست بھروچ ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اپنے والد کے ساتھ بمبئی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ سرکار انگریزی سے وظیفہ مقرر تھا۔ ۱۸۳۲ء/۱۲۴۸ھ کے لگ بھگ انتقال کیا۔ فائق کا بیان ہے کہ صاحب دیوان تھے۔

لطیف

منشی لطف اللہ بن محمد اکرم فریدی شاہ کمال مالوی کی اولاد سے تھے۔ لطف اللہ ۱۸۰۲ء میں بمقام دھار پیدا ہوئے اور ۱۸۳۳ء کے بعد سے سورت میں مستقل اقامت اختیار کرلی تھی۔ لطف اللہ سورت کی غیر معمولی شخصیتوں میں سے تھے۔ انہیں عربی، فارسی، انگریزی، ہندی، گجراتی، مرہٹی، سندھی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ان کے حالات زندگی نہایت دلچسپ ہیں (دیکھیے ضمیمہ ۱)

لطف اللہ اردو فارسی میں شعر کہتے تھے افسوس کہ ان کے صرف دو شعر دستیاب ہوئے ہیں۔ اردو نثر میں بھی ان کے دو رسالے ملتے ہیں۔ انگریزی زبان میں لطف اللہ نے اپنی سوانح عمری لکھی ہے۔

کمتر

منشی عبدالحکیم بن شیخ عبدالوہاب بن شیخ عبدالغنی عباسی کمتر اور غریب تخلص کرتے تھے۔ ان کا شمار سورت کے عالموں میں تھا۔ کچھ مدت حضرت سید میاں صاحب کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ اس کے بعد اپنے خسر قاضی غلام علی قاضی سورت سے حدیث، تفسیر، فقہ وغیرہ کی تعلیم لی۔ ملا فیاض محمد المعروف ملا بادشاہ کابلی کا بھی فیض صحبت اٹھایا تھا۔ ۱۸۴۰ء/۱۲۵۶ھ میں سندِ فضیلت حاصل کی تھی۔ خوش نویسی میں ان کے استاد حکیم اکمل خان خوش نویس تھے۔ شہزادہ مرزا کام بخش نے سورت میں تشریف آوری پر کمتر کی خوشخطی کو بہت پسند کیا اور انہیں زریں رقم کا خطاب دیا تھا۔ صاحب مخزن شعرا لکھتے ہیں کہ کمتر منشی کے لقب سے مشہور تھے قبر میں یہ حسرت لے گئے کہ انہیں مولوی کہا جائے۔

ان کی تصانیف میں تذکرۃ الصالحین (حالات اولیائے سورت) اور تاریخ سورت کا پتہ چلتا ہے۔ مرتب حقیقت السورت کا بیان ہے کہ کمتر کو تاریخ گوئی میں مہارت حاصل تھی۔

بتاریخ ۱۶ جمادی الثانی ۱۲۷۵ھ مطابق جنوری ۱۸۵۹ء کمتر نے انتقال کیا۔ مسجد حافظ بقا بیگ میں دفن کیا گیا ہے۔ کمتر کے دو بیٹے تھے ایک رضی الدین اختر اور دوسرے غلام محی الدین عرف چھوٹو میاں۔

عباس

سید عباس علی عباس بھروچ کے سادات گھرانے سے تھے۔ نواب امتیاز الدولہ معز خاں کی سرکار میں میر منشی تھے۔ عباس نے ایک مثنوی نظم کی ہے جس میں نواب موصوف اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی جنگ اور بعدہٗ انگریزوں کا بھروچ پر قبض و تصرف مفصل بیان کیا ہے۔ اس مثنوی کا تاریخی نام جنگ غمگین ہے جس سے سنہ ۱۱۹۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ (۱۷۷۹ء)

شرفو

شرفو تخلص تھا۔ نام معلوم نہ ہوسکا۔ سورت کے چابک سواروں میں سے تھے مختلف بیاضوں میں ان کا کلام ملتا ہے۔ مخزن شعرا نے صرف ایک شعر دیا ہے۔

لطیف

نام میر شمس الدین اور تخلص لطیف تھا۔ سورت کے سادات سے تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ لطیف نے لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ شیفتہ نے ان کا ایک شعر دیا ہے۔

مندرجہ ذیل شعرا بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں:

(۱) بدرالدین بیتاب (بھروچی) (۲) شیخ وحید الدین وحید (احمد آبادی) (۳) سید درویش علی درویش (سورتی) (۴) میر احمد اللہ احمد (بھروچی) (۵) سید احمد نور اللہ احمد (احمد آبادی) (۶) حکیم شمس الدین شمس (سورتی) (۷) ارشاد علی اضعف (سورتی) (۸) مرزا محمود بیگ طالب (بھروچی) (۹) سید امین اللہ بخاری نادر (رانسوٹ) (۱۰) صوفی (احمد آبادی) (۱۱) شہید (۱۲) مائل (۱۳) وحشت

(۱۴) بیہوش (۱۵) مرہون (۱۶) ذاکر (۱۷) دلکش

حوالے

۱۔ عزلت کے مزار کی نشاندہی علاقہ مغل سرائے کی مسجد پٹوا میں کی جاتی ہے۔ اس مسجد کے پہلو میں ایک مکان ہے جو عزلت کا مکان بتایا جاتا ہے۔

۱۔ الف: بارہ ماسہ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ریسرچ اسسٹنٹ جناب عبدالرزاق قریشی نے مرتب کیا ہے۔
جو ۱۹۷۲ء میں شائع کیا جا چکا ہے۔

۲۔ تجرد نے اپنے مرشد کی ناخوشی کی وجہ سے شعر گوئی ترک کر دی تھی۔

۳۔ ضمیمہ ۱ عمدۃ التجار شیخ فاضل کا خاندان

۴۔ " ملا خاندان

۵۔ حالات اقدس۔ مرتبہ سید ابوظفر ندوی

۶۔ ضمیمہ ۱ نواب سچین کا خاندان

۷۔ " " نواب بڑودہ کا خاندان

۸۔ " " بھروچ کا نواب خاندان

۹۔ " " " " " " "

۱۰۔ مملوکہ راقم

نمونہ کلام

عزلت

بتوں کا جور دیوانہ دوا کر ماننا ہے گا
کہ پتھروں کو وہ صندل درد سر کا جاننا ہے گا

بگولا بن کے راہ بے ستوں میں کوہ کن اب لگ
سم گل گوں کی مانی بات مل مل چھاننا ہے گا

سیہ روزی میں میری قدر کو احباب کیا جانیں
اندھیری رات میں کس کو کوئی پہچاننا ہے گا

بنادے ارگجا ہی فاتحے کو ہوش کی میرے
جنون خون جگر میں گرد دل کو ساننا ہے گا

مجھے چاہے کہ پتھر مارے جب دشنام سنگیں کا
قلیل ابرو کی عزلت کس مزے سے تاننا ہے گا

(آج بھی گجرات میں ہے گا بولا جاتا ہے) ساننا۔ ملانا۔ چپکانا۔ گوندھنا)

آج دل بے قرار ہے میرا
کس کے پہلو میں یار ہے میرا

کیوں نہ عشاق پر ہووں منصور
جوں سپند آہ وار ہے میرا

بیقرار اس کا ہوں گا حشر میں بھی
یہی اوس سے قرار ہے میرا

رنگ زرد اور سرشک سرخ تو دیکھ
کیا خزاں نہ بہار ہے میرا

میرے قاتل کے کف حنائی نہیں
مشت خوں یادگار ہے میرا

کھول کر قبر دیکھ مست جنوں
کہ کفن تار تار ہے میرا

آتے جاتے مگر تو ٹھکرا دے
تیرے در پر مزار ہے میرا

آنکھ موندے ہے میری خاک سے بھی
یاں تک اوس کو غبار ہے میرا

جیتے رہو کیوں ہوئے رقیب کے ہار
یہی سینے میں خار ہے میرا

تیرے کوچے کے سگ کی پابوسی
باعث افتخار ہے میرا

بندۂ یار عزلتِ مرحوم
نقش لوح مزار ہے میرا

مجھے بیگانے ہو کر اوروں سے الفت یار تم　　دل میرا توڑے ہور کھ کر خاطر اغیار تم
دل کو ٹکڑے کر جدائی سے مکدر مت کرو　　ٹوٹے درپن پر لگاتے ہو عبث زنگار تم
بے دھنواں آٹھتا تمہارے قد کی دھن میں مغز کر　　کیا اوگاؤگے زیادہ میرے سر پر جھاڑ تم
پھیر کر منہ ہم سے کہتے ہو بلاتا ہوں تمہیں　　ہائے مت باتیں بناؤ ہم سے ہو بیزار تم
غیر جب مجسا بنایا ہیگا کروں گا میں سلام　　اب دعا گو یوں کو دے لو گالیاں لدار تم
رکھیو ٹک باد خزاں آہ عزلت کی خبر
ہو رہو گنتی دل اوروں کے گلے کا ہار تم

جوں صبا منہ لگ کے گل سو گرم جوشی کر گئی　　بلبل آہ سرد بھرتی آشیاں میں مر گئی
کیا جلن سینے میں ہے میرے کہ جوں ل پر رکھا　　ہات دلبر کا خالی ہو کے کو منی ؟ بر گئی
خاکساری اور میرے رونے سوں تو بھاگے ہے کیوں　　اس گلابی سے زہ دامن میری کب بھر گئی
کیا کسی دل سنگ پر ماری تھی بھوں پر چین آج　　کاٹتی نہیں دل کو دھار، اس تیغ کی جوہر گئی
نا قبولی سے وہ نو خط کی گلی سے عزلت آہ
آہ میری جوں بگھولا خاک سر پر کر گئی

میری تلافی اتنی ہی تجھسے خدا کرے　　آئینہ رو کوئی تجھے تجھسے جدا کرے
جو دل نہ دے کسی کو وہ کیا دم گنا کرے　　بے عشق دل وہ عمر کے خالی بھرا کرے
اے بلبل اتنی رو کے دعا ہر سحر تو مانگ　　حق تیری آہ سرد چمن کی صبا کرے
اے تلخ گو تیرے لب شیریں میں سحر ہے　　تو جس کو گالی دیدے وہ تجکو دعا کرے
مرنا بھلا، لحد بھلی محشر کی صلح ہے　　بے درد سے کسی کو نہ حق آشنا کرے
عزلت سیہ نصیب کا روشن ہوئے چراغ
ہات آوے شب وہ زلف کی سوں خدا کرے

بندے ہیں تیری چھب کے مہ سی جمال والے　　سب کالی سے گال والے، سنبل سے بال والے
سیدھی ادا بھی چھوڑے گئے داغ ہو چھبیلے　　اے ٹیڑھی چال والے، ٹھوڑی کی خال والے

مست ہو تو نیلا پیلا، بخت بیہ کرا جلی — اے الفی شال والے، بھگوے رمال والے
کر سرمہ خاکساری دل کی نین سے دیکھا — جل گئے وہ حال والے رہ گئے ہیں قال والے
پھولوں میں پی جو نکلے تب آبپاشی کرنے — رنگ و روال والے ہوویں پکھال والے

عزلت کی آہوں آگے تیری نگاہوں آگے
— کیا شعلے جھال والے کیا نیزے بھال والے

(نیلا پیلا ہونا، غصہ ہونا۔ پکھال والے، بہشتی۔ جھال والے، آنچ والے۔ نیزے بھال والے، لڑنے والے)

بستر خاک میں آسودگی عالی دیکھی — ورنہ شطرنجی و قالی و نہالی دیکھی
بخدا طور بتاں میں نے نرالی دیکھی — جب میرا رنگ اڑا چہروں پہ لالی دیکھی
آشیاں میرا جلاوے ہے جو عشق گل سے — تیری غیرت کو میں گل چیں پہ آ مالی دیکھی

کنج قفس میں فصل جنوں کی گذر گئی — معلوم نہیں بہار کب آئی کدھر گئی
کب گرد باغ لے کے نسیم سحر گئی — بلبل کی آہ خاک چمن سر پہ کر گئی

(نقل از دیوان عزلت۔ قریشی)

دو رنگی سے وہ نافرماں کی دل لالا سا خوں ہو کر
ہوا ہے داغ لیکن ہنس رہا ہے زہر خندی سے

(نافرمان، پھول کی ایک قسم ہے۔ ولی نے بھی لالا اور نافرمان کی رعایت سے کئی شعر کہے ہیں)

تجرد

اس رو میں لطف ہے سو ملک کو خبر نہیں — خورشید کیا ہے اس کی فلک کو خبر نہیں
کیا آج ان لبوں کی ملاحت بیان کروں — عالم میں شور ہے کہ نمک کو خبر نہیں
ویراں کیا ہے فوج تغافل نے ملک دل — اب لگ تیری نگاہ کی (؟) کو خبر نہیں

آنکھوں سوں دل میں آج تجرد خیال یار
آیا ہے اس طرح کہ پلک کو خبر نہیں

(مخزن چمنستان)

مضطر

صنم مجکوں بلا خلوت میں اپنا رازداں کرتا — ہر ایک عاشق سوں میں بھی اس کی ہمت کا بیاں کرتا
اگر وہ کچھ بھی دستاویز کر دیتا حکومت کی — بجائے باغباں گل کا بلبل پاسباں کرتا
اگر وہ شمع بھی پروانہ کو ہوتی مہر کی الفت — تو شمع اس کے بھی جلنے ایک دم پر کچھ گماں کرتا
بحث لیلیٰ کی خاطر ہو گیا مجنون صحرا میں — اگر وہ مجھ سے مل جاتا تو میں اس کی نشاں کرتا

فغاں بس کام رکھتی ہے گی یارو کیا کہوں تم سے
اگر لذت نہیں ہوتی تو کیوں مضطر فغاں کرتا

گل چین چمن کو دیکھ کے حیران رہ گیا — بلبل کو گل سے ملنے کا ارمان رہ گیا
اس دن کی باغباں کو ہرگز نہ تھی خبر — آخر کو کیا ہوا کے پشیمان رہ گیا
دیکھا کہ جان جان کو لیتا ہے جان بوجھ — میں جان دیکھ جان کو انجان رہ گیا
پروانہ اور شمع کی کیا کیا تھی رات دھوم — فانوس بجھ کے صبح شمع دان گیا

قطعہ بند

مضطر یہی ہے دنیا کا سب بود و باش عیش
دونوں تو جل کے مر گئے سامان رہ گیا

قالب اپنے کوں پہلے صاف کرو — کعبہ دل کا تب طواف کرو
پارسا آپ کو کہا کرتے ہو — چپ رہو اس قدر نہ لاف کرو
رات پڑھ کر نماز معکوسی — ورد اوراد لام کاف کرو
دل کے تئیں پھر کتاب وعظ کہو — ان کتابوں کے تئیں غلاف کرو

زہد اپنا جتا ذرا مت ہم کو
ہوں میں مضطر مجھے معاف کرو

(مخطوطہ کتب خانہ پیر محمد شاہ)

اقدس

نمونہ از غزلیات

کچھ سکھ نہیں دنیا میں دنیا سوں اب جانا بھلا — دو روز کی دنیا میں جینے سے ہے مرنا بھلا
دنیا بھرا سر نیند ہے آرام جوں سپنا تمن — سپنے کے فانی عیش پر ہنستے سیں ہر رونا بھلا
دنیا کے سیر میں تجھ کہوں دنیا خیال و خواب ہے — جگ خواب ہے اس خواب کی تعبیر حق کہنا بھلا

دیکھو سکھی جگ ہے پیا جگ میں پیا دستا ہی خوب — ایک تخم جوں گلزار میں ہر پھول میں ہنستا ہی خوب
اپنے اوپر رونا پیا ا نجھو بھی لائق..... میرا — جوں شمع جلتا موم میں اپنے اوپر روتا ہے خوب
سارا ہے جگ لالن اپن جوں پھول سارا باس ہے — اقدس کہے تو نور سب دیوا کر جو جلتا ہے خوب

تیرا عشق مجھ کوں ہے آب حیات — نہ آوے مجھے موت تیرے سنگات
محبت کی شطرنج مرے ساتھ کھیل — مجھے شہ تمے دے گئے ہیں کہ مات
تیرے بن ہوا ہوں ضعیف اس قدر — اڑا دے مجھے باد جوں گھاس پات

تیرے عشق میں لاگی ہے چوٹ — اسی چوٹ سیں میں ہوا لوٹ پوٹ

میں حسرت بھرا ہوں تو شیریں مری — تیرے بن ہزاروں قرن ایک گھڑی

(نقل از مطبوعہ بہ گجراتی رسم خط)

رحمت

تجرید کوں دلوں سوں کی اختیار ہم نے — اب خلق کے خلق سوں پکڑا کنار ہم نے
ٹوٹی سی جھونپڑی میں محفوظ ہیں ہمیشہ — رخصت کیا قبیلہ ہور بھائی بار ہم نے
کتنے حصیر اوپر اب اکتفا کیا ہے — چھوڑے پلنگ. اب تو خوش پینوار ہم نے
تسبیح کر وفن کی ہم توڑ لے عزیزاں — بیٹھے دکتا، ہوکر ڈھلایا پہاڑ ہم نے

دل میں ہے یاد ہو کی رحمت عقب سے گذر کے کی ترک ذکر جنت ہور فکر نار ہم نے

مدح رسول اکرم

اول اسم تمہارا لیوں اور ابتدا محمدؐ تمناں کے نام اوپر دل جان فدا محمدؐ
کیوں کر صفت تمہاری میں کہہ سکوں یا ں سیں تم پر درود بھیجتے آپیں خدا محمدؐ
جس رات کوں تولد مسکن میں تم ہوئے تھے اس وقت بت مکاں سیں ہو گئے جدا محمدؐ
اسلام کوں تمہارے رب نے کیا ہے روشن ہے دین اب تمہارا قائم سدا محمدؐ
اول جماعت کیتی تم نے حرم میں جاکر سارے صحابیوں نے کی اقتدا محمدؐ
فرقان کتاب تم پر نازل کیتی خدا نے یا ایہا المزمل آئی ندا محمدؐ
کیا مرتبہ تموں کوں رب نے دیا ہے اعلیٰ دو ٹکڑے ہو حکم پر آیا چندا محمدؐ
قائم بھی ہو کر رب کی طرف سیں آئے سب کو دکھائی تمنے راہ ہدیٰ محمدؐ
جگ میں ہوئی قیامت اس دن کہوں کو بیشک جس دن ہوئے خلق سیں تم الوداع محمدؐ

رحمت رسول کر خدا نے بھیجے جہاں میں تمکوں
ساری مدح تمہاری کیوں ہوئے ادا محمدؐ

چل جانب مدینہ مولیٰ کو یاد کرکر احمد کا شوق دل میں اب اختیار کرکر
روضہ کے جا مقابل ہمت جوڑ کر کھڑا رہ صلوا علی محمد کہہ توں پکار کرکر
یا ایہا المزمل تم پاس ایک عرض ہے جنت میں تم لیجائیو مجکوں پیار کرکر
تمنا کا شوق رکھ کر نکلا تھا میں شہر سے آرام کو ترک رنج اختیار کرکر
اے رحمت اللہ پوچھو بات ہے ادب کی پھرنا ہے تجھ شتابی باتیں دو چار کرکر
قیامت ہو گی خورشید نیزہ پر کھڑا ہو گا زمین تانبے کی ہو گی آسماں فولاد کا ہو گا
زمین مشرق سے تا مغرب برابر صاف ہووےگی ستارے ٹوٹ جاویں گے زمین کو زلزلہ ہو گا
خدا جس وقت کرسی پر عدل کی بیٹھے گا اسدم بدوں کو بد سزا ہو گی بھلوں کا تو بھلا ہو گا
گنہگاروں کو دوزخ میں فرشتے کھینچے لیجاکر کریں گے مبتلائے رنج و غم ان پر بنا ہو گا

خبر جس وقت آنحضرت کو ہو دیگی دوڑ آ دیں گے — اسی دم اے عزیز دیکھئے فضل خدا ہوگا

دیکھئے یعنی دیکھنا اب تک احمد آباد میں عام طور پر بولا جاتا ہے ۔ جیسے "اچھا آنا" کو کہیں گے — اے آیئے" سورت میں اسی کو "اچھا آیو" بولتے ہیں۔

عذاب نار دوزخ کا نہ کچھ دل پہ غم حافظ — ترا حامی ترا رہبر محمدؐ مصطفٰے ہوگا

(حافظ رحمت اللہ)

مولودنامے کی حکایت دوم کے آخری اشعار :-

اگر ایک شخص تھا سو بغداد میں — ہے لاکھوں ایسے احمد آباد میں
کہ تحقیق ولیوں کا یہ شہر ہے — نبیؐ کی محبت کا یہی بحر ہے
کہ ہے شہر گجرات دار العلم — کہیں عالماں جوں جھاڑ العلم
ہیں کئی مرد و عورت نبیؐ پر فدا — ذکر ان کا ہے احمد اسیدا
کہ مولود کرتے ہیں دل جان سوں — وہ تعظیم دیتے ہیں تہاں کوں
خصوصاً کہ مسجد ہے در کھاڑیہ — یہ چشمہ ہے اس جاگ میں جاریہ
گویا بارہ دن تئیں وہاں عید ہے — کہ مجلس کے اوپر عجب بید ہے
کہ روح مبارک وہاں ہے گذر — نہ مانے سو آکر کرے اک نظر
ہے اعمال سنت نہیں واں رسوم — اسی جاگ میں ہے میرا زاد و بوم
وہ صحبت نے مجھ میں کیا ہے اثر — کہوں ہندی مولود خیر البشر
پیچھے میں عقل کا چلایا فرس — صدی بارھویں تھے باون برس

سنہ ہجری ۱۱۵۲ھ

کہ منزل کو پہنچا بفضل الٰہ — دیگر فضل رسالت پناہ
علم زیچ حق نے دیا مجھ کوں سیر — رجا یہ کہ اب خاتمہ پاؤں خیر
یہ مولود کہ رحمتہ اللہ تمام — ذکر میں سنو مشغول اب صبح و شام

(مولود نامہ بیاض وغیرہ)

محمود (عمدۃ التجار)

محمود تجھ میں وستا پورا بہر وفا کا — ہے کیا عجب جو بھاوے تو موکے اس نہر کا

(حدیقہ)

بہادر (عمدۃ التجار)

ہیں نجومی حساب میں حیراں   جب سے پایا ہے زیب وہ در گوش
عقلمند ہم بہت کہاتے ہیں   اس جگہ میں گیا ہمارا ہوش

آہ ظالم نے کیوں نکالا خط   کیا میری شاہدی نہ تھی منظور
(مخزن ۔ حدیقہ)

حامد (عمدۃ التجار)

مانگ اس کی تو مان مانگے ہے   دل کو لیکر یہ جان مانگے ہے وہاں ماہ جاں
ابرو کرتی ہے ہمسری اس کی   رو برو اب کمان مانگے ہے
کج ادائیں یہ دیکھ کر اس کی   خلق سب الامان مانگے ہے

کان میں جب سے وہ دلدار نے بالا ڈالا   چرخ پر اشک سی ہر ماہ نے ہالا ڈالا

خوباں کے رہگذر سی یہاں لالہ زار ہے   ہر ہر نگاہ شوخ سے یہ پھول ہار ہے

ذائقہ اس لب شیریں کا جو فرہاد چکھے   یہ تلافی ہے کہ جوں تیشۂ فولاد چکھے
(حدیقہ۔ تاثر گجرات۔ مخزن)

بخشش (بخشو میاں)

تاثیر تیرے عشق نے مجھ پر ذری نہ کی   میں کیا کروں نصیب نے کچھ یاوری نہ کی
دلبر کہ جس کے دل کو لیا اس کے ہاتھ میں   دل لے لیا ہمارا وے دلبری نہ کی
اے رشک مشتری تیری خوبی کے سامنے   خورشید نے بھی کچھ تیری ہمسری نہ کی
نزدیک تھا کہ پہنچے سکندر لب حیات   اے خضر وہاں تلک بھلا کیوں رہبری نہ کی

بخشش کے پاس گوہر دل تھا بساط میں ۔۔ قیمت اسی کی تو نے کچھ اے جوہری نہ کی

اس رشتۂ الفت میں یکسوئی کا عالم ہے ۔۔ ہر چاک گریباں کو کب تک ہی سیا کرنا

وعدۂ وصل سے غیروں کے تو دل شاد کیے ۔۔ ہاں مگر اک دل بخشش کا جلانا جانا

زبان خامہ الفت کی ہو گئی گونگی ۔۔ وگرنہ ایک گلے کے سو جواب لکھتے ہم

کیا کام ہمیں چتر سے اور ظل ہما سے ۔۔ دونوں سے ہے خوشتر تری دیوار کا سایہ

عہد پر اپنے دلربا نہ رہا ۔۔ نہ رہا پر وہ بے وفا نہ رہا

نہ دل کو تاب نے تن میں تواں ہے ۔۔ فقط اک دم سو دم کا میہماں ہے

گمان عشق سے چھٹ کر لگے ہزاروں تیر ۔۔ جب اس کی ابرو و مژگاں کے سامنے کھچا

(مخزن)

کریم

یار دیکھو مرا شرابی ہے ۔۔ آنکھ اس کی عجب گلابی ہے
چشم مست اس کی دیکھ کر عاشق ۔۔ کہتے ہیں آج پھر خرابی ہے
اے کریم اوس کی روشنی میں ترا ۔۔ شعر و مضمون انتخابی ہے

(مخزن)

محب

بارہا سلسلۂ زلف دراز آتا ہے ۔۔ مژدہ اے دل کہ وہ دیوانہ نواز آتا ہے

سیدی ابراہیم خاں کو اور کچھ ارماں نہیں ۔۔ ایک بوسہ دے مجھے اس لب رخسار کا

(حدیقہ، مخزن)

انصری

ہائے یہ گردش طالع کہ شب اس محفل میں — پہنچی نوبت جو ہماری تو سبو ٹوٹ گیا

(مخزن)

صاحب

آہ معلوم نہیں ساتھ کے اپنے شب و روز — لوگ جاتے ہیں سو یہ لوگ کہاں جاتے ہیں

(کہاں کو کاں پڑھیے) (مخزن)

ضاحک

نرگسی چشم کا بیمار ہوں کن کا! ان کا — تشنۂ شربت دیدار ہوں کن کا! ان کا

بھلا امید ہے ضاحک کو بہانہ مت کر — میرے زخموں کو ترے دل سے ملا جا آجا

(مخزن)

شرفو

کہلایا دین و رسول میں یا نہ کیتی دینداری میں — گئی ساری عمر کھویا ہوں پھر شیطاں کی یاری میں
گنہگاروں کو دنیا میں ہوا ہوں اب تو خواری میں — جناب فیض میں آیا، آپ کرتا ہوں جاری میں
محمد یا رسول اللہ ہماری تم شرم رکھیو

تمہارے شوق میں حضرت اگر روح قفس ہو جاوے — تمہارا فضل و کرم کر کر، وہی ساعت یہ دکھلاوے
قسم ہے حق تعالیٰ کی مری امید بر آوے — کہ جس ساعت میں آخر دم سو میرا آبرو پاوے
محمد یا رسول اللہ ہماری تم شرم رکھیو

عرض کرتا ہے شرفو تمہارا یا رسول اللہ — بچاؤ کل بلاؤں سیں مجھے برائے عند اللہ
شفیع المذنبین یہ صدق سیں کہتے ہیں ہم واللہ — رہو تم ہم سیتی راضی تو جب راضی ہے اللہ
محمد یا رسول اللہ ہماری تم شرم رکھیو

عباس

جس جگہ حسن کا بازار ترا ہووے گرم — یوسف مصر کا کوئی خریدار نہ ہو

جس مصور نے یہ صورت کو سنوارا ہوگا — نور مہتاب کو سِل کرکے چتارا ہوگا
آج وہ مہر جبیں مہر سے جھکا سر آیا — طالع عباس کا کیا نیک ستارا ہوگا

(مخزن)

لطف

خانہ میں عصافیر کے ہے مرغ چھپے ہے — جب کھینچے ہیں ہم تیر کو آہ سحری کے
سرسبزیاں ہے ترے دیدہ سے — یہ لطف تصدق ہے تری چشم تری کے

(مخزن)

کمتر

فلک پہ کیسی گذرتی مسیح کی ہوگی — کہ غیر جنس میں یارب کوئی غریب ہو
یہ طفل اشک بہک جاکے راز دل کہدیں — گراں کے سر پہ میری آہ کا ادیب نہ ہو

(مخزن)

لطیف

گھر میں جا بیٹھ رہا اس سے خفا ہو تو لطیف
کیا ہی غصہ تری اس بات پہ آتا ہے مجھے

(مخزن)

تبصرہ

۱۷۰۰ تا ۱۸۵۰

۱۱۱۲ تا ۱۲۶۷

اٹھارہویں صدی ملک کے لئے بہت منحوس تھی۔ انحطاط اپنے شباب پر تھا۔ انسانیت کا جوہر عنقا تھا۔ امراء کی خود غرضیوں اور اخلاقی پستی کی وجہ سے نہ حاکم محفوظ تھے نہ محکوم چین کا سانس لے سکتے تھے۔ میر نے اس حالت کی ترجمانی اس طرح کی ہے۔

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت و تاج کا

میر و مرزا کے دور کی ہجویں اور شہر آشوب اس دور کی بدحالی کے غماز ہیں۔ 'دہ مجلس' کے ترجمے کا عوامی تقاضا بھی اس دور کے ایک تصور کا پتہ دیتا ہے۔

سماجی تنزل کی سب سے بڑی علامت علوم و فنون کی ناقدری ہوتی ہے۔ عزلت نے اپنے زمانہ کی شکایت اس طرح کی ہے۔

اس زمانہ میں بزرگی سفلگی کا نام ہے — جس کی تکیا میں پھرے انگلی سو ہو جاوے ترا
چرخ ابلیس نے سب دل کئے جوں گندم چاک — آدمیت کا زمانہ میں کچھ اسلوب نہیں
بے قدری سے روشن دل اگر داغ نہ ہوے — ہرگز کسی آئینہ پہ زنگار نہ ہوتا
سنتا تھا میں کہ دکن کو وہ آدمیت ہے — جو دیکھوں جا کے تو تھروں کی آدمیت تھی
کچھ غرور کا جوہر نہیں خود فہمی میں حیراں ہوں — اس عصر کے فاضل سب سطحی ہیں جوں آئینہ

گجرات کے بعض امراء نے اپنے زمانہ کی بدحالی سے متاثر ہو کر اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

جوں صبا منہ تنگ کے گل سے گرم جوشی کر گئی — بلبل آہ سرد بھرتی آشیا میں مر گئی

وائے یہ گردش طالع کہ شب اس محفل میں — پہنچی نوبت جو ہماری تو سبو ٹوٹ گیا
(نصیری)

پروانہ اور شمع کی کیا کیا تھی رات دھوم   فانوس بجھ کے صبح شمع دان رہ گیا

ق

مضطر یہی ہے دنیا کا سب بود باش عیش   دونوں تو جل کے مر گئے سامان رہ گیا

مضطر (سورت)

اُردو ادب اس دور خلفشار و تنزل کا آئینہ دار ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک حالات بد سے بدتر ہی ہوتے گئے۔ ڈیڑھ سو سال کی مدت میں اُردو ادب پر ادبی نقطہ نظر سے تین دور گذر گئے۔ شاعری کے پیش نظر یہ تین دور میر و مرزا، انشاء و جرأت، آتش و ناسخ کے ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان ادوار میں سیاسی سماجی، اقتصادی حالات کی بنا پر ادب میں رجحانات اور تصورات میں تغیر پیدا ہوا۔ انہیں ادوار میں اُردو ادب اپنے تعمیری دور سے گذرا ہے اس لئے اس دور کے ادبی رجحانات بھی بہت نمایاں طور پر رونما ہوئے۔ ولی شمال میں استاد کا درجہ رکھتا تھا لیکن اس کے بعد اُردو ادب کا مرکز شمال میں منتقل ہو گیا اور وہاں خدایان سخن پیدا ہو گئے لہٰذا میر و مرزا کے دور سے شمال کو استاد ہونے کا فخر حاصل ہو گیا اور اس عہد سے گجرات و دکن کے شعرا شمال میں فرمایا ہوا مستند تصور کرنے لگے تھے اس لئے شمال ہی کی شاعرانہ خصوصیات کا پرتو گجرات و دکن میں پایا جاتا ہے۔

گذشتہ باب میں ولی کے دور کی شاعرانہ خصوصیات بیان کی جا چکی ہیں۔ اس دور کے ابتدا میں یعنی ولی کے بعد شمال میں حاتم آبرو کا دور تھا۔ دکن میں آزاد، سراج وغیرہ اور گجرات میں عزلت، تجرد وغیرہ ہوئے۔ ولی کے بعد مظہر جان جاناں، سراج اور گجرات میں تجرد، اقدس، رحمت وغیرہ نے متصوفانہ تصورات کو قائم رکھا زبان کے اعتبار سے اس دور کے شمال و جنوب کے تمام شعرا ولی ہی کی زبان میں شعر کہتے تھے۔ مجازی تصور حسن و عشق بھی اس دور میں رواج پا چکا تھا لیکن پاکیزگیٔ خیال اور ایک شریفانہ رکھ رکھاؤ ان کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ تشبیہوں، استعاروں علامتوں میں بھی ان لوگوں کے ہاں کوئی جدت نہیں پائی جاتی۔ شمال میں صنعت ایہام اور رعایت لفظی کی لے اتنی بڑھ گئی تھی کہ یہ عیب کی طرح کھٹکنے لگی تھی جس کے خلاف بعد میں حاتم جان جاناں وغیرہ نے محاذ قائم کر دیا تھا۔

حاتم و آبرو کے بعد اُردو شاعری کو میر و مرزا جیسے خدائے سخن اور پہلوان سخن مل گئے۔ اس دور میں ان باکمالوں نے اپنے فکر و فن کی بلندی سے اُردو شاعری کو بھی لفظی و معنوی حیثیت

سے بلند کر دیا۔ ان لوگوں نے فارسی سے موضوعات لئے اور مضمون آفرینی بھی کی۔ تشبیہ واستعارہ کے باب میں بھی ان کی فنی صلاحیتوں نے معتدبہ اضافہ کیا۔ حسن و عشق کو وسیع معنوں میں پیش کیا گیا ہے اس میں حیا پروری، تدبر سبھی کچھ پایا جاتا ہے۔ غم جاناں اور غم دوراں کو پیش کرنے میں بھی کمال فن دکھلایا گیا ہے۔ نئے نئے اسلوب بیان شاعری میں متعارف ہو گئے۔ غرض ان استادوں نے اُردو شاعری کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ ان لوگوں نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کر کے ہر ایک میں بلند معیار قائم کر دیا۔

میر و مرزا کے آخری دور میں جوان شعرا کی جماعت (انشا، جرأت، رنگین وغیرہ) میدان میں آچکی تھی، یہ سب دلی سے لکھنؤ پہنچے تھے۔ لکھنؤ اپنی لکھنوی تہذیب کے تعمیری دور میں تھا۔ ان شعرا نے دہلوی خصوصیات شعر و سخن کو ایک زمانہ تک قائم رکھا لیکن لکھنؤ کے عشرت کدہ میں رنگ ہی دوسرا تھا۔ شعرا اپنے اولیائے نعمت کو خوش کرنے کے لئے ان کے مزاج کے مطابق اشعار کہتے تھے۔ لہٰذا میر و مرزا کے دور کی داخلی شاعری کسی حد تک مفقود ہونے لگی اور اگلے دور کی سنجیدگی و متانت بھی رخصت ہو گئی۔ تصورات بدل گئے۔ حسن و عشق کا تصور کوٹھے والیوں تک محدود ہو گیا اور سستے قسم کے ادنیٰ جذبات کی ترجمانی رواجی شاعری قرار پا گئی۔ اگرچہ ادنیٰ جذبات کی ترجمانی ہوتی تھی لیکن شعرا اعلیٰ شاعرانہ صلاحیتیں رکھتے تھے اس لیے ان کی اس قسم کی شاعری بھی حقیقی اور قابل داد پائی جاتی ہے۔ اس دور میں ریختہ سے ریختی (عورتوں کی زبان) نے جنم لیا۔

زبان کے اعتبار سے بقول صاحب گل رعنا انہیں پھولوں سے گلدستے سجائے گئے۔ تاہم بعض الفاظ محاورے روزمرے متروک قرار پائے۔ نئے الفاظ کا اضافہ ہو گیا۔ مشکل زمینوں میں دو غزلے سہ غزلیں کہنے کا رواج ہو گیا۔ نئے نئے قافیوں کے تجربے عمل میں آئے۔ اس دور میں دوسرے اصناف میں بھی طبع آزمائی کی گئی۔ میر حسن نے صنف مثنوی میں سحر البیان تخلیق کر کے مثنوی کا ایک بلند معیار قائم کر دیا۔

انشا و مصحفی کے بعد لکھنؤ میں آتش و ناسخ اور دہلی میں غالب، مومن، ذوق، نصیر وغیرہ کا دور آیا۔ انشا کے دور میں نئے تصورات قائم ہوئے۔ ان تصورات نے آتش و ناسخ کے دور میں پختگی حاصل کی اور انھوں نے اپنے زمانہ کے نئے تصورات بھی متعارف کئے۔ طرز معاشرت کی نفاست

نزاکت، تکلّف وتصنع ادب میں بھی راہ پا گئے۔ اسی وجہ سے زبان میں تراش خراش ہوئی۔ صرف ونحو کے قواعد ترتیب پائے۔ مبالغہ، قافیہ پیمائی، سنگلاخ زمینوں میں غزلیں، رعایت لفظی، عربی فارسی الفاظ علمی اصطلاحوں کا کھپانا لکھنوی شاعری کی اہم خصوصیات تھیں۔

دہلی داخلی شاعری کے لئے مشہور تھا لیکن لکھنؤ سے اساتذہ کا کلام دہلی پہنچنے لگا تو وہ لوگ اس سے متاثر ہوئے۔ شاہ نصیر نے لکھنوی خصوصیات کو دہلی میں رواج دیا۔ دہلی کے باکمال شاعروں نے دہلی اور لکھنؤ کے تصورات کے پیش نظر ایک نیا اسلوب قائم کر دیا۔ ان کے ہاں استعاروں تشبیہوں کی جدت، فارسی کی اچھوتی ترکیبیں، فلسفیانہ انداز نظر اور انداز بیان اور اشاروں کنایوں اور علامتوں کے ذریعہ حسن وعشق کی کیفیتیں بیان کرنا، نازک خیالی کی مثالیں وغیرہ خصوصیت رکھتی ہیں۔ غرض اس دور میں غزل کے لئے ایک مخصوص زبان اور مخصوص انداز بیان رونما ہوئے۔

پہلے عرض کیا گیا ہے کہ ولی کے بعد اردو ادب کا مرکز شمال میں منتقل ہو گیا تھا وہاں اساتذۂ فن نے شعر وسخن کو بلند مقام پر پہنچا دیا تھا لہٰذا گجرات ودکن کے لئے شمال ہی کی ادبی تحریکیں مشعل راہ کا کام دیتی تھیں۔ اگرچہ گجرات میں عزلت کو چھوڑ کر کوئی بلند درجہ شاعر نہیں پیدا ہوا تاہم اُردو ادب کی شمع کو روشن رکھا گیا تھا۔ اس امر میں گجرات کے رؤسا، امراء کا حصّہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں گجرات میں نوابی ریاستیں اور جاگیرداریاں قائم ہو گئی تھیں۔ سورت میں عمدۃ التجار شیخ فاضل کے خاندان میں فاضل، محمود، حامد بخشش، بہادر وغیرہ عمدۃ التجار ملا عبد الغفور کے خاندان میں ملا فخر الدین مضطر اور ملا قطب الدین قطب۔ ریاست سچین کے نواب خاندان میں نواب سیدی عبد الکریم خاں کریم، نواب سیدی ابراہیم محمد یاقوت خان محب، اخلاص، غنی وغیرہ بڑودہ کے نواب حسین خاں نصیری، بھروچ کے نواب حامد بیگ اور نواب معز الدین شاعر گذرے ہیں اور ان کے درباروں سے کئی شاعر منسلک تھے۔ جرأت کے شاگرد مجبور سرکار سچین سے متوسل تھے۔ قطب حیدرآباد کے ایک شاعر کے آقائے ولی نعمت تھے۔ بھروچ سرکار سے عباس شاعر تعلق رکھتے تھے۔ عباس سے ایک رزمیہ مثنوی بھی یادگار ہے۔ ان رئیسوں کا غالب رجحان صنف غزل کی طرف تھا تہواروں اور تقریبوں کے موقعوں پر دربار منعقد ہوتے اور قصیدے پڑھے جاتے۔ منشی لطف اللہ نے ایک قصیدہ بخشی میر صدر الدین کے دربار میں پڑھا تھا اس کے بعد کے دور میں منشی میاں داد خان سیاح نواب میر غلام بابا خان کی سرکار میں مصاحب تھے۔

مثنویاں بھی اس دور میں لکھی گئی ہیں۔ غرض ان امرا نے اُردو ادب اور ادیبوں کی سرپرستی سے گجرات میں اُردو کا چرچا قائم رکھا۔

گجرات میں مثنوی ادب کی مقبولیت نے اُردو کی شمع کو روشن رکھنے میں بہت مدد کی۔ ۱۷۰۰ تا ۱۸۵۰ء گجرات میں مثنویوں کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ مثنوی نگاری میں گجرات و دکن کے شعرا ایک دوسرے سے اثر حاصل کرتے ہیں۔ دونوں جگہ موضوعات میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے بزمیہ کے مقابلہ میں مذہبی و اخلاقی مثنویوں کی تعداد زیادہ ہے۔ بعض مثنویوں میں اسلام کی برتری اور دین کی تبلیغ موضوع خاص ہے ان میں من گھڑت داستان عشق ہوتی ہے جس میں مسلمان کو عاشق اور ہندو کو معشوق کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور آخر میں معشوق مشرف بہ اسلام ہو جاتا ہے۔ مثنویوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہندو عورت گجراتی میں بات کرتی ہے اور اس کی گفتگو کو اسی کی زبان میں شعری جامہ پہنایا گیا ہے۔ عالمگیر قصوں میں یوسف زلیخا، شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں کو بھی نظم کیا گیا ہے۔ دو بزمیہ مثنویاں اور دو رزمیہ مثنویاں بھی پائی جاتی ہیں۔

یہ وہ دور ہے جب کہ متغزلین کی بعض کاوشوں سے زبان بلند درجہ پر پہنچ چکی تھی اس میں وسعت پیدا ہو گئی تھی شمال میں مثنویوں کا ایک بلند معیار قائم ہو چکا تھا لیکن گجرات میں اس ڈیڑھ سو سال کے طویل عرصہ میں وہی قدیم ڈگر پر مثنوی نگار چلتے رہے۔ طرز فکر اور انداز فکر کے نئے تصورات کو سمونے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اس دور کے اواخر کی بعض مثنویوں میں زبان صاف پائی جاتی ہے۔

قدامت پسندی کے کئی اسباب معلوم ہوتے ہیں۔ ان مثنویوں کے لکھنے کا مقصد تبلیغ و تلقین تھا۔ ان کو ادب سے صرف بہ اعتبار ہئیت ہی تعلق تھا۔ یہ مثنوی ادب عموماً ان پڑھ اور نچلے طبقہ کے عوام کے لئے لکھا جاتا تھا اس لئے ان میں عوامی انداز و عوامی زبان اختیار کئے گئے تھے۔ اس کو عوامی ادب کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ گجرات میں بعض مسجدوں میں بعد نماز عشاء لوگ صحن میں بیٹھ جاتے اور ایک شخص کوئی سی مثنوی پڑھتا اور مجمع سنتا۔ اس حلقہ کو گجراتی کی ترکیب پر 'مونڈھا' کہا جاتا تھا۔ یہ ایک قسم کا حلقۂ ادب تھا۔ قصہ کہانی اور داستانی ادب ہونے کی وجہ سے لوگ ان مثنویوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ اس کو عوام کے ادبی ذوق کا نتیجہ سمجھئے یا مذہب و اخلاق کی طرف رجحان طبع کہئے یا دکھ درد کا مداوا خیال کیجئے۔ مثنوی ادب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے

بھی ہوگا کہ انیسویں صدی میں بمبئی میں چھاپاخانہ کے اجرا کے ساتھ مثنوی ادب کی طباعت و اشاعت غیر معمولی تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں مثنویاں فروخت ہوتی تھیں۔ اس ادب کی طباعت واشاعت سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ قدیم ادب ایک حد تک محفوظ ہوگیا۔

اس دور میں عزلت ایک غزل گو شاعر گذرا ہے۔ اس کی شاعری ولی کا پرتو ہے۔

گجرات میں زیر بحث دور سے تعلق رکھنے والے صرف چھتیس[36]، سینتیس[37] شاعروں کا پتہ چلا ہے۔ ان میں چند ایسے ہیں جو ولی کے مکتب خیال سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض شمالی ہند کا تتبع کرتے پائے جاتے ہیں۔ ولی کے بعد غزل کا موضوع عموماً مجازی عشق پایا جاتا ہے۔ عزلت کے کلام میں مجازی عشق نمایاں ہے۔ عاشقانہ جذبات وقلبی واردات کا اظہار عزلت نے ایک ماہر فن کی حیثیت سے کیا ہے۔ ولی کی طرح عزلت کے ہاں بھی عاشق اور محبوب دونوں باوقار شخصیتیں پائی جاتی ہیں۔ زبان کے اعتبار سے بھی عزلت کی زبان ولی سے مختلف نہیں ہے۔ بعض جگہ فارسی عنصر سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔

اس دور کے شاعروں کا جو تھوڑا بہت کلام دستیاب ہوتا ہے اس کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے زمانہ کے شعری رجحانات کے پیش نظر جو کچھ کہا ہے وہ قابل اعتنا ضرور ہے۔

اس موقع پر مجموعی حیثیت سے چند شاعرانہ خصوصیات ملاحظہ کیجئے۔ سلیس وسادہ زبان میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے:-

کنج قفس میں فصل جنوں کی گذر گئی　　معلوم نہیں بہار کب آئی کدھر گئی

(نہیں کوئی پڑھئے)　(عزلت)

آنکھ سوں دل میں آج تجرد خیال یار　　آیا ہے اس طرح کہ پلک کو خبر نہیں

(تجرد)

پارسا آپ کو کہاتے ہو　　چپ رہو اس قدر نہ لاف کرو

(مضطر)

چشم مست اس کی دیکھ کر عاشق　　کہتے ہیں آج پھر خرابی ہے

(کریم)

آہ معلوم نہیں ساتھ کے اپنے شب و روز　　لوگ جاتے ہیں سو یہ لوگ کہاں جاتے ہیں

(صاحب)

علاج دل کو آئے تھے مسیحا سخت دعوے کر
یہاں کیا ہو گیا وہ معجزہ حضرت سلامت کا

(مرتضیٰ)

جدت مضمون اور انداز بیان :

میرے قاتل کے کف حنائی نہیں
مشت خوں یادگار ہے میرا

(عزلت)

جوں صبا منہ لگ کے گل سو گرم جوشی کر گئی
بلبل آہ سرد بھرتی آشیاں میں مر گئی

(عزلت)

آہ ظالم نے کیوں نکالا خط
کیا مری شاہدی نہ تھی منظور

(بہادر)

بہکا دیا تھا ہم سی سکندر ز اس کو خوب
بر عکس رخ پہ اس کے ٹھہرتی نظر نہیں

(مائل)

سرخ دامن پر کناری کی نہیں تحریر ہے
شعلۂ سوزاں دل بے تاب دامن گیر ہے

(بیتاب)

اگرچہ ابتدائی دور میں شمال میں ایہام اور رعایت لفظی اُردو شاعری کی نمایاں خصوصیت تھی۔ مگر گجرات میں نہ عزلت کے ہاں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے نہ عزلت کے بعد کسی نے اس کو قابل اعتنا سمجھا۔ اگر کہیں موقع آگیا تو رعایت لفظی سے کام لے لیا ہے۔ محاورہ اور روزمرہ کے استعمال میں بھی گجرات کے شعرا خصوصیت نہیں رکھتے۔ دو چار مثالیں دیکھیے :

مت ہو نیلا پیلا بخت سیہ کر اجلی
اے الفی شال والے بھگوے رومال والے (عزلت)

کھول کر قبر دیکھ مت جنوں
کہ کفن تار تار ہے میرا

زبان خامۂ الفت کی ہو گئی گونگی
وگرنہ ایک گلے کے سو جواب لکھتے ہم

(بخشش)

صبح سے شام تلک شوخ کے در کے آگے
سینکڑوں ٹھوکریں کھائیں پہ نہ سر کر آگے

(وحشت)

توڑ کے دل کو مرے اُٹھ کے چلا جاتا ہے
اے صنم کس نے بتائی تجھے کعبہ شکنی

(احمد نور اللہ)

چوتھا باب

سیاسی سماجی پس منظر

۱۸۵۷ تا ۱۹۵۰

۱۸۵۷ء کا حادثہ تاریخ ہند میں ایک اہم سنگ میل ہے۔ ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء انگریز ہندوستانیوں کو غلام بنانے میں مصروف رہے اور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ہندوستانی غلامی کی زنجیریں کاٹنے میں مصروف رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے ہندوستانیوں کو ان کی فروگذاشتوں، کمزوریوں، غیر منظم طریق کار اور نا اتفاقیوں وغیرہ کا درس عبرت دیا۔ اہل دانش نے انہیں کمزوریوں اور عیبوں کے پیش نظر ہندوستانی ذہن کو تربیت کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کیے۔

سیاسی نقطۂ نظر سے ۱۸۷۰ء کے قبل سے سیاسی انجمنیں وجود میں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ بمبئی کی سارو جنک سبھا، بامبے ایسوسی ایشن، مہاجن سبھا، انڈین ایسوسی ایشن، سر سید کی برٹش انڈین ایسوسی ایشن وغیرہ سیاسی انجمنیں تھیں۔ ان کا میدان عمل صوبوں تک محدود تھا۔ ۱۸۸۲ء میں سریندر ناتھ بنرجی نے قدرے وسیع پیمانے پر انڈین نیشنل کانفرنس قائم کی۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ صدی کے آخر تک اخباروں، تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ سیاسی آزادی کا ایک دھندلا سا تصور قائم ہو گیا اور آرمس ایکٹ، پریس ایکٹ، البرٹ بل وغیرہ کے نفاذ نے آزادی اور غلامی میں امتیاز کرا دیا لہٰذا ہند کے سیاسی مطالبات سخت سے سخت تر ہوتے گئے اور ۱۹۰۵ء میں کانگریس نے مکمل سوراج کا مطالبہ پیش کر دیا۔

اُدھر بعض کٹر قسم کے لوگوں نے سیاسی، سماجی، مذہبی، لسانی تعصبات کو ہوا دینا شروع

کیا۔ لہٰذا انتقامی جذبے کہیں قومیت کہیں صوبائیت کہیں لسانی روپ میں نمودار ہونے لگے۔ اس دور میں ہر قوم اور فرقہ اپنے مذہب اور جماعت کے تحفظ اور ترقی کے لئے جدّوجہد میں مصروف تھا۔

سرسید نے بھی مسلم قوم کی فلاح وبہبود کو اپنا مطمح نظر بنا کر مختلف طریقوں پر جدوجہد شروع کی یہ مسلمان تعلیم میں پیچھے ہی نہیں تھے بلکہ صفر تھے۔ ان کے اقتصادی حالات نہایت مخدوش تھے۔ یہ مذہب سے کوسوں دور ہوچکے تھے۔ ان کے سماجی تصورات محتاج اصلاح تھے۔ اُردو ادب ان کے لئے ذہنی عیاشی کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔ مزید برآں ان میں ایک جماعت بزور بازو سیاسی آزادی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں سب سے زیادہ مسلمان ہی خانہ خراب ہوئے۔ وہابی فرقہ کے ہزاروں لوگ سولی پر لٹکائے گئے مسلمانوں کو کالا پانی بھیجا گیا، جاگیرداروں کی جاگیریں چھن گئیں۔ ان حالات کے پیش نظر یہ نقطہ نظر سامنے آیا کہ کسی بھی طریقہ پر حکومت برطانیہ کی مخالفت اور زور بازو مسلمانوں کے لئے سودمند ثابت نہ ہوگا لہٰذا اپنے آپ کو منظم کرنے کے خیال سے ۱۹۰۶ء میں بمقام ڈھاکہ مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے انعقاد کے موقع پر مسلم لیگ کے نام سے ایک سیاسی ادارہ قائم کیا گیا۔ ادھر انگریز نے ہندو مسلمانوں میں نفاق ومنافرت پیدا کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے۔ ۱۹۰۴ء میں بنگال کو تقسیم کرکے ایک شاخسانہ کھڑا کیا لیکن شدید مخالفت کی وجہ سے ۱۹۱۱ء میں اس تقسیم کو منسوخ کردیا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں مورلے منٹو ریفارم کے نام سے ہندوستان کو چند حقوق عطا کئے لیکن یہ بے معنی تھے۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ ۱۹۱۶ء میں لوک مانیہ تلک جیل سے رہا ہوکر آئے اینی بسنٹ کے تعاون سے 'ہوم رول' کا مطالبہ پیش کردیا گیا۔ اس زمانہ میں مہاتما گاندھی بھی افریقہ سے آنے کے بعد سیاسی میدان میں رواں دواں تھے۔ کانگریس نے مسلم لیگ سے مصالحت کرکے ہوم رول کی تحریک چلائی۔ برطانیہ نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر ۱۹۱۷ء میں نئی اصلاحات کا وعدہ کیا۔ اس عہد میں تشدد پسند چین سے نہیں بیٹھے تھے۔ ہندر پرتاپ، برکت اللہ، عبیداللہ سندھی، مولانا محمودالحسن، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ سرگرم عمل تھے۔ ۱۹۱۹ء مانٹیگو چیمسفرڈ ریفارم کے نام سے حقوق کا اعلان کیا گیا۔ کانگریس کے اعتدال پسندوں نے ریفارم کو مصلحتاً منظور کرلیا لیکن انتہا پسندوں نے مخالفت کی۔ اصلاحات کے خلاف جب

شدت کے ساتھ غم و غصہ کا اظہار کیا گیا تو رولٹ ایکٹ نافذ کیا گیا جس کی رو سے شک و شبہ پر کسی شخص کو بھی شہر بدر کیا جا سکتا تھا۔ مہاتما جی جو ۱۹۱۷ء میں اہمسا کے ہتھیار سے چمپارن اور کھیڑا (ضلع گجرات) میں تحریکیں چلا چکے تھے اس موقع پر ستیہ گرہ کا حربہ لے کر آگے بڑھے ۱۹۱۹ء کی چھٹی اپریل کو ہڑتال کا اعلان کیا گیا۔ ہڑتال کے روز پنجاب میں لوگ تشدد پر اتر آئے۔ مہاتما پنجاب جا رہے تھے کہ راستہ میں انہیں قید کر لیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں جلیان والا باغ کا قتل عام کا واقعہ پیش آیا اور ستیہ گرہ کی تحریک ختم ہو گئی۔ قید سے رہا ہونے کے بعد مہاتما نے ۱۹۲۱ء میں عدم تعاون کی تحریک شروع کی۔ اس زمانہ میں انگریز سے ناراضگی کی بنا پر مسلمان تحریک خلافت کا آغاز کر چکے تھے لہذا کانگریس اور خلافت نے متحد ہو کر ترک موالات کی تحریک شروع کی۔ اس موقع پر بھی لوگ تشدد پر اتر آئے تو مہاتما نے تحریک کو ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ تحریک کی ناکامی کی وجہ سے کانگریس میں دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ نے سوراج پارٹی قائم کر کے تعاون سے سوراج حاصل کرنا چاہا اور دوسرا گروہ عدم تعاون کے نظریہ پر کاربند رہا۔ اسی طرح ۱۹۲۲ء اور ۱۹۴۲ء میں آزادی کی تحریکوں نے زور پکڑا اور آخر ۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل ہو گئی۔

ہندوستان مختلف مذہبوں، تہذیبوں اور زبانوں کا ملک ہے۔ ہر قوم کے اہل دانش فلاح و بہبود کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ انیسویں صدی کے آغاز ہی سے ہندو قوم کے بیدار مغزوں نے مذہبی و سماجی اصلاح کے میدان میں دوڑ دھوپ شروع کر دی تھی۔ رام موہن رائے پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۸۲۸ء میں برہمو سماج قائم کیا۔ اس کے بعد پرارتھنا سماج، آریہ سماج، رام کرشن مشن وغیرہ قائم کئے گئے۔ ان اداروں کے مجموعی حیثیت سے اغراض و مقاصد مذہبی، سماجی، تعلیمی اصلاح اور ہندو فلسفوں کی تعلیمات تھے۔

مسلمانوں کو ہنوز تباہی و تنزل کا اندازہ نہیں ہو پایا تھا۔ امیر و غریب حسب المقدور عیش کی زندگی گذار رہے تھے یا غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ حسن و عشق کی داستانوں کا طلسم خانہ ان کی دنیا تھی۔ تصوف کی تعلیمات کے غلط تصورات قائم ہو گئے تھے۔ رضائے الٰہی اور بے عملی مترادفات سمجھے جاتے تھے۔ فرار و گریز کے ایسے کئی طریقے نکال لئے گئے تھے۔ عقل کی خرابی اور جہالت کی وجہ سے بیسیوں خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان کی اصلاح کے لئے سرسید احمد خان اور ان کے رفقائے کار بہ خلوص تمام میدان عمل میں رواں دواں ہو گئے۔

سر سید اور ان کے رفقائے کار نے سیاست، سماج، مذہب و اخلاق، علم و ادب تمام شعبجات حیات میں بیک وقت اصلاح کا کام شروع کیا۔ مسلمانوں میں جہالت سب سے زیادہ خطرناک روگ تھا۔ اس لئے تعلیمی پروپیگنڈے کی غرض سے ۱۸۸۶ء میں مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا جس کے اجلاس کا انعقاد ملک کے مختلف شہروں میں کیا جاتا تھا۔[1] ان مخلص رہنماؤں کی جدوجہد سے ملک کے مختلف شہروں میں تعلیمی ادارے اور سماجی اصلاح کے لئے انجمنیں قائم ہو گئیں۔[2] خود سید نے ثانوی مدارس قائم کئے اور ۱۸۷۲ء میں علی گڑھ کالج کا قیام بھی عمل میں آ گیا اور بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم یونیورسٹی بھی قائم کی گئی۔ بعض لوگ مغربی تعلیم کو مذہب کے لئے خطرہ خیال کرتے تھے۔ اگرچہ رامپور میں مدرسۂ عالیہ، دلی میں مدرسہ نظامی الدین لکھنؤ میں فرنگی محل میں نامی گرامی علماء خدمت انجام دے رہے تھے تاہم بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں مغربیت کے کفر کو توڑنے کے لئے مدرسۂ دیوبند، گجرات میں مدرسۂ ڈابھیل، سورت میں مطلع العلوم اور راندیر میں مدرسۂ حسینیہ اور اشرفیہ قائم ہو گئے۔ خانقاہوں میں بھی ہوحق کے نعرے ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ بناوٹی صوفیوں نے تعویذ گنڈوں کی دکانیں کھول رکھی تھیں ایک زمانہ میں خانقاہوں کے صدر نشین عوام کے نمائندوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ بادشاہ ان سے مرعوب رہتے تھے۔ بدلے ہوئے حالات میں انگریزوں نے انہیں خطابات اور سیم و زر دیکر اپنا پٹھو بنا لیا۔ خانقاہوں کے یہ صدر نشین حکومت میں سرخروئی کو اپنی عزت و توقیر سمجھتے تھے۔

غرض ہر قوم کے رہنماؤں نے مغربی تعلیم کو عام کرنے کی پوری کوشش کی۔ ہر شہر میں ثانوی اسکول اور کالج کھل گئے۔ ۱۸۵۷ء تک بمبئی، مدراس اور کلکتہ میں یونیورسٹیاں قائم ہو چکی تھیں اور بیسویں صدی کے اوائل میں بنارس، علی گڑھ، حیدرآباد میں بھی یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں۔ مغربی تعلیم ظاہر میں روشن خیالی اور باطن میں تاریکی لائی۔ قدیم و جدید نظریات مذہب کے

---

[1] اس کانفرنس کے اجلاس صورت میں پہلی بار ۱۹۰۱ء میں اور دوسری بار ۱۹۱۸ء میں ہوئے تھے۔ بڑودہ اور احمدآباد میں بھی اجلاس منعقد کئے گئے تھے۔

[2] سورت میں انجمن اسلام کا قیام ۱۸۹۹ء میں عمل میں آیا۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے ضمیمہ ۱۰ سورتی جمعدار کا خاندان۔ اسی زمانہ میں احمدآباد میں بھی اسلام کے نام سے ادارہ قائم کیا گیا۔

تصادم کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود نوجوان صحیح نتیجے پر پہنچنے سے قاصر رہے اور دین و مذہب سے بیزاری کا اظہار صرف فرار و گریز تھا۔

مشرق و مغرب زدگی میں اعتدال و توازن قائم کرنے کے خیال سے بیسویں صدی کے اوائل میں چند دانشوروں نے نئی طرز کے تعلیمی ادارے قائم کئے۔ ان اداروں میں گروکل (ہردوار) شانتی نکیتن (بنگال) کشنا مورتی (بھاؤنگر گجرات) اینی بسنٹ کا ادارہ (مدراس) جامعہ ملیہ (دہلی) گجرات ودیاپیٹھ (احمدآباد) ندوۃ العلما (لکھنؤ) ویمنز یونیورسٹی (پونا) خصوصیت رکھتے ہیں۔

گجرات میں مغربی تعلیم کا سلسلہ مشنریوں نے شروع کیا۔ سب سے پہلے ۱۸۲۰ء میں انھوں نے سورت میں چھاپا خانہ قائم کیا۔ انجیل کے ترجمے شائع کئے۔ انگریزی گجراتی لغت شائع کیا۔ ۱۸۴۰ء میں ثانوی تعلیم کا پہلا اسکول مشن اسکول کے نام سے سورت میں قائم کیا گیا۔ اس کے بعد مختلف انجمنوں نے اسکول قائم کئے۔ ۱۸۵۲ء میں لڑکیوں کا پہلا اسکول قائم کیا گیا اور ۱۸۷۴ء میں مشنریوں نے بھی لڑکیوں کا اسکول شروع کیا۔ ۱۸۸۸ء میں ایک علم دوست چونی لال شاہ نے دہی انگلش اسکول کے نام سے اسکول کا اجرا کیا۔ ۱۹۱۲ء میں سارو جنک سوسائٹی نے تعلیمی ادارے کھولنا شروع کئے۔ اس سوسائٹی کے موجودہ دور میں کئی پرائمری، سکنڈری اسکول اور کالج قائم ہیں۔ ٹکنیکل اسکول کا بھی سلسلہ تقریباً سو سال سے سورت میں قائم ہے۔ سورت میں پاریکھ ٹکنیکل اسکول ۱۸۶۴ء میں کھولا گیا۔ احمدآباد میں ۱۸۲۰ء سے تعلیمی ادارے پائے جاتے ہیں۔ ۱۸۱۶ء میں پہلا انگریزی اسکول کھولا گیا۔ ۱۸۶۶ء میں مشنریوں نے اسکول قائم کیا۔ ۱۸۵۷ء میں ٹریننگ کالج اور ۱۸۷۳ء میں آرٹس کالج قائم ہوگیا اور اس کے بعد سے آج تک سینکڑوں اسکول اور کالج قائم کئے گئے ہیں۔

گجرات میں دوسری قومیں تعلیم میں آگے نکل چکی تھیں اس کے بعد بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں نے اپنے بچوں کو پرائمری اسکولوں میں بھیجنا شروع کیا۔ تاجر اور ہنرمند جماعتوں کے بچے مکتب میں دو ایک سال پڑھنے کے بعد اپنے اپنے پیشوں میں لگ جاتے اور امرا کے بچے خانگی طور پر کچھ لکھ پڑھ لیتے یا جاگیروں پر زندگی بسر کرتے۔ احمدآباد میں مشائخ خاندانوں نے تعلیم کی طرف ابتدا سے توجہ دی۔ سورت میں پہلا مدرسہ ۱۸۹۲ء میں ایک مخیر تاجر سیٹھ اسمٰعیل تراوانے قائم کیا۔ احمدآباد میں انجمن اسلام نے ۱۹۰۱ء میں ایک ہائی اسکول قائم کیا تھا جس کا ذریعۂ تعلیم اردو تھا جو آزادی کے بعد گجراتی کر دیا گیا۔ سورت میں ۱۹۴۸ء میں انگلو اردو

ہائی اسکول کا اجرا کیا گیا۔ اس کا بھی ذریعہ تعلیم اُردو سے گجراتی کر دیا گیا ہے۔

سورت اور احمد آباد سے گجراتی اخباروں کی اشاعت ۱۸۵۰ء سے پائی جاتی ہے۔ ان میں سے بعض اب تک خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ۱۸۶۰ء میں سورت کے شاعر میاں منظور نے منظور الاخبار کے نام سے ایک اُردو روزنامہ یا ہفتہ وار کا اجرا کیا تھا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کب تک خدمت انجام دیتا رہا۔

گجرات کی تجارتی اہمیت کسی زمانہ میں کم نہ ہونے پائی۔ اگرچہ گجرات کئی جنگوں، خانہ جنگیوں کی بار بدنظمی سے دوچار ہوا۔ کئی بار لوٹ کھسوٹ کا شکار ہوا لیکن تجارتی کاروبار برابر چلتے رہے۔ احمد آباد میں پہلا کپڑے کا کارخانہ ۱۸۶۰ء میں قائم ہوا اس کے بعد کئی کارخانے کھل گئے۔ اسی طرح مختلف صنعتی کارخانے قائم ہو گئے۔ سورت میں کپڑے کا پہلا کارخانہ دبیل (جعفر علی) مل کے نام سے ۱۸۶۱ء میں قائم کیا گیا۔ ۱۸۸۸ء تک سورت میں ایک سپننگ مل کا ایک تیج کا کارخانہ، ایک لوہے کا اور ایک کاغذ بنانے کا کارخانہ قائم ہو چکے تھے۔

گجرات مسلمان تاجر قوموں کا صوبہ ہے۔ ان میں سے داؤدی بوہرا جماعت میمن جماعت اور ٹیپی جماعت (سنی بوہرا) قابل ذکر ہیں۔ ٹیپی جماعت کا پیشہ عموماً کاغذی کا ہے۔ سورت کا ایک پیپر مل اسی جماعت کے ایک فرد جمال الدین نے قائم کیا تھا۔ اس جماعت کے اکثر خاندان تجارت کے سلسلہ میں عرب ممالک میں رس بس گئے ہیں۔ کامرس اور انڈسٹری دونوں میں اپنا باوقار وجود قائم رکھ سکے ہیں۔

اس باب کے تحت اخلاص، اخگر، آزاد، افضل، بہادر، خاموش، سیاح، بھو، سرور، شیفتہ، شائق، شعلہ، شیدا، علوی، غنی پالا، غنی ۲، فاضل، فرحت، قطب، کامل، منظور، یکتا، زکا، رفعت، سعید، شوکت، شیدا، شاد، قطب فنشی، منیر، منعم، منادی اور حشمت کا تذکرہ اگلے صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اخلاص

نواب سیدی عبدالرحیم خان عرف سیدو میاں اخلاص تخلص کرتے تھے۔ اخلاص محب کے چھوٹے اور چہیتے بیٹے تھے۔ ان کا جشن تقریب بسم اللہ اور جشن کدخدائی بڑے اہتمام سے منایا گیا تھا۔ اخلاص بہت ہی خراچ تھے۔ ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے تین چار لاکھ روپیہ کا

قرض ہو گیا تھا۔ اخلاص کی نسبت ریاست پیٹھ کی شہزادی سے ہوئی تھی لیکن کسی وجہ سے شادی نہ ہو سکی تھی[1]

اخلاص علم دوست نواب تھے۔ شعر و شاعری سے اتنا شغف تھا کہ محل پر ہر ہفتہ بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی اور اس کے بعد رقص و سرود کا سلسلہ رہتا تھا۔ میاں مجھو سے گہرے مراسم تھے ایک جگہ مجھو لکھتے ہیں:

سچین کو بھیجیں یہ ارمغان مجھو ک ایک محب ہیں وہاں اخلاص

(سچین ریاست کا صدر مقام ہے)

جرأت کے شاگرد مجھو بھی عرصۂ دراز تک اخلاص کے مصاحبین میں رہے تھے۔ اخلاص صاحب دیوان گذرے ہیں۔ صاحب مخزن شعرا کا بیان ہے کہ بزمیہ مثنوی جو کئی ہزار اشعار پر مشتمل ہے ان سے یادگار ہے ان کے بارے میں یہ بھی رائے ظاہر کی ہے کہ "اکثر مذاق کلامش ہم از شیخ ناسخ است"

اخگر

منشی عبدالحکیم کتر کے بیٹے رضی الدین اخگر تخلص کرتے تھے۔

آزاد[2]

سید امیر الدین (ولادت ۱۸۴۱ء/ ۱۲۵۷ھ) عرف سید میاں ولد سید قطب الدین عرف میر صاحب غفران پناہ طریقت دستگاہ سید سیف الدین عرف میر غازی قادری کے پوتے تھے۔ ان کا وطن سورت تھا۔ علوی کے شاگردوں میں سے تھے۔ صرف و نحو اور علم عروض میں مہارت رکھتے تھے۔ ۱۸۸۲ء/ ۱۳۰۰ھ سے کچھ قبل آزاد برما چلے گئے تھے اور بمقام پرم مدرس کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے تھے۔ ۱۸۹۰ء/ ۱۳۰۸ھ میں وفات پائی۔

---

[1] ضمیمہ۔ نواب سچین کا خاندان

[2] حقیقت السورت اور آئینہ تاریخ

افضل

منشی افضل الدین عرف باچھو میاں نواب سیدی عبدالکریم دوم کے صاحبزادوں کے اتالیق تھے۔ اردو فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔ افضل بہت خلیق اور ظریف الطبع شخص تھے ۹؍ربیع الاول ۲۰؍دسمبر ۱۸۸۹ء/۱۳۰۷ھ کو وفات پائی۔

بہادر[1]

شیخ بہادر عرف چھجو میاں بخشو میاں بخشش کے بڑے لڑکے بہادر تخلص کرتے تھے۔ بہادر کے چچا شیخ فاضل نے انہیں سندھ حیدرآباد بلوالیا اور مختار کار کی جگہ پر تقرر کرادیا۔ ۱۸۷۳ء/۱۲۹۰ھ میں چھ ماہ کی رخصت لے کر سورت آئے اور پھر واپس نہیں گئے۔ بڑودہ کے ریسیڈنٹ نے مہاراجہ سے سفارش کرکے ریاست گائکواڑ میں تحصیلدار کی جگہ پر تقرر کرادیا۔ ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ میں ریاست کے صوبہ نوساری کے نائب صوبہ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ۲۸؍ذی الحجہ ۱۸۹۶ء/۱۳۱۴ھ میں انتقال ہوا۔

بہادر اپنے اجداد کی طرح علمی ذوق رکھتے تھے۔ مکان پر اکثر مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔

خاموش

سید عبدالرحیم خلف سید نظام الدین علوی کے شاگردوں میں سے تھے۔ صاحب حقیقت السورت کا بیان ہے کہ سورت سے ہجرت کرکے بمبئی چلے گئے تھے۔ حقیقت السورت میں صرف دو شعر اور حقیقت السورت کی تاریخ تالیف دستیاب ہوسکے ہیں۔

سیاح

منشی داد خاں سیف الحق سیاح سے خصوصاً ہر غالب پرست اور عموماً ہر اردو ادب سے ذوق رکھنے والا واقف ہے کہ سیاح غالب کے ایک شاگرد رشید۔ غالب کے نطق کی ایک

---

[1] ضمیمہ۔ شیخ فاضل عمدۃ التجار کا خاندان۔

تلوار اور یارِ غمگسار تھے۔ منشی صاحب کا نام میاں داد خاں تھا۔ سیاحؔ تخلص کرتے تھے۔ اور لقب سیف الحق تھا۔ جو مرزا نے سیاح کو عطا کیا تھا۔ اُردوئے معلیٰ میں ایک خط میں اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں: "یہ جو میں نے سیف الحق خطاب دیا ہے۔ اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے بھائی ہو تم میرے بازو ہو میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔" سیاح کے والد منشی عبداللہ خاں اورنگ آباد کے رؤسا میں سے تھے۔ مرزا محمد عسکری بی اے۔ ادبی خطوط غالب میں لکھتے ہیں کہ سیاح کی پیدائش کے وقت دولت کی فراوانی تھی۔ لیکن ان کے سن شعور کو پہنچنے تک ادبار کی گھٹائیں چھا چکی تھیں سیاح قریب ۱۸۴۴ء یا ۱۸۴۵ء میں سورت تشریف لائے اور میر غلام بابا کے زمرۂ مصاحبین میں داخل ہوگئے اور تمام عمر یہیں رہے۔

سیاح بہت سرخ و سفید اور حسین و جمیل تھے۔ قد دراز۔ بدن سڈول اور چہرہ کتابی تھا۔ ضعیفی میں بھی چہرہ سے نور ٹپکتا تھا۔ اور تمکنت اور وقار آشکار تھا۔ دوران گفتگو میں ہر جملہ کو اس قدر آہستہ اور خوبی سے ادا کرتے تھے کہ منہ سے گویا پھول جھڑتے تھے اور بحث مباحثہ کے وقت غصہ کو قریب نہ آنے دیتے تھے۔ وضعداری میں اپنے استاد غالب سے کچھ کم نہ تھے۔ اور یہ چیز ان کے حسن کو چار چاند لگا دیتی تھی۔ پانچ ہاتھ کا مختصر سا صافہ، ململ کا پیرہن چھوٹی موری کا پائے جامہ انگہ اور اس پر چوغہ ان کا لباس تھا۔ وضعداری کی اس قدر سختی سے پابندی کرتے تھے کہ اس میں کسی کو خلاف وضع کپڑے پہنے دیکھ کر فوراً ٹوک دیتے تھے۔ یہ ۱۲۹۶ھ یا ۱۲۹۷ھ کا واقعہ ہے۔ کہ راقم کے والد بزرگوار (جن کی عمر اس وقت تقریباً ۱۸ یا ۲۰ سال کی تھی) جن کو سیاح کی فیض صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ فرماتے ہیں کہ وضعداری کے نکات اکثر سیاح ان کو بتلاتے رہتے تھے۔ لطافت و نفاست کا یہ عالم تھا کہ کپڑے دہلی میں سلواتے تھے۔ ایک دفعہ والد بزرگوار نے سیاح سے گزارش کی کہ قبلہ سورت میں بھی اچھے درزی ہیں' سیاح نے فرمایا: "اچھا تو ایک پیرہن سلوائیے۔ دیکھیں کیسا سیتے ہیں" چند روز کے بعد جب سلا ہوا پیرہن حاضر کیا تو بڑے غور سے دیکھ کر کہا: "میاں! ہمارا کپڑا ابھی خراب ہوا۔ کلی کے ٹانکے چھوٹے بڑے کر دئے۔ یکسانیت نہیں ہے" اگر آدھ گھنٹے کے لئے بھی باہر جاتے تو واپس آکر آدھ گھنٹہ چوغے کے شکن استری سے نکالے جاتے۔ ایک چوغہ اور انگہ ایک وقت پہنتے تو مہینوں اس کو دوبارہ پہننے کا موقع نہ آتا۔ جب محلے میں سے گزرتے تو عطر کی لپٹیں اڑتیں۔ بغیر دیکھے لوگ اپنے مکان میں سے کہہ دیتے کہ سیاح جا رہے ہیں۔ اواخر عمر میں زمانہ کج رفتار کا

تنکار ہوئے۔ تقدیر میں شکن پڑ چکی تھی، لیکن کپڑوں پر کبھی شکن گوارا نہ کی۔ اور کپڑے کبھی خلاف وضع نہیں پہنے۔ مرنے کے بعد مکان میں سے کم از کم بیس جوڑے جوتے اور بے شمار کپڑے نکلے تھے۔

سیاح نے سورت ہی کے ایک معزز خاندان میں شادی کی تھی۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی محلہ سید واڑہ کے ایک معزز غریب خاندان کی لڑکی کو متبنیٰ کر لیا تھا۔ اس کو پرورش کر کے سورت کے ایک باشندے عبدالرشید کرانی سے بیاہ دیا تھا۔

اس عالم سفلی میں فریب کے جال میں ہر شخص پھنستا ہے۔ دنیا میں انسان لغزش سے نہیں بچ سکتا۔ کبھی نہ کبھی زندگی میں ایک آدھ بھول ہو ہی جاتی ہے۔ سیاح سے بھی ایک لغزش سرزد ہوئی۔ جس کو زندگی کی ایک بھول کہنا پڑتا ہے۔ اور جو سیاح کے آئینہ ذات و صفات میں ایک بال ڈال گئی اس واقعے کے لکھنے سے طبیعت جھجکتی ہے قلم رکتا ہے۔ گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل۔ لیکن لکھنے پر مجبور ہوں۔ ورنہ حالات نامکمل رہ جاتے ہیں۔ افسوس کہ سیاح کو قلب سازی کا ہنر یاد تھا۔ نوٹ بناتے تھے اور اس کام میں بڑی بڑی ہستیاں آپ کی شریک تھیں۔ ایک عرصہ تک تو پتہ نہ چلا۔ آخر ایک مرتبہ سیاح حیدر آباد تشریف لے جا رہے تھے۔ کہ بمبئی کے وکٹوریہ ٹرمنس پر ٹکٹ خریدنے کو سو روپے کا نوٹ دیا۔ ٹکٹ اور بقیہ رقم لے کر سیاح گاڑی پر سوار ہو گئے۔ سیاح کا ستارہ گردش میں تھا۔ قضارا ان کے جانے کے چند گھنٹے بعد ٹکٹ گھر میں سو روپے کا دوسرا نوٹ آیا۔ ایک نمبر کے دو نوٹ پائے گئے۔ فوراً تھانے میں خبر دی گئی۔ وہاں سے حیدر آباد اطلاع بھیجی گئی اور اسٹیشن ہی پر سیاح کو گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ چلنے پر جرم ثابت ہوا اور قید کا حکم ہوا۔ جس قید خانہ میں ان کو رکھا گیا تھا وہاں کا جیلر ایک پارسی تھا۔ اس نے سیاح کو اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کر دیا۔ لہٰذا ان کے لئے قید میں پورے آرام و آسائش کا انتظام ہو گیا کوئین وکٹوریہ کی جبلی پر ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ جس سے ان کی سزا میں تین سال کی تخفیف کر دی گئی۔

سیاح غالب کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔ جو اردوئے معلی کے کئی خطوں سے مترشح ہے۔ نیز سیاح لکھتے ہیں۔

ہے تلمذ اسد اللہ سے ہم کو سیاح — شاعروں میں ہو نہ کیوں فخر مدلا اپنا

ایک جگہ لکھتے ہیں:

ظل کرم ہے حضرت غالب کا بس مجھے — سر پر نہیں ہے سایۂ بال ہما، نہ ہو

سیاح سے غالب کی محبت و یگانگت اُردوئے معلی کے ہر خط سے مترشح ہے۔ غالب سیاح کو، بیٹا، برخوردار، نورِ چشم، وغیرہ کے خطابوں سے یاد کرتے ہیں۔ سیاح کو بھی غالب سے اسی قدر انس اور محبت تھی۔ سیاح بھی غالب کو مالی اور قلمی امداد دیتے رہتے اور شاگردی اور دوستی کا حق ادا کرتے رہتے تھے۔

سیاح کا تخلص ان کی فطرت کے مطابق تھا۔ مرزا عسکری صاحب کا بیان ہے کہ "ابتدا میں عشاق تخلص کرتے تھے۔ مرزا نے اس تخلص کو بدل کر سیاح تخلص رکھا۔" ان کو سیر و سیاحت کا بے حد شوق تھا۔ ان کی ایک مثنوی شہر آشوب سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے گوشے گوشے کی خاک چھانی ہے سیاح نے آج کل کے سیاحوں کی طرح دو روز میں دلّی اور ایک روز میں آگرہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ جہاں جاتے وہاں کافی عرصہ رہتے اور شہر اور اہل شہر کی خوبیوں اور خرابیوں سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرتے۔ برما اور افریقہ کی سیر بھی سیاحت کے سلسلے میں کر آئے تھے۔ بنارس وغیرہ کے سفر کے حالات سیاح نے غالب کو لکھے تھے جس کا ذکر اُردوئے معلی میں ہے۔ اور غالب نے ان بیانات کو پسند بھی کیا ہے۔

قید سے آنے کے بعد سیاح کو مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا۔ کوئی ذریعۂ معاش نہ رہا میر غلام بابا کی ملازمت ترک کر چکے تھے۔ آخری عمر میں محلہ رانی تلاؤ میں ایک مکان کرایہ پر لے کر رہے تھے جیسا کہ خطوط کے مسودوں سے پایا جاتا ہے۔ کہ عسرت سے عاجز آکر اہل سورت اور رانذیر کے محمد اعظم بجام سیٹھ سے مالی امداد کے لئے درخواست کی تھی۔

سیاح نے ۱۹۰۷ء میں قریب ۹۰ سال کی پختہ عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور اپنے پس ماندوں میں صرف اہلیہ کو چھوڑا۔ مزار محلہ بڑے خاں کے چکلے میں ہے۔ خواجہ سید جلال الدین قدس سرہٗ (خواجہ دیوانہ صاحب) کی خانقاہ میں ہے۔

سیاح نظم و نثر دونوں میں دخل رکھتے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں سیاح کے کلام کا ایک نسخہ راقم کی نظر سے گذرا تھا لیکن وہ ایسا غائب ہوا کہ دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ ردیف وار کلام کا ایک مجموعہ سورت کے مشہور طبیب حکیم محمد قاسم صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ راقم نے اس مجموعہ کو منشی میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام کے نام سے مرتب کیا ہے جو ڈاکٹر زور نے ۱۹۵۷ء میں ادارۂ ادبیات کی طرف سے شائع کیا ہے۔ سیاح کا ایک مجموعۂ کلام کسی میر صاحب کی بکری چبا گئی۔

سیاح کا ایک رسالہ لطائف غیبی کے نام سے ہے۔ برہان قاطع کے جھگڑے میں یہ رسالہ غالب کی طرفداری میں لکھا گیا تھا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ مذکورہ رسالہ خود غالب کا لکھا ہوا ہے اور سیاح کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس پر مفصل بحث "منشی میاں داد خان...... کلام میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ایک کتابچہ سیر سیاح کے نام سے بھی ہے۔ اس میں سیاح کی سیر و سیاحت کی مفصل روئداد درج ہے سیاح کو سیاحت کا بے حد شوق تھا اور دکن میں حیدر آباد کے بنگلور، میسور، مدراس وغیرہ کی جی بھر کر سیر کی خوب دعوتیں اڑائیں اور مشاعرے ان کے اعزاز میں منعقد کئے گئے۔
اسی طرح دلی لکھنؤ، کانپور، میرٹھ وغیرہ بھی ان کے لئے گھر آنگن تھا۔ لکھنؤ میں ان کی بہت قدر و منزلت ہوتی تھی۔ منشی نول کشور، رجب علی بیگ سرور وغیرہ ان کے احباب میں سے تھے۔ ان کے لئے ہر جگہ شعر و سخن اور رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ ان کا بھی مفصل احوال راقم کی کتاب منشی میاں ..... کلام میں درج ہے۔

سجھو

غلام محمد نام اور سجھو تخلص تھا۔ سورت سے انہیں وطنی نسبت تھی تحصیل علم کے بعد فریضۂ حج ادا کیا۔ عرب سے لوٹنے کے بعد شہزادہ محمد جہاں خلف محمد اکبر شاہ ثانی کے مصاحب کی حیثیت سے دہلی گئے تھے۔ اپنے قیام دہلی کے موقع پر اساتذۂ دہلی مومن و ذوق سے مشورۂ سخن بھی کیا۔
دہلی سے وطن آجانے کے بعد حیدر آباد گئے۔ دیوان چندو لال کا زمانہ تھا سجھو زمرۂ ملازمین میں داخل کر لئے گئے۔ ۱۲۶۰ھ کے بعد نجم الدولہ ممتاز الملک حسین یاور مومن خاں والئ کھمبایت کی سرکار میں عہدۂ وکیل انگریزی پر فائز رہے۔ ۱۲۶۸ھ تک تو یہ کھمبایت میں تھے اس کے بعد کب تک وہاں رہے یہ معلوم نہیں۔

سجھو کی تعریف میں مصنف مخزن شعرا رقم طراز ہیں: "اگر عسجدی وقت گویم سزاوار است، اگر فردوسی عہد قوانم رواست، کلام اعجاز بیانش الہامی است وغیرہ" فائق نے مبالغہ سے کام لیا ہے سجھو کا ایک شعر ہے:

بعد عزلت کے ہوا تھا یہ سخن کا چرچا
پھر مسیحائی سجھو سے چلا سورت میں

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

اب بھرا ہے شہرۂ بھوے سارا ملک یہ
تھی ولی کے بعد خالی سرزمین گجرات کی

آئینۂ تاریخ کے بیان کے مطابق ایک دیوان ریختہ، سلام، مجرے، ایک فارسی تذکرہ خزینتہ الشعرا اور تین مثنویاں بھوے یادگار ہیں۔ ان میں سے چند غزلوں اور ایک مثنوی کا پتہ چلا ہے۔

سرور[1]

منشی آقا غلام حسین تبریزی سرور تخلص کرتے تھے۔ فارسی اور اردو میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ خوش نویس بھی تھے۔ تاریخ گوئی میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ حقیقت السورت میں ان کی کہی ہوئی تاریخیں پائی جاتی ہیں۔ سرور سورت کے نواب میر افضل الدین قمر الدولہ حشمت جنگ بہادر کی سرکار میں میر منشی کے عہدہ پر فائز تھے۔

شیفتہ

شیخ احمد نام اور شیفتہ تخلص تھا۔ شیفتہ کے والد شیخ عبد الہادی ملک عرب کے علاقہ تریم سے سورت آئے تھے۔ تجارت ان کا پیشہ تھا اور سات جہازوں کے مالک تھے۔ شیفتہ کی تعلیم قدیم طریقہ پر ہوئی تھی۔ شیفتہ کے سن شعور کو پہنچنے تک امور خاندان کا زمانۂ عروج ختم ہو چکا تھا لہٰذا شیفتہ نے معلمی کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا تھا۔ شیفتہ خط نستعلیق لکھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ خوش نویسی اب تک ان کے خاندان میں وراثتاً چلی آتی ہے۔ یہ علوی کے شاگرد تھے۔ ان کے دیوان کا مخطوطہ راقم کی نظر سے گذرا ہے۔ شیفتہ کا سال ولادت ۱۸۳۶ء ۱۲۵۲ھ اور سال وفات ۱۸۸۸ء ۱۳۰۵ھ ہے۔

شیفتہ کی اولاد میں چار بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ ان میں سے دو بیٹے بقید حیات ہیں اور محلہ سید واڑہ میں اپنے آبائی مکان میں رہتے ہیں۔

شائق[2]

میر غیاث الدین عرف سید نثر الدین متوفی ۱۸۲۰ء ۱۲۴۶ھ شائق سورت کے جید عالم

---

[1] آئینۂ تاریخ [2] مخزن اور آئینۂ تاریخ

وصوفی مولانا عبدالوہاب بخاری کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بڑودہ کے نواب حسام الدین کے نسبتی بھائی تھے۔ شائق عالم وصوفی تھے اور اُردو کے اچھے شعرا میں شمار کئے جاتے تھے۔
صاحب مخزن شعرا اور صاحب حقیقت السورت نے شائق کی علمی ادبی لیاقت اور اُردو شعر گوئی کی بہت تعریف کی ہے شائق مسجد چوڑیگر (چوڑی گران) بمقام محلہ سوداگر واڑہ ہر سال عید میلاد کے موقع پر بارہ وعظ بیان کرتے تھے۔ شائق اس مسجد کے متولی بھی تھے۔ اسی جگہ ان کے بزرگ مدفون ہیں۔ مسجد مذکور مولانا عبدالوہاب کے ایما سے ۱۹۰۵ء/۱۰۱۴ھ میں اہل محلہ نے تعمیر کرائی تھی۔ شائق نے ۱۲ شعبان کے روز ۱۸۵۹ء/۱۲۷۶ھ میں انتقال کیا۔
۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ کے ہنگامہ کے بعد شائق نے اس سانحہ پر نظم لکھی تھی۔

شعلہ

حسین یاور خان عرف بڑے آقا ولد مرزا خان سورت کے ایک متصدی فارس خان کی اولاد میں سے تھے۔ شعلہ ایک مدت تک ریاست کھمبائت میں بہ عہدۂ فوجدار رہ چکے تھے۔ ۱۸۶۴ء/۱۲۸۰ھ میں بمرض ہیضہ انتقال کیا۔ شعلہ صاحب دیوان تھے۔

شیدا

سیّد عبدالقادر بن سید عبداللہ قادری سورت کے ایک معزز اور علم دوست خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ ان کا سنہ ولادت ۱۸۴۸ء/۱۲۶۴ھ ہے۔ سرکار برطانیہ میں محکمہ آبکاری میں بہ عہدۂ انسپکٹر فائز تھے۔
شیدا کو اُردو فارسی، عربی اور انگریزی میں دسترس حاصل تھی۔ عربی فارسی میں معلم شیخ محمود باعلکظ ان کے استاد تھے اور شاعری میں بہ علوی کے شاگرد تھے۔ علم مسمرزم کا بہت شوق تھا ڈاکٹر ڈاڈز کے مسمرزم سے متعلق رسالوں کا شیدا نے اُردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ شیدا نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ بنام ترانۂ خیال شائع کیا تھا۔ ان کی کوئی تصنیف راقم کی نظر سے نہیں گذری ہے۔ حقیقت السورت میں ان کے لکھے ہوئے تاریخی قطعے ملتے ہیں۔

علوی[1]

سیّد علوی بن سیّد محمد بن سیّد احمد بن سیدنا حسین العیدروس علوی تخلص کرتے تھے۔ علوی صاحب کے والد نے اپنی عین حیات میں انہیں سجادۂ پیر طریقت پر بٹھلادیا تھا۔ موصوف نے عربی فارسی میں معلم ابراہیم باعکظہ اور سید عبداللہ قادری سے اکتساب کیا تھا اور شعر و سخن میں میاں مجھوان کے استاد تھے۔ آخری عمر میں علوی صاحب زیادہ تر مشاغل باطنی میں مصروف رہے اور ۱۸۹۷ء/۱۳۱۵ھ میں ۲۵۔ جمادی الاول کے روز انتقال کیا۔ آپ کا سنہ ولادت ۲۵ رمضان ۱۸۲۵ء/۱۲۴۱ھ ہے۔ مزار سیدنا علی بن عبداللہ عیدروس کے گنبد کے متصل واقع ہے۔

علوی نے کافی کلام یادگار چھوڑا ہے۔ ان کے ایک شاگرد محمد امیر الدین عرف سیّد میاں المتخلص بہ آزاد نے ۱۸۸۱ء/۱۲۹۹ھ میں اپنے استاد کے نعتیہ کلام کا مجموعہ بنام غنچۂ ارم اور غزلیات کا مجموعہ بنام حدیقۂ بے نظیر بمبئی سے شائع کیا تھا۔ غنچۂ ارم راقم کے سامنے ہے۔

صاحب مخزن شعرا نے علوی کا تخلص زیرک لکھا ہے جو کسی اور جگہ نظر سے نہیں گذرا ہے۔ غنچۂ ارم کی طباعت پر خطیب عبدالنعم باعکظ، محمد منظور، خاموش، آزاد، طپش وغیرہ نے قطعات لکھے ہیں۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ پنجابی زبان میں حکیم عبدالوہاب نے گجراتی میں عبدل جی نے اور سیّد فخر الدین عیدروس صاحب ریٹائرڈ اسسٹنٹ کلکٹر نے انگریزی میں قطعے کہے ہیں جن کو اُردو رسم خط میں چھاپا گیا ہے۔

غنی[1]

خواجہ ابراہیم پہلے مفلس تخلص کرتے تھے۔ ایک روز نواب ابراہیم خاں محب نے کہا کہ مفلس کی بجائے غنی تخلص کیا کرو۔ خواجہ نے فی البدیہہ شعر کہا:

کب تک رکھیگا مفلس اے چرخ بدگہر تو　　　یاقوت جاں نے مجھکو اب تو غنی کیا ہے

غنی بڑودہ کے نواب حسام الدین کی سرکار میں بطور طبیب ملازم تھے۔ صاحب مخزن شعرا کا بیان ہے کہ غنی نے بلا کا حافظہ پایا تھا۔ اساتذہ کا بے شمار کلام یاد تھا۔

---

[1] ضمیمہ عیدروس خاندان

غنی[1]

نواب سیدی عبدالغنی خاں نواب سیدی عبدالکریم خاں دوم خلف نواب محب کے بیٹے اور نواب اخلاص کے برادر زادہ تھے۔ سالار اور غنی تخلص کرتے تھے۔ ۱۲۸۱ھ میں ان کا جشن شادی بڑے اہتمام سے منایا گیا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد سے شہر بمبئی میں اقامت اختیار کرلی تھی۔ ۱۳۰۲ھ میں غنی نے وفات پائی۔

فاضل[2]

شیخ فاضل عرف ڈوسو میاں، بخشو میاں بخش کے چھوٹے بھائی تھے۔ چند سال سورت اور بھروچ میں عدالت عالیہ میں بہ عہدہ منصف سرفراز رہے اس کے بعد سندھ چلے گئے۔ سندھ میں ان کے کار نمایاں کی وجہ سے خان بہادر کا خطاب عطا ہوا تھا۔ سندھ میں ان کے نام سے دو گاؤں بھی آباد ہیں۔ ایک کا نام فاضل آباد ہے۔ ۱۲۸۸/۱۸۷۱ء میں علالت کی وجہ سے وطن آگئے تھے یہاں ۱۲۸۹/۱۸۷۲ء میں بطور آنریری مجسٹریٹ خدمت انجام دیتے رہے۔ میاں بھو کے شاگرد تھے۔

فرحت[3]

فرحت تخلص تھا۔ نواب سیدی ابراہیم خاں محب کے چھوٹے بیٹے اور نواب سیدو میاں اخلاص کے چھوٹے بھائی تھے۔

قطب[4]

ملا قطب الدین حسن بن ابوالفتح بن عمدۃ التجار ملا فخرالدین مفتی قطب تخلص کرتے تھے۔ ملا خاندان کے عبدالغفور نے دولت جمع کی اور قطب نے ٹھکانے لگائی۔ روز و شب عیش و

---

[1] ضمیمہ نواب سیدی کا خاندان [2] ضمیمہ۔ شیخ فاضل کا خاندان [3] ضمیمہ۔ نواب سیدی کا خاندان
[4] ملا عبدالغفور کا خاندان۔

طرب کی محفلیں گرم رہتیں۔ خاندان کے بزرگوں سے راقم نے سنا ہے کہ ایک وقت یہ دالان میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے روپیوں کی چند تھیلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ رقم ان کے آخری جہاز کی فروخت سے حاصل ہوئی تھی۔ اس دوران میں ان کی ایک داشتہ کہیں آئی۔ ملا صاحب نے فرط خوشی میں کہا۔ خورشید! اگر یہ تھیلیاں بیک وقت تو اٹھالے تو تجھے بخش دوں۔ خورشید نے تھیلیاں اٹھائیں اور گھر کا رخ کیا۔

ملا صاحب صاحب ذوق تھے۔ علما شعرا وغیرہ ہمیشہ ان کی سرکار سے منسلک رہے ہیں ملا صاحب کا ایک مختصر دیوان راقم کے پاس موجود ہے۔ ان کے ہاتھ کا ایک تعبیر نامہ بھی راقم کے پاس ہے مذکور تعبیر نامہ پر سنہ ۱۸۳۷ء/۱۲۵۳ھ ہے اور بمقام بمبئی نقل کیا گیا ہے۔ ان کا سال ولادت معلوم نہیں۔ ۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ میں انھوں نے انتقال کیا۔

کامل

میر کمال الدین حسین رضوی خلف سید باقر صاحب کامل تخلص کرتے تھے۔ موصوف کا سلسلۂ نسب سید احمد جعفر شیرازی کے واسطے سے دسویں امام محمد نقی تک پہنچتا ہے۔ سید نورالدین فائق صاحب مخزن شعرا کے ایک رشتے سے بھائی تھے۔ ان کا مولد سورت تھا لیکن سن شعور سے موصوف احمد آباد میں اقامت پذیر تھے۔

کامل نے قاضی نورالدین فائق کے والد (اپنے چچا) اور مولوی نور محمد سے تحصیل علم کیا تھا۔ مخزن شعرا کا پیش لفظ کامل ہی نے لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نثر نویسی میں بھی موصوف کو قدرت حاصل تھی۔

منظور

شیخ محمد منظور ولد شیخ عبداللہ بلذرم الریمی الیمنی القریشی منظور تخلص کرتے تھے۔ سورت کے عرب تاجروں میں ان کا خاندان مشہور تھا۔ ان کا آبائی مکان محلہ سید واڑہ میں چند سال قبل تک موجود تھا۔ منظور نے خانقاہ عیدروسیہ میں قدیم طرز پر تعلیم حاصل کی تھی۔ سورت کے نامور عالم معلم ابراہیم خطیب جامع مسجد بمبئی سے بھی منظور نے تحصیل علم کیا تھا۔ منظور کا سنہ ولادت ۱۲۳۶ھ ہے اور ۱۳۰۸ھ میں انتقال کیا۔ مولوی محمد منعم باعکظ خطیب جامع مسجد بمبئی نے ولادت

دوفات کا قطعہ کہا ہے :

کامل عصر محمد منظور   افتخار علمار وفضلا
رخصت بست چوں کرد فردوس را   شور و فریاد و فغاں شد پیدا
سن میلاد فرح افزائش   بود از شاعر سورت پیدا

۱۲۳۷ھ

چوں برآں لفظ الم افزودم   یافتم سال وفات اورا
یعنی منعم بدل زار و حزیں   الم شاعر سورت گفتا

۱۳۰۸ھ

منظور کو علم و ادب کے علاوہ شعر و سخن سے بھی شغف تھا۔ اس عہد کی علمی ادبی صحبتوں نے منظور کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع دیا اور سونے پہ سہاگا تجھو جیسے استاد مل گئے۔ یہ اپنے استاد کی زندگی ہی میں استادانِ فن کی صف میں جگہ پا چکے تھے۔ منظور اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ سید عبد الرحمٰن جیوا میاں عیدروس صاحب آئینہ مانوس (تاریخ گجرات) کا بیان ہے کہ منظور نے نظم و نثر میں کل سات تصانیف یادگار چھوڑے ہیں۔ ۱۸۶۰ء میں سورت سے منظور الاخبار کے نام سے اخبار جاری کیا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ سال چھ مہینے میں موقوف ہوگیا۔ فارسی دیوان کا پتہ نہ چلا۔ اردو غزلوں کا ایک مجموعہ ۱۲۶۹ھ میں بمبئی سے شائع ہوا تھا۔ دو بزمیہ مثنویاں منظور جہانی اور جگر سوز بمبئی سے شائع ہو چکی ہیں۔ منظور جہانی کا سنہ تصنیف ۱۲۶۵ھ اور جگر سوز کا ۱۲۶۹ھ ہے۔ ۲۰ شعر کی ایک مختصر سی مثنوی اپنے استاد تجھو کی افیونی نامہ کے جواب میں در مذمت افیون ۱۲۶۵ھ میں لکھی تھی۔ منظور کی ایک مثنوی دریا موج کے نام سے ہے۔ یہ سورت کے ۱۲ ذی قعدہ ۱۳۰۰ھ کے قیامت خیز سیلاب کے بیان میں ہے۔ ۱۳۱۲ اشعار پر مشتمل ہے۔ منظور نے دیوان ولی بھی مرتب کیا تھا۔ یہ ۱۲۹۰ھ میں بمبئی سے شائع ہو چکا ہے۔ نثر میں ایک تصنیف گلدستۂ نشاط و سرور کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

دونوں استاد و شاگرد لکھنوی مکتبِ خیال سے زیادہ متاثر تھے۔ ان دونوں کے دم قدم سے سورت میں شعر و سخن کا چرچا تادیر قائم رہا۔

لہ آئینہ تاریخ

یکتا

شیخ لعل شانہ گر یکتا تخلص کرتے تھے۔ پیشہ شانہ گری تھا۔ یکتا علوی کے شاگردوں میں سے تھے۔ بنو میاں ذکا اور میاں داد خاں سیاح سے ادبی نوک جھونک رہتی تھی۔ سیاح نے اپنی ایک غزل میں انہیں خوب لتیھڑا ہے۔

ذکا

بنو میاں عرف اڑبھنگ بنو تخلص کرتا تھا۔ لیکن آخری عمر میں ذکا تخلص کرنا شروع کیا تھا ذکا غدر کے بعد کا ایک ان پڑھ شاعر ہے یہ یکتا کا معصر تھا اس کا وطن سورت ہے ذکا کے خاندان کے لوگ ابھی بھی سورت میں محلہ بندیل واڑہ میں رہتے ہیں افسوس کہ ان سے بھی ذکا کے زیادہ حالات زندگی معلوم نہ ہو سکے۔ کہا جاتا ہے کہ سن شعور سے ہی اس کی ذہانت طبع و حاضر جوابی اس کے لئے موجب شہرت ہوگئی تھی خوش قسمتی سے اہل ذوق کی ہم جلیسی نے ذکا کی جولانی طبع کو اور اجاگر کر دیا۔ اس کے عرف کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ہر صحبت میں کوئی نہ کوئی فقرہ یا طبع زاد شعر پڑھ دیا کرتا اور اس کی طبیعت کی اوپج کی وجہ سے لوگ اسے بنو اڑبھنگ کہنے لگے۔

ذکا کے زمانہ میں سورت میں مجلس کلام بازی کا بہت شوق تھا۔ ان مجالس میں ریختہ خوانوں کے گروہ ایک دوسرے کے مقابل بیٹھتے اور ردیف وار نعت، منقبت، ریختہ، مسدس اور اخیر میں ہجو پڑھتے ایک گروہ کے کچھ لوگ پڑھتے اس کے بعد دوسرا گروہ اس سے بہتر کلام اسی ردیف میں پیش کرنے کی کوشش کرتا اور اس طرح ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کے خیال سے بعض اوقات اساتذہ کوئی البدیہہ مرمجلس لکھ کر سنانا ہوتا تھا مجلس کے ختم ہونے تک ہجو پر نوبت پہنچ جاتی تھی آخر میں مجلس برخواست کر دی جاتی تھی۔ ذکا کی چونکہ طبیعت رواں تھی یہ بھی سورت کے ایک مشہور مجلس خواں ملا ہاشم کے گروہ میں شامل ہو گئے ذکا کا حافظہ اس بلا کا تھا کہ ہزاروں شعر از بر ہو چکے تھے اور ایسی مجلسوں میں بڑا کامیاب رہتا تھا۔

بعض دنگلوں میں ذکا فی البدیہہ کہہ کر مقابل کے گروہ پر بازی لے جاتا۔ اس

طرح خوب مشق سخن ہوگئی تھی۔

ذکا اصناف سخن میں ریختہ، مسدس وغیرہ میں طبع آزمائی کرتا تھا لیکن ہجو کہنے میں امتیازی طور پر مشہور تھا۔ پہلے تو زرِ روزی سے اپنا پیٹ پال لیتا مگر جب ہجو میں زیادہ مشق ہوگئی تو اسی کو ذریعہ معاش بنا لیا۔ اس زمانہ کے امراء رؤسا اس کی زورِ طبیعت سے خائف تھے اور کچھ نہ کچھ اس کو دیدیا کرتے تھے رؤسا میں خاص طور پر بوہروں کے بڑے ملا صاحب نواب بیلا اور میر غلام بابا ذکا کی ہجو کے شکار تھے۔ ان رؤسا کے ہاں سے ذکا کو ہر ماہ تنخواہیں ملتی تھیں ایک دفعہ میر غلام بابا نے سرِ دربار ذکا کو نہایت قیمتی خلعت عنایت کیا۔ دربار ختم ہونے پر ذکا مکان آئے۔ ذکا کے پیچھے ہی میر صاحب کا چوبدار آیا اور کہا کہ سرکار نے وہ خلعت واپس طلب کیا ہے اور اس کی قیمت کی یہ رقم بھیجی ہے۔ ذکا نے جواب دیا کہ وہ خلعت تو بازار میں بک بھی گیا اور رقم قرض خواہوں کو ادا بھی کردی گئی۔ اب چاہیے تو فلاں شخص کو یہ رقم دے کر خلعت واپس لے جا۔

منشی نولکشور نے اپنے سفرِ سورت میں ذکا کا کلام سنا اور بہت پسند کیا تھا۔ منشی صاحب نے ہی ہجو سے ذکا تخلص کرنے کے لئے کہا۔ کہتے ہیں کہ منشی صاحب ذکا کو اپنے ہمراہ دہلی و لکھنو بھی لے گئے تھے۔ ذکا کا تھوڑا کلام راقم کے پاس محفوظ ہے۔

رفعت

محمد قاسم شوکت کے شاگردِ رشید رفعت تخلص کرتے تھے۔ سورت وطن ہے اور یہیں تعلیم حاصل کی۔ رفعت نے اعلیٰ تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی مگر مطالعہ کا بے حد شوق تھا اس لئے وسیع معلومات رکھتے تھے۔ ڈاکٹر سید جلال الدین صاحب قادری کے دواخانہ میں ایک مدت تک بحیثیت کمپاؤنڈر کام کرنے کے بعد سورت میں اپنا ذاتی مطب کھولا مگر کچھ سال کے بعد مطب کرنا موقوف کردیا۔

رفعت نہایت خوش خلق اور سنجیدہ مزاج شخص تھے۔ اپنے بزرگوں کا بہت احترام کرتے اور ہر ایک سے بہت انکسار و خلوص سے ملتے۔ انداز گفتگو نہایت عمدہ تھا۔ باوجود ایک خوش گو اور کہنہ مشق شاعر ہونے کے کبھی اپنی شاعری پر فخر نہیں کیا۔

آغا شاعر کے قیام سورت میں رفعت نے ان سے بھی چند غزلوں پر اصلاح لی تھی۔ رفعت کے ہاں سلاست زبان ہے۔ سورت کے ایک مشاعرہ منعقدہ بر مکان میر زین الدین بخشی شیدا

سورت کے ایک استاد شاعر مفتی مہدی حسن آزادؔ نے رفعت کی غزل کے بعد غزل نہیں پڑھی۔ ایک دفعہ برہانپور کے ایک شاعر آغا برہانپوری سورت آئے ہوئے تھے انھوں نے مصرع دیا تھا "سامنے میری نظر کے آپ کی تصویر ہے" اس زمین میں رفعت نے نہایت اچھے شعر کہے ہیں۔ (دیکھئے نمونہ) رفعت کے شاگردوں کا حلقہ وسیع تھا۔ ان میں سے حکیم سید نور نورؔ قابل ذکر ہیں۔ رفعت کے بیٹے ابراہیم رحمتؔ مرحوم اور غلام محمد عزیزؔ بھی شاعر ہیں۔

سعید

حکیم احمد سعید عرف حکیم بھورے بن مولوی محمود سورت کے ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتے تھے شہر میں اچھے طبیبوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ محلہ ہری پورہ میں رہتے تھے اور مطب بھی وہیں تھا۔ ان کا ایک خاص حلقۂ احباب تھا جس میں بیشتر علم دوست حضرات تھے۔ راقم کے والد ان کے ہم پیالہ اور ہم نوالہ تھے۔ سعید نے جس کو ایک وقت دوست بنایا اس سے آخر دم تک نباہا یہ خوبی بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

سعید نے تحریک ترک موالات کے زمانہ میں خلافت کی تحریک میں بہت نمایاں حصہ لیا تھا اور اس کے بعد بھی قوم کی خدمت ہر ممکن طریقے پر کرتے رہے۔ آخر عمر میں ہر چیز سے دست کش ہو گئے تھے۔ قریب ساٹھ سال کی عمر میں ۱۹۲۹ء ۱۳۵۸ھ میں بمرض فالج انتقال ہوا۔ اوائل عمر سے شعر و سخن کا شوق تھا پہلے آغا شاعر سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ لیکن بعدہٗ تجمل جلالپوری کو کلام دکھاتے تھے۔ تاریخ گوئی میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ بہت تھوڑا کلام دستیاب ہوا ہے جس میں چند غزلیں اور چند تاریخیں اور چند قومی نظمیں ہیں۔

شوکت[1]

میر معین الدین بن میر افضل الدین خاں بخشی شوکتؔ تخلص کرتے تھے۔ سورت کے بخشی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ خدا نے جاہ و ثروت کے ساتھ علم و ادب کی دولت سے نوازا تھا۔ چونکہ فکر معاش سے بری تھے، ساری عمر امراء و رؤساء کی صحبتوں میں گذری۔

---

[1] ضمیمہ بخشی خاندان

شعروسخن سے خاص لگاؤ تھا۔ اپنے مجموعۂ کلام چمنستان شوکت میں فرماتے ہیں: "اوائل عمر میں بندہ کی طبیعت شعروسخن پر مائل تھی۔ اور خوش قسمتی سے واقعات بھی ایسے پیش آئے کہ آئے دن بزرگان باکمال کی نظرِ عنایت پڑنے لگی۔ ابتدا میں محض غزل گوئی پر اکتفا کی۔ لیکن جب مخدومی مکرمی استاذی افسرالشعرا حضرت آغا شاعر صاحب قزلباش دہلوی سے نیاز حاصل ہوا تو بندے نے زانوے ادب ان کے سامنے تہ کیا۔" آغا شاعر سے پہلے شوکت کسی سے اصلاح نہیں لیتے تھے۔ شعروسخن کا شوق ضرور تھا۔ لیکن امرا کی صحبت نے بیکار بنا دیا تھا۔ کسی کی شان میں قصیدہ کہہ دیا تو کسی کی تاریخ وفات، کسی امیر کے ساتھ شکار کو چلے گئے تو تمام واقعہ کو منظوم لکھ ڈالا۔ چمنستان شوکت میں ایک جگہ فرماتے ہیں آغا شاعر نے اکثر اسقام بتائے جن کی طرف انھوں نے کبھی توجہ نہیں کی تھی۔ لہٰذا ابتدا کا تمام کلام دریابرد کر دیا۔ اور از سرِنو مشق شروع کی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ آغا شاعر نے فرمایا۔ غزل گوئی سے واقعہ نویسی بہتر ہے۔ اور بجائے دور از خیالات کے پیش پا افتادہ مضامین سلیس محاوروں میں فصاحت سے ادا کئے جائیں۔ اسی وجہ سے غزل گوئی شاید ترک کر دی ہو۔ ایک مختصر سا مجموعۂ کلام راقم کے والد بزرگوار سید حمید الدین سورتی جمعدار کے اہتمام سے شائع ہوا۔ اس میں ۴۴ غزلیں، قصیدے، نظمیں۔ ولادت و وفات کی تاریخیں وغیرہ ہیں۔

شیدا[1]

میرزین الدین شیدا تخلص کرتے تھے۔ وہ بخشی خاندان کے ایک فرد تھے۔ خاندانی وظیفہ پر گذر اوقات کرتے تھے۔ شیدا کی زبان میں بہت لکنت تھی۔ مشاعرہ میں خود غزل نہیں پڑھتے کسی اور کو پڑھنے کے لئے دیدیتے تھے۔

شاد

منشی عبدالقادر خواہرزادۂ مولوی محمود شاد تخلص کرتے تھے۔ دینی تعلیم مولوی محمود سے حاصل کی تھی۔ خوش خطی اور شاعری کا شوق تھا۔ محلہ شگرام پورا کی ایک مسجد میں مکتب پڑھاتے

---

[1] ضمیمہ ۱ دیکھئے بخشی خاندان

اور امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ تقریباً اسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ۱۹۲۰ء سے شعر گوئی ترک کر چکے تھے۔

قطب (منشی)

منشی قطب الدین خلف میاں احمد وینگری قطب تخلص کرتے تھے۔ پیشہ معلمی تھا۔ اس لئے منشی کہے جاتے تھے۔ قطب نے عربی فارسی میں واجبی تعلیم حاصل کی تھی۔ نجوم اور جفر میں بھی دخل رکھتے تھے۔ قطب کی شادی ملا امیر الدین کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ قطب نے گیارہ فروری ۱۹۰۶ء کو انتقال کیا۔

منیر

حافظ نور الدین بن شمس الدین تلمیذ تحمل جلال پوری منیر تخلص کرتے تھے۔ ۱۸۶۸ء ۱۲۸۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ولادت کا مادۂ تاریخ "حافظ گنہگار" ہے۔ فارسی، عربی اور دینیات کی تعلیم حافظ عبداللہ اور مولوی محمود سے حاصل کی۔ جناب منیر نہر مند شخص تھے۔ زردوزی کا کام بہت صنعت گری سے کرتے تھے۔ ایک مدت تک زردوزی ذریعۂ معاش رہا۔ آخری عمر کے چند سال کے لئے معلمی اختیار کر لی تھی۔ چنتیس سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ یہ ان کی دیرینہ آرزو تھی جو اللہ نے پوری کی۔ خدمت الناس کے جذبے نے عمر بھر انہیں اصلاحی کاموں میں مصروف رکھا۔ اصلاحی نظمیں خوب کہتے تھے۔ تاریخ گوئی میں انہیں مہارت حاصل تھی۔ شہر میں ہر جگہ ان کی کہی ہوئی تاریخیں ملتی ہیں۔ منیر نے بتاریخ ۲۳۔ جمادی الاخر ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۵ نومبر ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔ حافظ بہادر کے قبرستان میں دفن کیا گیا ہے۔

منیر کی اولاد میں احمد میاں، عبدالقادر بیٹے اور مریم بی بی بیٹی ہیں۔ احمد میاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آئی سی۔ ایس کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے کہ ۱۹۱۱ء میں مرض پلیگ میں انتقال کیا۔ عبدالقادر حکیم چی چی فارمیسی میں بطور منیجر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ موصوف بھی اپنے والد کی طرح ہر ممکن طریقہ پر خدمات انجام دیتے ہیں۔ مفردات میں انہیں بہت مہارت حاصل ہے۔ انہیں علمی ادبی کاموں اور تلاش و تحقیق سے بے حد شغف ہے۔ شہر کے آثار قدیمہ سے متعلق ان کی معلومات قابل وثوق ہیں۔ گجراتی میں ان کی ایک کتاب

"سونیر" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ پٹنی جماعت کی تاریخ سے متعلق ہے۔ کتاب قابل قدر ہے۔

منعم

منعم کا نام شیخ محمد عرف عبدالمنعم ہے۔ منعم کے بزرگ عرب سے ہندوستان آئے تھے۔ ان کا خاندان باعکظ کے نام سے مشہور ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ شیخ محمد باعکظ سید زین العابدین علی بن محمد بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن السقاف بن شمس الشموس سید محمد عیدروس کے ہمراہ حضرموت سے ہند آئے تھے۔ منعم کے والد شیخ ابراہیم باعکظ عالم و فاضل تھے۔ موصوف نے تقریباً پچاس سال بطور خطیب جامع مسجد بمبئی اور صدر معلم مدرسۂ محمدیہ خدمات انجام دیں۔ ان سے پہلے اسی خاندان کے بزرگ معلم ابراہیم متوفی ۱۲۸۲ھ شیخ عبدالحمید بن معلم ابراہیم متوفی ۱۳۰۸ھ میں خدمت جلیلہ انجام دے چکے تھے۔ منعم کی اولاد میں دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ بڑے بیٹے عبدالمجید عرف معلم صاحب سندھیا اسٹیم نیویگیشن کمپنی میں عہدہ جلیلہ پر فائز تھے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد پاکستان چلے گئے۔ چھوٹے بیٹے عبدالرشید بہت قابل اڈوکیٹ نے جوانی ہی میں انتقال کیا۔

سید عظیم الدین منادی

سید عظیم الدین خلف سید فخرالدین المتخلص منادی سورت کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی ولادت ۱۸۹۰ء کے آس پاس ہوئی تھی۔ منادی صاحب نے عرصۂ دراز تک موتی کے مرب تاجر شیخ قاسم محمد الابراہیم کے سکریٹری اور منیجر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۲۶ء میں یہ اپنے آقائے ولی نعمت کے ساتھ لندن بھی گئے تھے جہاں تقریباً دو سال قیام کیا تھا۔

منادی صاحب کو علم و ادب شعر و سخن سے زیادہ شغف تھا۔ ۱۹۲۸ء میں تجارت کے چکر سے نکل کر سورت میں چھاپا خانہ قائم کیا اور مسلم گجرات کے نام سے ایک ہفتہ وار گجراتی اخبار کا اجرا کیا جو اب تک اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔ ہفتہ وار مسلم گجرات گجرات میں مسلمانان گجرات کا اہم ترجمان ہے۔ مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، تعلیمی مذہبی اور علمی ادبی مسائل

کے سلسلہ میں اس اخبار نے پچاس سال کے عرصہ میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔

مناوی صاحب گجراتی زبان کے ادیب و شاعر تھے۔ اُردو میں بھی شعر کہتے تھے مگر بہت کم کہا ہے۔ گجراتی زبان میں ان کا کافی کلام ہے۔ گجراتی زبان و ادب میں موصوف نے ایک مخصوص اسلوب رائج رائج کیا ہے۔ اس میں اُردو فارسی الفاظ کا استعمال اور ان کی گجراتی املا خصوصیت رکھتے ہیں۔ اُن کے مرغوب موضوع قرآن حکیم اور علامہ اقبال ہیں۔ قرآن حکیم اور علامہ اقبال کے سلسلہ میں ان کا کتب خانہ بڑی خصوصیت رکھتا ہے۔ انھوں نے علامہ اقبال اور جرمن فلسفی گوئٹے کی تخلیقات کا گجراتی نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ گجراتی زبان میں مناوی صاحب کی تصانیف میں سیرالنبی دو جلدیں فتاویٰ تین جلدیں، پیام مشرق، بال جبریل اور گوئٹے کے منظوم ترجمے، حیات محمد علی، علامہ فرید وجدی کی المرۃ المسلمہ عربی سے گجراتی وغیرہ خصوصیت رکھتی ہیں۔ گوئٹے کا ترجمہ پاکستان کے جرمن سفیر کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ موصوف کو فن خطاطی سے بڑی محبت تھی۔ بذات خود خطاط تو نہیں تھے مگر فن سے خوب واقف تھے اور ان کے کتب خانہ میں اس سلسلہ کی نایاب کتابیں محفوظ ہیں۔ موصوف نے نستعلیق کے ٹائپ رائٹر کا بھی نقشہ مرتب کیا ہے جو قابل غور ہے۔

مناوی صاحب نے مسلمان قوم کی تعلیم و تربیت میں بطور خاص خدمات انجام دی ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں سورت ڈسٹرکٹ مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے قیام کے سلسلہ میں سید حمیدالدین سورتی جمعدار کے مناوی صاحب خاص الخاص معاون و بنیادی رکن تھے۔ سوسائٹی کے اسکول کے قیام اور اس کی بقا و ترقی میں مناوی صاحب کا اہم حصہ ہے۔ اخبار کے ذریعہ اسکول کے لئے کثیر رقم انہیں نے جمع کی تھی۔ سالہا سال سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے بھی خدمت انجام دی ہیں۔

مناوی صاحب اسی سال کی عمر میں اگرچہ مرض لقوہ کی وجہ سے صاحب فراش تھے مگر علمی و ادبی خدمت کا سلسلہ بدستور قائم تھا۔ مناوی صاحب کے بھائی سید عبداللہ بھی شاعر ہیں ناوی تخلص کرتے ہیں۔ ابتدا سے چھاپا خانہ کا کاروبار ان کے ذمہ تھا۔ مناوی صاحب نے ۱۹۷۲ء میں انتقال کیا۔

حشمت

راقم السطور کے والد سید حمیدالدین بن سید نصیرالدین سورتی جمعدار بماہ ستمبر ۱۸۶۷ء بمقام سورت پیدا ہوئے اور میدان عمل کے اس سپاہی نے جون ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔

والد صاحب کو شعر و سخن سے شغف تھا۔ میاں داد خاں سیاح اور آغا شاعر سے مشورۂ سخن کیا ہے[1]

مندرجہ ذیل شعرا بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

محمد اسحاق۔ اسحاق۔ عبدالکریم۔ تبسم۔ حافظ غلام حسین۔ حزیں۔ سید رفعت اللہ۔ رفعت۔ مرزا غلام علی۔ شرر۔ غلام زین العابدین۔ عابد۔ ملک سردار۔ فہیم۔ میر ضیاء الدین۔ مجروح۔ سید غلام محی الدین۔ مخلص۔ میر عزیز اللہ۔ ہمرنگ۔ رکھو۔ تسکین۔ فرحت۔ یعقوب۔

نمونۂ کلام

اخلاص

نظیر اکبر آبادی کے جوگی نامہ کو اخلاص نے مصرعے بٹھا کر خمسہ کیا ہے خمسے کے چند بند:

جائے قرطاس اگر ہو ورقِ چرخِ کہن
کہکشاں خامہ ہو اور عقدِ ثریا قطِ زن
ہو سیاہی کے عوض آبِ فراط اور چمن
ہو رقم کس قلمِ شوق کے اے غنچہ دہن
اشتیاق کر بیدار تو دار دل من

غم سے فرصت ہو تو بستاں میں گلوں کو دیکھیں
یہ ہوس دل میں نہیں سیرِ گلستاں کریں
خلد بھی ہو تو جنوں رہنے نہ دیوے اس میں
دور جس دن سے ہوا تجھ چمن حسن سے میں
نہ مجھے باغ خوش آتا ہے نہ گلشن نہ چمن

عشق سے میرے نہ ہر ایک ہو کیونکر باہر　　یاد و کاکل میں نکلتا ہوں گھر سے باہر
حال ابتر نے کیا رازِ نہاں سب ظاہر　　چشم نمناک، جگر چاک، پریشاں خاطر
چاک پر چاک گریباں سے لگا تا دامن

ہمدموں سے نہ کبھو دردِ جگر کہہ جانا　　شکلِ تصویر ہو خاموش الم سہہ جانا
صورتِ شمع سرشکوں میں ہمیں بہہ جانا　　گر کوئی پوچھے تو منہ دیکھ کے چپ رہ جانا
نہ تکلم نہ اشارہ، نہ حکایت، نہ سخن

آہ دل برق مرے سینہ سے چمکاتی ہے　　ابرِ غم سے مری اس دل پہ گھٹا چھاتی ہے
بانگ نالہ کی میرے رعد کو شرماتی ہے　　جب میں روتا ہوں تو آنکھوں سے برس جاتی ہے
کبھی ساون کی جھڑی یا کبھی بھادوں کی بھرن

خوف درباں سے ترے یار پڑا پھرتا ہوں　　جب کہیں میں ترے کوچہ سے سوا پھرتا ہوں
خاک اڑاتا ہوا میں مثلِ صبا پھرتا ہوں　　رات دن ہجر میں جوگی سا بنا پھرتا ہوں
بیقراری سے ترے نام کی جپتا سمرن

جوگی اس طرح سے ہم تیری جدائی میں بنے　　جائے بت ہم کو پرستش ہے تصور سے ترے
نہ رکھیں حاجتِ ناقوس کبھی نالوں سے　　دوشِ پر بار الم کانوں میں غم کی مندرے ہے

سیلابِ اشک اوج پہ آیا ہے یہاں تک　　ہر بیضۂ ہماں پہ گماں ہے حباب کا

کشتہ ہوں میں جو حسرتِ دندانِ یار کا　　پانی بھی غسل کا ہو دُرِ آبدار کا
(تاریخ گجرات)

پوچھا جو حال روزِ قیامت کا یار سے　　رخ سے نقاب بام پہ جا کر اٹھا دیا
یاں تک ہے مجھ کو ذوقِ گدائی کوئے یار　　سایہ کو سر پہ آیا ہما تو اڑا دیا
وہ شرم سے کبھی نہیں آتا ہے سامنے　　مجھکو خدا نے کیوں نہیں رو در قضا دیا
از سرِ نو سلسلہ جنباں جنوں اخلاص ہے　　یاد پھر آنے لگے اس شوخ کے کاکل کے پیچ
ناتوانی نے کیا صیاد! بے محنت اسیر　　حلقہ ہائے دام تھے وہ دودِ دلِ بلبل کے پیچ

اس قدر نیچا دکھایا ہے ندامت نے مجھے — اپنا سوئے آسماں دستِ دعا ہوتا نہیں
کیوں نہ لذت غم کو دیوے تیرے شوریدہ کا گوشت — جو کباب بانمک ہے بے مزا ہوتا نہیں
دل میں آتا ہے جلا کر خاک نامے کو کریں — نامہ بر کوئی ہمارا غیرِ صبا ہوتا نہیں

بام پر آتا ہے جو وہ مہروش نزدیکِ شام — نکلے ہے خورشیدِ شب گویا قمر سے پیشتر

مر گئے ہاتھ سے چھٹتے ہی کنارِ دامن — رشتۂ عمر مگر تھا ترا تارِ دامن

سوزِ جگر نے موم سراپا بنا دیا — سنگِ مزار شکل ہے شمعِ مزار کی
سرسبز دل ہے یاد سے اس گلعذار کی — تاثیر ہر نفس میں ہے بادِ بہار کی

(مخزن)

اخگر

غزل

گرم جو ہے غیرتِ ماہِ منور کا مزاج — آتشیں ایسا کہاں ہے مہرِ انور کا مزاج
ماہ رو کے عشق میں کیا کیا تہ و بالا کیا — کچھ نہیں سے ہے پھر اس چرخِ چنبر کا مزاج
برق وش کے لب پہ لب رکھ کر جو پانی انار غیر — زہرِ قاتل ہو گیا افسوس شکر کا مزاج
گرد دلِ عشاق سے چھٹتا نہیں ہے قاتلا — سرد کیا ہو گیا ہے تیرے خنجر کا مزاج
اب تو کھائی ٹھوکریں ہیں غیر کی جوں سنگِ راہ — جو اٹھا سکتے نہیں ہیں ناز پرور کا مزاج
ایک اب قطرہ نہیں نکلے ہے سوزِ ہجر سے — خشک ایسا ہو گیا ہے دیدۂ تر کا مزاج
قطرۂ اشک آنکھ سے گرتے ہی دریا ہو گیا — غم میں بحرِ حسن کے پانی ہے گوہر کا مزاج
سنگدل گریہ کناں ہے دیکھیے تاثیرِ عشق — پانی پانی کر دیا لڑکوں نے پتھر کا مزاج
اس کے جینے پر نہ رو تو شمع رو کہتے ہیں غیر — اصل سے ہی آتشی ہے اس کے جوہر کا مزاج
شمع کے مانند غیروں کو جلایا آہ نے — شعلہ رو کیا گرم تر ہے تیرے اخگر کا مزاج

کون وہ گلشن میں خنداں ہوگیا — مست جس کی بو سے بستاں ہوگیا
میری چشموں سے یہ باراں ہوگیا — ابر جس کو دیکھ گریاں ہوگیا
آئینہ رو نے جو دیکھا آئینہ — آئینہ سارا پرستاں ہوگیا
سایہ افگن جس جگہ کاکل ہوئے — دشت وہ سب سنبلستاں ہوگیا
ماہ و خورد ڈوبے نظر آتے ہیں آج — میرے اشکوں کا یہ طوفاں ہوگیا
دیکھ ابرو تیری اے ابرو کماں — ماہِ نو صد جاں سے قرباں ہوگیا
ہجر کی شب روز روشن ہوگئی — جلوہ افگن مہر درخشاں ہوگیا
جب سے پرتو غرت خور کا پڑا — داغ دل کا ماہِ تاباں ہوگیا
رات دن رہتا ہے یوسف کا خیال — کیا مرا دل چاہِ کنعاں ہوگیا
صحبت اغیار کیا بدتر ہے آہ — یار کا گھر مجکو زنداں ہوگیا
جس نے اخگر کے سنے اشعار کو — شمع کے مانند سوزاں ہوگیا

(تاریخ گجرات)

آزاد

"قصیدہ بشانِ استاذی علوی"

فروغ صبح تاب عید کا عالم میں جوبن ہے — مہ رمضان ہلال نیم شب ہے غرہ روشن ہے
وفور ذوق سے ٹک زمزمہ خوانی میں سوسن ہے — شگوفہ فکر طبع رسا کا تازہ گلشن ہے
زمین شعر پر نخل مضامین کا وہ جوبن ہے — تماشا دیکھیے اہل فلک نے کھولا روزن ہے
زبان خامہ کی چوموں کس دہن کی بے زبانی ہے — مبارکباد لب پر ہے خوشی دل میں مکمن ہے

لہ آئینہ تاریخ حقیقت السورت لہ سورتی

مشعشع ہر سخن میں نور ہے اک مہر انور کا — فلک سے اس لئے پیہم صدائے آخ و احسن ہے
ہماری طبع پر وہ مہر علوی نور افگن ہے — ہر ایک مطلع فروغ صبح تاب روز روشن ہے
یہ وہ خورشید ہے اللہ رے جس کے جھمکڑے — تجلی ہے کہ ذرہ کو مشعشع مہر کا خرمن ہے
یہ وہ فیاض ہے مسکین نوازی دیکھ کر جس کی — گدائی کو فلک نے بھی لیا کشکول دیگن ہے

یہ وہ سجادہ مسند نشین ہے کی بیعت کو
ادب سے پیر گردوں راہ جوئی آب خوردن ہے

یہ وہ احقاق دانِ حق نما و حق بر آرا ہے
دقیقہ عقل کل میں جس کا کچھ جز بدہین ہے

قسم سالمِ نیر عساں کی پئے رزم سخن یکتا
جوان و پیر زال دہر میں یہ ایک تہمتن ہے

پس سمجھو ریاض بوستانِ شہر سورت میں
چراغ گل شدہ شعر و سخن کا اس کا روغن ہے

یہ وہ آقا، یہ وہ مالک، یہ وہ سردار ہے لوگو
غلام بندۂ آزاد جس کا بندہ ادون ہے

وہ نکھرا ہے مصلّے پر پئے شکریۂ خالق
نماز عید میں جلوہ امام دین کا روشن ہے

بتادے چشم خود انصاف سے تجکو خدائی سوں
زمیں سے آسماں تک میں کوئی ایسا مشین ہے

نہ کیوں وو دست بستہ تہنیت کا فرط بجے
عوض خامہ کے ہاتھوں پر چڑھ آیا اپنی ارغن ہے

الٰہی نیر اقبال و عمر اس کا درخشاں ہو!
زمیں پر جب تلک خورشید خاور جلوہ افگن ہے

شگوفہ گلشن دولت میں پھولے شاخ فرزند کا
ترانہ ہے یہ بلبل کا یہ استدعائے سوسن ہے

میسر عقبیٰ بوسی اس کو ہو آزاد کمتر کو!!!
غریبوں کا وہ ماویٰ ہے وہ ملجا ہے وہ مسکن ہے

رہے شیدا بھی ممنون اس کی خلقِ مہربانی میں
کہ نشوں کا یہ مرجع ہے یہ مامن ہے

نعت

درس خواں ہوں بہار بوستانِ عشق احمد کا
نہ کیوں ہو بلبلِ دل کو سبق یادِ محمد کا

رہے ہے حزب دل ہر دم یہی پیش نظر اپنے
کہ ہے زیر و زبر قد تشدد ہو مشدد کا

نظر ڈالے کہاں وہ خوش قدان باغ جنت پر
سمایا جس کے آنکھوں میں ہو جوبن یار کے قد کا

ادھر بھی ہاں نسیم سبزہ زار گلشن جنت
محمدؐ کی قسم اب لہلہا دے غنچہ مقصد کا

سراسر گیسوؤں کی یاد میں یہ موشگافی ہے
کہ حرف لام کو اسلام سمجھا بندے نے خد کا

رسم عشق محمد میں ملے ہے یہ مجھ کو سر سبزی
بر النعش مزار ای دوستو کیجو زبجد کا

ملے مان مانتی سیری کہاں میزان ابرو میں
جھکا ہو جبکہ پلہ عین اپنی طالع بد کا

گریباں کفن کو پھاڑ چل نکلونگا مدفن سے
مچے گا شور محشر میں تہا جب تری آمد کا

کھلے بندوں ابھی اوڑ پہنچوں سوئے گلشن یثرب
جو ٹوٹے رشتہ تار نفس روح مقید کا

تمنا ہے یہی آزاد کی وہاں اپنے مولا سے!
تصدق ہو کے مر جاؤں رسول اللہ کے مرقد کا

افضل

تھا دل و غیرت میں جھگڑا آج دن دو چار کی   صاف قاتل مٹ گیا بارے تری تلوار سے
سایۂ چتر شہنشاہی کو کب ہو ہمسری   اس شہ اقلیم دل کے سایۂ دیوار سے
چرخ سا مجھ کو پھراتے ہے عبث شام و سحر   کام کیا افلاک نے ڈالا ہے اک عیار سے
تحفۂ دیوان میں دی نقد دل مجنوں صفت   خوب ارزاں مول لائے عشق کے بازار سے
سستی طالع سے افضلؔ وصل کی یہ بات سن   کٹ گئی لیکن نہ آئی نیند اک تکرار سے

گل سے خط جو انھوں کا آیا ہے   مجھ کو دیوانہ سا بنایا ہے
صورت آئینہ ہے حیراں صاف   تم نے نقشہ جسے دکھایا ہے
میں ہوں دیوانہ اس پری وش کا   جس کا سایہ پری کا سایہ ہے
تیغ ابرو دکھا کے رمضاں میں   طور عاشورہ کا مچایا ہے

نگہ تیر آفت عرق مشک بو ہے   عقیق یمن تیرے لب غنچہ رو ہے
سحر سامری کا ادا سے نمایاں   گرفتار عالم تری گفتگو ہے
(تاریخ گجرات)

بہادرؔ

ہم نے اس ماہ سے دل لگایا ہے   ماہ نے جس کا داغ کھایا ہے
جب سے مہ رو نے رخ دکھایا ہے   عشق نے تب سے دل جلایا ہے
تیر مژگان نے اے کمان ابرو   تیر دل پر مرے لگایا ہے
ہم نے فرقت میں سبز رنگوں کے   اپنے ہاتھوں سے زہر کھایا ہے
تیری دوری میں ہم نے اے گل رو   لالہ سا دل پہ داغ کھایا ہے
اس پری رو کو میرے گھر میں آج!   جذبۂ عشق کھینچ لایا ہے
باغ میں لالہ رو کی مسی کا!!   گل سوسن نے رنگ اڑایا ہے
کیا بہادر ہے دل بہادرؔ کا   تجھ سے ظالم سے دل لگایا ہے

ہیں گل خندہ زن سب کو بھائی بسنت ہے　　گلستاں میں بلبل نے گائی بسنت ہے
بہار چمن آج لائی بسنت ہے　　سبھی گل رخوں کو خوش آئی بسنت ہے
سنہرہ رنگ اس گل کا پیش نظر ہے　　ہے شکر اس کا جس نے دکھائی بسنت ہے
نظر آتے ہیں سب عدو زرد رو اب　　یہاں تک آنکھوں میں چھائی بسنت ہے
یہ سب قہقہے زعفراں کے ہیں بیجا　　بن اس گل کے اب جگ ہنسائی بسنت ہے
خبر اس کی اڑتی سی پریوں نے سنکر　　پرستاں میں اپنے رچائی بسنت ہے
نہیں شعر کہنے کا شائق بہادر　　مگر خاطر آ یہ بنائی بسنت ہے

کنج تنہائی میں کل دیکھ کے تنہا ہم کو　　بیکسی خوب لگی دینے دلاسا ہم کو
شعلہ رو تو نے جو محفل سے اٹھایا ہم کو　　شمع سوزاں کی طرح ہائے جلایا ہم کو
خوب تاثیر ملی آہ کی اپنی ہمدم　　جو کہ معشوق ملا اس نے جلایا ہم کو
گر نہ منظور تھا اس بت سے ملانا تو بھلا　　دربدر کس لئے اے چرخ پھرایا ہم کو
جام کو منہ سے لگاتے ہی ہوئے ہم بے ہوش　　ساقیا جام میں کیا تو نے پلایا ہم کو
دل چرانے ہو بھلا کس لئے ہم سے اے سرو　　بارہا دیتے ہو کیوں وصل کا دھوکا ہم کو
التجا یہ ہے بہادر کی شب و روز مدام　　رات دن وصل میسر ہو خدایا ہم کو

(تاریخ گجرات)

خاموش

روشنی قبر میں ان کی ہو گی　　نام حق پر جو مرا کرتے ہیں
ہوں غلام خادم جانباز اصحاب کبار　　اور تصدق ہوں بنی آل الامجاد کا

شفیق حضرت منعم نے ازراہ الطاف　　سنایا مژدہ یہ مجھ کو عجیب فرحت کا
جناب شیخ بہادر ہے جن کا اسم شریف　　ہے عرف شیخو میاں اس شریعت طینت کا
عطا ہے ان کے بزرگوں کو شاہ دہلی سے　　خطاب عمدۂ تجار تمغہ عزت کا
ہنر میں علم میں اخلاق میں مروت میں　　نظر پڑا نہ بشر کوئی اس لیاقت کا

شریف عالی گرمصدر فیوض اتم   یہ ایک شمہ بیاں ہے کمال حضرت کا
کیا ہے ایک رسالہ جو آپ نے تالیف   دلا ہے کام یہ کوشش کا اور ہمت کا
خدا زیادہ کرے عمر و دولت و عزت   خیال اہل وطن کی جو ہے مزیت کا
ہوئی جو فکر پئے سال مجھ کو لے خاموش   تو انتظار رہا غیبی استعانت کا
سنا یہ مژدہ کہ تالیف شیخ صاحب میں   وسیع حال ہے باشندگان سورت کا

۱۵ ہجری ۱۳

اسی طرح سے لکھا سال عیسوی خاموش   دلی دعا یہ کہ موقع ہے استجابت کا
ندا یہ آئی کہ بیدار بخت سورت پائے   ستارہ اوج پہ ہو ساکنان سورت کا

۹۸ ع ۱۸

اور آپ ہی کی مسیحائی سے قیامت تک   بخیر زندہ رہے نام اہل سورت کا
لکھا جو نسخۂ دلچسپ شیخ صاحب نے   تو غور تھا کہ لکھا جائے سال سمت کا
یہ مژدہ سنتے ہی خاموش ہو گیا روشن   ابد ابد ہے کھوا ب چراغ سورت کا

۵۴ سمت ۱۹

سیاح

ہم اس کے ہیں کہیں گے نکیرین سے بھی   مر کر کہے دماغ سوال و جواب کا

لیا بوسہ جو ابرو کا تو کیا کیا غیظ میں آکر   کبھی دیکھی میری صورت کبھی تلوار کی صورت

جور و ستم بتوں کے اگر ہیں اسی طرح   کرتا ہوں آج کل ہی میں یہ جاں نثار کوچ

محیط عشق سے یہ آبرو ملی سیاح   کہ تہ کو بیٹھ گئے جب کہ ہم گہر کی طرح

جو دیکھا قبلہ رو بتخانہ سمجھے ہم یہ کعبہ ہے   نہ بھولے بت پرستی میں بھی ہم یاد خدا دل سے

سردی کے دنوں میں ہے تن زار میں گرمی   گرمی سے بھری ہو دل بیمار میں گرمی

مسندِ فقر پہ زاہد نہ کرے کیوں تکیہ ہم فقیروں کو ہوا فضلِ خدا پر تکیہ
لطفِ املاک و امارت ہوا امیروں کو نصیب فضلِ خالق سے فقیروں کا ہوا گھر تکیہ

کیا عجب گر ہوگئی رونے سے چشمِ تر سفید ابر کالے بعد بارش ہوتے ہیں اکثر سفید
عمرِ خضر اس کو ملی طالع رہے صبحِ امید اے خدا اس بسم تن کے ہوئیں موئے سر سفید
خشک تھا یہ ناتوانی سے لہو اس جسم کا ذبح قاتل کر چکا لیکن رہا خنجر سفید

اس بیکسی میں میری رفاقت جو تم نے کی جان اپنی تم پہ کرتا ہوں رنج و محن نثار

سبزۂ نوخیز نے ایسا اٹھایا اپنا سر آنکھ سے چھپ چھپ گئے ہیں کوہسار اب کی برس

ہجر میں موت بھی آئی نہ مجھے سچ ہے مثل وقت پر کون کسی کے کوئی کام آتا ہے

دیا ہے جس نے غم سیاح راحت بھی وہی دیگا ترقی ہوتی ہے دنیا میں کتنے ہیں تنزل سے
بتوں کے عشق میں سجدہ بھلا دیا اس کا گنہگار مرا بال، بال کیسا ہے

میں نے جراح کا لیا احسان اس حماقت پہ زخم خنداں ہیں
جب سے آئے ہیں شہر سورت میں دفترِ اشعار کے پریشاں ہیں

نہ رکھی خاک کوئے یار بالائے کفن بھولے وصیت کر کے مرنا تھا ہمیں اے گورکن بھولے
اگر چشمِ صنم دیکھے تو خوش چشمی ہرن بھولے جو سونگھے زلف بوئے مشک آہوئے ختن بھولے
تو یادِ دل ہم نے بھولے پن میں جان من بھولے ہوئی تقصیر ہے ہم سے کیا کریں عذر شکن بھولے
عدم کا کیوں کیا ثابت وجودِ اہل سخن بھولے نہ دینی تھی کمر کے ساتھ تیشہ دہن بھولے
کرے جب قتل مجھے سخت جاں کو تب کھلیں جگر نہ اپنے نیچے کے کاٹ پر وہ تیغ زن بھولے
بہت غیروں کو اے سیاح نیز و روز پلتے ہیں لیا جو آئے ہاتھوں ہم نے سلا بانکپن بھولے

اس غزل میں یکتا نشانہ گر کی طرف اشارہ ہے۔

صبح ہو جاتی ہے شب مجھے روتے روتے — آشنا خواب سے ہوتی نہیں دم بھر تکیہ

قتل عاشق کا خوں بہا کیا ہے — کشتۂ عشق کی دوا کیا ہے
اک زمانہ کشیدہ پھرتا ہے — آج کل مجھ سے وہ کھنچا کیا ہے
ہجر ہوتے ہی موت آ پہنچی — اک بہانہ ہے یہ قضا کیا ہے
جان جاتی ہے عشق میں سیاح — سہل اس کو سمجھ لیا کیا ہے

(انتخاب سیاح)

سمجھو

تجلی وادیٔ دل میں ہے نور عشق احمد کی — ید بیضا میری چنگل میں ہر پنجہ ہے مرا

سوچا نہ کچھ مآل کر بیٹھا ہے یار بھی — گل شمعیں اپنی آہ سے بزم عدو کی ہا

ہمراہ صبا خاک ہوں نالہ کشا ہوں — گویا جرس قافلہ ریگ رواں ہوں
سیماب مقید ہوں میں شیشہ میں جہاں میں — بیتاب ہوں اندازہ گری کا نشاں ہوں
خاصیت ضدین مری ذات میں ہیں جمع — نظروں میں سبک ہوں تو بیں خاطر پہ گراں ہوں
گویا ہوں جواب سخن یار میں نالاں — خاموش رہوں تو نہ کوئی جانے کہاں ہوں
میں سنگ سر اطفال کے ہوں تا بہ کمر غرق — مانند فلک زیر زمیں میں نصف نہاں ہوں

پروانہ نے چوٹ غم کی کھائی ہے — شمع اس کو بجائے مومیائی ہے
ساقی ہوں میں فاقہ مست دائم — گالی بھی مغبچہ کی کھائی ہے
دھول دھپا وصال کا کر یاد — پیٹ لیتا ہوں سر جدائی میں
بند رہتے ہیں در جدائی میں — گور ہے مجھ کو گھر جدائی میں
میں بھی گویا رجال غیب سے ہوں — ہوں نحیف اس قدر جدائی میں

دل شکستہ مجھ سے دشمن کا بھی ہو سکتا نہیں　　اے مجنو! اپنی بے زوری کا عالم زور ہے

ویرانیٔ عالم کی ذرا خاک جو چھانی　　ہر گرد میں اک لیلیٰ کا محمل نظر آیا

آگئی یاد اگر گردشِ چشمِ ساقی　　حشر میں قبر سے اٹھنا ہمیں مشکل ہوگا

دشمنِ جاں چشم و لبِ عیسیٰ نفس　　فوقیاں اعجاز پر جادو رہا
دستِ فریادی ہے کس مظلوم کا　　کھنچتا شانہ ترا گیسو رہا

پرو دئے قصہ خواں نے جیسے موتی　　ہمارے اشک کا تھا ماجرا کیا

جی گیا بس روپ دیکھ آبِ دُرِ گوشِ صنم　　ناتواں تھا میں بہت قطرہ بھی دریا ہو گیا

چھپ شرارت سے پیرہنا اس گلابی پوش کا　　شعلہ عالم سوز ہے اس آتشِ خاموش کا

لاغری میری جلاتی ہے ہر اک کے دل کو　　یہاں شعلہ کے برابر ہے اثر میں تنکا

دق ہو کے ہم نے اس سے چھپایا تھا اپنا منہ　　ہمدم کفن کو کھول کے پھر کیوں دکھا دیا

منہ مت چڑھئے ذرا آئینہ دیکھئے　　اس اچھے منہ کو کرتے ہو کیوں مہرباں خراب

ابرو سے دل بچا تو مژہ سے جگر چھدا　　روکی اُدھر کی چوٹ تو کھائی اِدھر کی چوٹ

فلک نے پاؤں پہ ڈالا تھا لاکے آخرِ شب　　صنم نے شام کو پھر اس کے منہ پر مارا چاند

شب فراق میں تو حال اضطراب نہ پوچھ　　کہ ہر گھڑی نظر آتا ہے اک ستارہ چاند

ہے نیا مضمون یہ اک سمجھو بالائی یار کا　　قفل گویا ہے در گنجینۂ اسرار پر

ہوس تھی آمد محشر خرام قاتل کی　　سو ٹھوکروں میں پھری اپنی ماری ماری لاش
ہوئے ہیں ہم غم پردہ نشیں میں صورت شمع　　کفن میں صبح نہ آئی نظر ہماری لاش
یقین تھا ہمیں جو نقش پا گلی سے تری　　اٹھانے دے گی نہ یہ اپنی خاکساری لاش

اٹھے ہیں ہو کے سبک ہم جہاں سے سمجھو
گناہگاروں کی ورنہ ہوتی ہے بھاری لاش

تہنیت نامہ تبقریب شادی خانہ آبادی شیخ محمود بن شیخ بہادر (فارسی)

ای خوشا صبح مسرت در جہاں آمد عیاں　　شام تار و تیرہ شد از عرصۂ عالم نہاں
ای خوشا روزی کہ شد از خواب عالم ہوشیار　　رفت شام و صبح روشن در جہاں آمد عیاں
اہل عالم روزگار خویش را چوں یافتند　　ہر یکی مشغول کار خویش شد پیر و جواں
با نہایت شادمانی کار شادی پیش کرد　　در چنیں روز ہمایوں ذی ہمم رفعت نشاں
کردہ برپا دشاہی نور چشم خویش را　　با نہایت طمطراق آں ذی ہمم رفعت نشاں
من چہ وصف محفل شاہی نمایم آشکار　　سروراںہ محفلی ترتیب شد از امر شاں
بزم منور پر سرور را چناں ترتیب داد　　دیدہ بینندگاں کم دیدہ باشد آنچناں
واد از گلہای رنگین خانہ را زینت تمام　　گوئیاں شد از نگارش چوں بہار بوستاں
از قنادیل بلوریں بزم شادی می نمود　　روشن از روشن کواکب چوں نماید آسماں

سرور

ہم دراں بزم خوشی رقاصہ ہای دلربا　　مے ربودند از ادا صبر و قرار بزمیاں
الغرض در بزم شادی بود بحدی انبساط　　از غنا و خوشنوار دلربا رامشگراں
سائرین از دوستاں اوصاف او را می کنند　　از نبات وصف او ہستند ہمہ شیریں زباں

شیخ فاضل شادی ابن برادرزادہ است   مرا ترا بادا مبارک ای شفیق و مہرباں
دیں ہمہ آرائش و زیبائش محفل تمام   آمداز غفلت نمایاں ای زہی غفلت جواں
لازم آمد بر خودم تا من نگارم تہنیت   زاں برائی او نمودم تہنیت را من بیان
ایں نوید شادمانی چوں بگوش من رسید   غوطہ ور گشتم بہ بحر فکر سالش در زباں
عقل آمد رہبرم گفتا کہ سرور گوش کن   جشن فرخندہ زروی جشن گو تاریخ آں

۱۲۹۰ھ زتاریخ گجراتا

شیفتہ

محفل اغیار میں اڑتے ہیں گل چھرے وہاں   خون برساتی ہیں یاں آنکھیں جگر سے دیکھنا
مو بہ مو ہو موئے تن افعی ڈسے ہیں مار مار   زلف کے سودے کا کالا لاں دم کرنے لگا

رہتا ہے شب و روز تصور میں وہ گل رو   میں اس سے جدا ایک گھڑی بھر نہیں ہوتا

لب، چشم، ابرو، نازو ادا، خوبیٔ فرہ   قاتل بجان کشتہ ہوں ان تین چار کا
روٹھو نہ شیفتہ سے دم نزع جانِ جاں   دم میں یہ دم ہے آپ کے بس انتظار کا

دن بھر فراق یار میں گنتا ہوں ساعتیں   اختر شماری ہے مہ کامل تمام رات
افشاں جما کے بیٹھا جو مہتابی پر وہ شوخ   آیا نہ مہتاب ان کے مقابل تمام رات
رخ سے نقاب اپنے نہاں اور جبیں الٹ   ڈر ہے کہیں نجائیں مکان و مکیں الٹ
دل ٹکڑے سینہ چاک گریباں ہے تار تار   قاتل نہ ایسے حال پہ تو آستیں الٹ

جوانی میں کروگے کیا قیامت نازو جوبن پر   ابھی اک حشر برپا ہے جو انداز لڑکپن پر
تمنا آرزو و ارمان فقط روتے نہیں ہمدم   ہزاروں حسرتیں سر پیٹتی ہیں میرے مدفن پر
اٹھا دو ماہتابی پر رخ انور سے مت برقعہ   گماں خورشید کا ہوتا ہے شب کو بیٹھے روشن پر
نہ کیوں شیفتہ ہو شیفتہ دل سے کہ ہم چشمو ں   مچل جاتی ہے طبع پارسا بھی ان کے جوبن پر

گنہ کیا کیا خطا اے دل رُبا کی — کڑی ہے کیوں نظر مجھ پر جفا کی
دم آخر سرہانے آکر اس نے — ہمارے مرض فرقت کی دوا کی
لحد پہ شمع کو پرواہ نہ تھی کچھ — سرہانے بیٹھ کر حسرت جلا کی
خوشی پر تمہاری آرزو کو — نہ آئی موت تو آفت بپا کی

(دیوان شیفتہ مخطوط)

شائق (شائق نے اس غزل میں بین تخلص کیا ہے)

ہوئے دفن جو کہ ہیں بے کفن انہیں روتا ابر بہار ہے
کہ فرشتے پڑھتے ہیں فاتحہ نہ نشان ہے نہ مزار ہے

نہ تھا شہر خلد سے یہ بھی کم سبھی جا خوشی تھی نہ تھا الم
چلی ایسی باد سموم غم نہ وہ رنگ ہے نہ دیار ہے

سبھی جائے ماتم سخت ہے کسی جائے گردش بخت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ نشان ہے نہ دیار ہے

نہ وہ لوگ ہیں نہ وہ انجمن سبھی اہل بزم ہیں نعرہ زن
نہ ہے سیر باغ نہ وہ چمن جہاں گل تھے کثرت خار ہے

پھرے دشت دشت تباہ سب بُرے دن دکھائے فلک نے اب
نہیں تھمتے اشک ہیں روز و شب یہی شغل ہے یہی کار ہے

جو ردو شالہ پوش تھے مثل گل وہ لبوں پہ رکھتے تھے جام مل
سبھی دشت غم کے ہیں خار گل نہ قبا ہے تن پہ نہ تار ہے

کہی وہ غزل ہے کہ اے مبیں جسے سن کے روتے ہیں ماہ جبیں
وہ ہیں کون جن کو کہ غم نہیں یہاں سب کا سینہ فگار ہے

(تاریخ گجرات)

اوڑھنی تار کشی سر پہ پری رو کے دیکھ — تنکے چنتی ہے نگوں سر ہو بچاری چلون
عشق کا دیکھ نتیجہ کہ بنائی اس نے — جسم کی بیرے رگیں کھینچ کے ساری چلون

بہت دشوار ہے گوہر کو پانی — ہمارے اشک کی جو آبرو ہے
میں قرباں ہوں تصور کے کہ ہر دم — دکھاتا شکل تیری ہو بہو ہے

ہے آسمان زمین پہ زمین آسمان پر — ظاہر ہی آئینہ میں زمانے کا انقلاب

تمام شائق وہ اگر بھول گیا غم کیا ہے — خلط اصلی میں ہے نسیان کو بشر سے پیوند

طرح تکمہ نہ گریباں میں سمجھ شیریں کے — بلکہ وہ اس کے گلوگیر ہے خون فرہاد

[illegible] دل میں ترے ہوں یا کہ اغیاروں میں ہیں — جو میں ہوں سو ہوں غرض تیرے گرفتاروں میں ہیں

ہے گلابی جو ہچکیاں لیتی — کوئی میخوار یاد آیا ہے

جلانا مارنا ہے عاشقوں کو اس کے قبضہ میں — صفاتوں میں وہ شکل بت ہے پر کرتا خدائی ہے

جل گئی عشق میں لے سر سے قدم تک تو بھی — آفریں شمع کی نکلی نہ زباں سے فریاد

شعلہ

ڈھلکا جو سرے شوخ کے سر پر سے دوشالہ — بالوں نے دیا چھوڑ تو شانوں نے سنبھالا

دولت عشق سے ہم بے سر و ساماں ہوئے — کاہش ہجر سے ہم چاک گریباں ہوئے
جنتیں وہ جو روانہ سوئے بستاں ہوئے — جو لب گل ہوئے غش بلبل نالاں ہوئے
چشم و دل دیکھ کے سے کہوں کیا یا رو — کئی بے ہوش ہوئے لاکھوں پریشاں ہوئے
گرمی آتش رو رخ سے نہ ڈرا اے شعلہ — حالی حشر ترے بارا امامان ہوئے

لہ [illegible]

ہمیشہ کھا کے قسم تم نے حیلہ سازی کی
پہ میرے گھر پہ نہ اک بار سرفرازی کی
کہا جو شیخ کو یہ داغ کیوں جبیں پہ کھائے
تو بولا غصہ سے ہٹ تیرے بے نمازی کی
قرار دل کو نہ تھا اس کی ٹھوکروں آگے
سواری جب کہ کئے تم نے اسپ تازی کی
کہا یہ جل کے کہ فی النار والسقر ہو تو
کبھی جو شعلہ نے آن سے زباں درازی کی

جس طرح یار کی ہے ابروئے خمدار کی تیغ
ویسی کب ہوگی بھلا برق شرربار کی تیغ
ترک چشموں کو لگی ابرو کی تلوار جو ہاتھ
بس ہے لاکھوں کو یہ دو ہمت جفاکار کی تیغ
جس کے سر پر کہ پڑی جانتا وہ ہی ہوگا
آزمانے سے ہو معلوم وہ دلدار کی تیغ
ایک اشارہ ہی سے ہیں جس کے ہزاروں گھائل
کاش یہ رکھتی ہے اس شوخ ستمگار کی تیغ
شعلہ وہ برش ابرو تری مشہور ہے ایک
کم نہیں ہے شعرا کے لئے بھی اشعار کی تیغ

ترے کاکل کے تصور میں مجھے اے شمع رو
شمع کی لو پر دھوئیں کے بل بھی دکھلاتے ہیں سانپ

کیا دکھاتی ہے ہمیں یہ چشم تر دیکھیں گے ہم
مثل آئینہ بھرا پانی سے گھر دیکھیں گے ہم
(تاریخ گجرات)

گلبن طبع رسا ہے لالہ زار عید روس
نغمۂ دل کا شگوفہ ہے بہار عید روس
گنبد گردوں ہو آنکھوں سے نثار عید روس
وہ رفیع الشان ہے شان اقتدار عید روس
ہار بن کر گل فشاں ہے طبع رنگیں کا نکھار
باغ مضمون ہر شگفتہ ہے بہار عید روس
کیوں نہ ہو نام خدا دل بلبلوں کا باغ باغ
آج ہے عرس جناب ذی وقار عید روس
ابن عبد اللہ علی العید روسی اسم پاک
ہیں ملقب جو صلیبی نامدار عید روس
عرس کا ان کے رچا ہے باغ گیتی میں ظہور
آکے غلماں کیوں نہ ہوں نثار عید روس
سر چڑھے نافہ کا غیرت سے ختن میں کیا خطا
جھکے ہیں یاں صندل رشک تتار عید روس
پھول دینے بلبلیں آتی ہیں گل گل پھول پھول
روضۂ اطہر ہے رشک لالہ زار عید روس

عرش سے نام خدا زیارت کو آتے ہیں سروش   عرس کی اللہ رے شان خوشگوار عید روس
درد سر اترا یہاں مرقد پہ واں صندل چڑھا   مرحبا صلّ علیٰ خاک مزار عید روس
پنجۂ مقصد نہ گل گل بر زیارت کھل کھلائی   مرقد اقدس پہ پھولی ہے بہار عید روس
عتبہ بوسی کا تصور ہے دلا شام و سحر   خانۂ دل کیجئے اپنا جوار عید روس
زیب آرا ہے جو اس مسند کا والا کرم   سید السادات علوی نامدار عید روس
گل ہیں کل آل نبیؐ سرطرہ یہ رشک بہار   ہے اسی سے سبز شاخ افتخار عید روس
بحر نظم و نثر کا غواص ہے بے شبہ و شک   یہ چلا افزائی در آبدار عید روس
ہے شگوفہ علم کا اس کا نرالا دہر میں!   جھومتے ہیں اس سے کھل کر شاخسار عید روس
مزرع مضمون پہ اس کے پست فکر دانہ چین   خوشہ اس کے طبع پر ہے سبزہ زار عید روس

شیدا

ہاتھ اس کا چوم لیتا ہے ہر ایک اہل سخن   یہ بھی ہے اعجاز والا آستکار عید روس
خانقاہ چشم تمنا ہے یہ عین عجز سے   جو مرا استاد ہے زینت ؟
پھول کر شاخ تمنا سے پہلے اس کا شجر   غنچۂ مقصد ہو گل گل گلفشار عید روس
مسلک گوہر ہوں شیدا تیرے اشعار آج کل   ہے مسلسل نعت در شہوار عید روس

(تاریخ گجرات)

علوی

جوں سایہ گرا سرو سے دیکھ زمین پر   باعث یہی گلشن میں ہے پھولوں کی ہنسی کا

عبث دکھاتے ہو ہر بار خال و زلف مجھے   بغیر دانہ و دام آپ کا شکار ہوں میں

گل گل پہ نغمہ کرتی ہے بلبل چمن چمن   کس شمع رو کا باغ جہاں میں ہے خوش لگن
کچھ آج شاخ غنچۂ عشرت ہے باغباں   ہے چاک دست عشق سے ہر گل کا پیرہن
ہے باغباں گلشن عشاق پھول پھول   سرطرہ بار عشق شگوفہ ہے گلبدن

مہکے خطا میں عنبریں کاکل تو بے خطا   تا تار سے ہوں آہوئے نافہ ابھی ہرن
منڈوے چڑھی ہے سرور لولاک کی جو بیل   پھولی پھلی وہ مہکی ہے خوشبو چمن چمن
ہوں آب آب پانی بھریں بحر حسن سے   نیل و فرات ، نربدا، تپتی و گنگ ، جمن
تا تار میں جو مہکے فدا خال عنبریں   مشک خطا پہ نقطہ رکھے آہوئے ختن
جو بار گلشن وحدت ہو عسکویا   اس شاہ گل کا وصف کہے کیا ترا دہن

جز وصال جاں نہیں امید وصل جان جاں   آپہنچ پیک اجل مرنا ہمیں درکار ہے
جس کی دوری ایک دم بھر قاتل جاں تھی دلا   اس کی فرقت سے جدائی حشر تک دشوار ہے
گور مسکن، خاک بستر جس کی روح جاں کا ہو   اس کی جاں لینے میں تجھکو کیا قضا تکرار ہے
روح ساکن ہو زمیں میں جسم ہو تشدید خاک   پیش ہو زیر و زبر کیوں مد غم دوار ہے

(تاریخ گجرات)

کاٹے شب فراق کو وحشی کہاں تلک   رو رو کے دن گذارے یہ عاصی کہاں تلک
صدقے کرو بلا کے اس علوی کو روضہ پر   بیچارہ دیوے ہجر میں اب جی کہاں تلک
اکتا گیا ہے ہند کی راہ و رسوم سے   باتیں سنے یہ ماوشما کی کہاں تلک
پہنچا دے اب تو روضۂ احمد پہ یا خدا   کرتا پھروں فراق میں زاری کہاں تلک
دل سے خدایا یثرب و بطحا کی سال سال   کرتا رہوں میں وعدہ خلافی کہاں تلک
جاؤں میں اب تو ہند سے ملک عرب کی سمت   اس عین رب کی دیکھوں جدائی کہاں تلک
خدمت میں مصطفیٰ کے تو پہنچا دے خالقا   تڑپے غم فراق سے علوی کہاں تلک

ظاہر کروں کیا مقصد دل اپنا کسی سے   کب کوئی مری بات کو سنتا ہے خوشی سے
کیا خاک چھپے آتش حسرت میری جی سے   برباد گئی آبرو چشموں کی تری سے
یا شاہ رسل اب تو مدینہ میں بلا لو   ملتا ہی نہیں دل میرا سورت میں کسی سے
سرمست ترے جلوۂ دیدار کا ہوں میں   صہبا سے نہ مطلب نہ غرض جام جم سے

۱؎ گجراتی محاورہ

یا شافع محشر ترے عاشق کی تمنا پوری ہو سوا تیرے کہاں اور نبی سے
امید نہیں شام و یمن روم و عجم کی مطلب میرا یثرب کی ہو جاروب کشی سے
مرقد میں دیا کیجیو اجالا میری ہر دم اے مہر کرم آپ کی انوار جلی سے
محشر میں نہ عصیاں و جرائم کی ہو پرسش کیجیے گا سفارش یہ جناب احدی سے
بیچین جدائی سے ہے حضرت کے یہ علوی للہ بلا لیجئے خدمت میں خوشی سے

(غنچۂ ارم)

غنی[1]

آج اس جھوٹے کی جھوٹی مئے مل گئی کیا مجھے جو بھر کتے ہیں مرے پیر مغاں کچھ شب سے لب

مثل تصویر تحیر میں بس آجاوے ہے آئینہ دیکھے ہے جب اس مری حیرانی کی

رہتا ہے چت چڑھی اب کس کی سنہری رنگت جو ان دنوں غنی کا چہرہ ہے زعفرانی

میرے اشکو کا روبرو آنا آبرو موتیوں کی پانی ہے

(تاریخ گجرات)

غنی[2] (نواب)

شب ہجر کا مجھے اے صنم کئی دن سے رنج و ملال تھا
گلے ملتے ہی گئے جان سے نہ زوال تھا کہ وصال تھا

ترے گل سے چہرے پہ سیم تن کیا چاک گل نے بھی پیرہن
لیا داغ لالے نے رشک سے جو جبیں پہ بدر سا خال تھا

شب ماہ میں جو نہی رشک ماہ ہوا ماہتابی پہ جلوہ گر
تری تاب حسن و جمال سے مہ چاردہ بھی ہلال تھا

شب ہجر کی جو بے کلی ترے در کا ہے گدا غنی
دم مرگ اسے ما ہوش ترے دیکھنے کا خیال تھا

جو اس رخ خورشید کو دیکھا نہیں کرتے
انوار تجلی کا تماشا نہیں کرتے

کرتے تھے شب وصل ہیں تقریر تم اے جاں
اب غنچہ دہن کس لئے لب وا نہیں کرتے

جو ہوتے ہیں تلوار تبسم سے تری قتل
وہ گریہ و زاری صنم اصلا نہیں کرتے

سرمست جنوں کے نہیں کچھ سامنے توقیر
بازار تعشق میں وہ سودا نہیں کرتے

بیمار محبت ہوں اس ماہ لقا کا
کیوں رشک مسیحا مجھے اچھا نہیں کرتے

سالار ترے ہجر میں ہے جان سے بچا
عاشق کو کہیں ایسا ستایا نہیں کرتے

فاضل

فرط شوق وصل سے دوڑے ہی اٹھ کر نزع میں
اب مریض عشق کے تیور نئے چالے ہوئے

داغ دل عاشق کے تیرے اس قدر کالے ہوئے
رشک سے لالا کے جس کے جان کے لالے ہوئے

کیوں نہ شہرہ ہو تمہارے حسن بالا دست کا
مہر و ماہ دونوں تمہارے کان کے بالے ہوئے

ہاتھ لے جا زلف تک مشاطہ کچھ تو ڈر نہ کر
ہیں متاع حسن پر یہ ناگ دو پالے ہوئے

ہر زماں ہر وقت میں ہوتے ہیں پیدا فتنہ گر
تم ہمارے وقت میں آفت کے پرکالے ہوئے

سرخ روئی جب ہوئی حاصل تو وہ کہنے لگا
لو مبارک دشمنوں کے آج منہ کالے ہوئے

بھولتا نہیں بس ہمیں فاضل کو یہ کہنا ترا
آج جاتے ہو کدھر تم مست متوالے ہوئے

شمع سے رات جو محفل میں ہوئے گل پیدا
تو پتنگوں کی طرح واں ہوئے بلبل پیدا

نیم بسمل ہی مجھے چھوڑ چلے غیر کے ساتھ
جان عاشق سے ہوا کیا تغافل پیدا

زلف کے نام سے جب بال کھڑے ہوں تن پر
کیوں نہ پھر سایۂ کاکل سے ہو سنبل پیدا

دیکھ سرشار مئے عشق سے میکش کو مرے
شیشۂ دل سے ہوئی شورش قلقل پیدا

یاد میکش میں جو روتا ہے تو فاضل مشتاق
جائے اشکوں کے نہ کیوں آنکھ سے ہو مل پیدا

(تاریخ گجرات)

فرحت

یہ حضرت دل جس کی نگاہوں پہ مرے ہیں — مد نظر اس شوخ کے جدھر سے دھرے ہیں
جس دن سے جدے دل نے کئے یار سے فرحت — کچھ تجھ ہی سے تنہا نہیں عالم سے برے ہیں

(مخزن)

قطب

نقش گل کے سوا اس نے نہ قدم رکھا ہے — کہیں رہوے نہ صبا راہ گزر میں تنکا
ہم عطلب کے مارے مرتے ہیں — تیری عزت کے مارے مرتے ہیں
ہے خوشی ان دنوں رقیبوں کو — اس عداوت کے مارے مرتے ہیں

دشت وحشت میں میں ایسا راہ گم کردہ ہوں خضر — اب خدا کے واسطے تو بھی نہ بہکانا مجھے

چاندنی رات کو اے رشک قمر کیا دیکھوں — ٹھیکرا سا ترے آگے تو ہے مہتاب مجھے
حاجت دفن نہیں قطب بقول تسکین — خاک میں دل کی کدورت نے دبا داب مجھے

نقش زلفوں کے وہ پرنور سے رخسار پہ دیکھ — لوگ کہتے ہیں کہ خورشید کو پہلو نکلے

یہ ہوا تیری جدائی میں دل زار کا حال — جیسے برسوں میں بنا ہو کسی بیمار کا حال

کل مجھ کو عجب ایک بت ہندو نظر آیا — جادو جسے کہتے ہیں وہ جادو نظر آیا
قمری کی نمط ہم نے لیا طوق بگردن — ماتھے پہ ترے سرخ جو کو نظر آیا

بندہ پرور بس اب فرمائیے — کس نے پہلے بھلا لڑائی کی
قطب کو قتل ہی کیا ظالم — تو نے آخر کو جگ ہنسائی کی

ہوگا ایک اشارہ میں ابرو کے کام یاں   ناحق لئے پھرے ہے تو شمشیر ہاتھ میں
محشر میں ہوگا نامۂ اعمال سب کے ہاتھ   پر میں رکھونگا تیری ہی تصویر ہاتھ میں
کیا کروں دل ہی ہوا میری بغل کا دشمن   مجھ کو بھی لے کے پھنسا اپنی گرفتاری میں

ہے یاد قطب سے جو تمہارا یہ قول تھا   دونوں میں جو پھرے تو بس اس سے خدا پھرے

کامل

اس نے دی غیر کو انگشتری فیروزے کی   رنگ بدلا ہے بس اس وقت یہ کیا کیا اپنا
یار کے وصفِ سراپا میں کمر کی جا پر   ہم نے اس شعر میں باندھا ہے سراپا اپنا
بوسۂ پائے صنم وصل میں کافی ہے کہ سر   اٹھنے دیتا ہی نہیں شکر کا سجدہ اپنا

گرمیٔ ہجراں نے دی اشکوں میں تاثیر شرر   آنسوؤں کے پونچھتے ہی میرا دامن جل گیا

تیرے پانی کے چوانے پہ بھی مرتے ہیں عدو   بس دم تیغ ہے ان کو دم آخر میرا

ہم خوش تھے اعتماد وفا وہ بھی جانتے تھے   غیروں کا اپنے ساتھ نہیں امتحان ہوا

غبار رشک عدو آئینہ نے صاف کیا   وگرنہ یوں بھی تو کب مجھ سے یار ملتا تھا

بیتابی سے یاد رخ میں پاتا ہوں قرار   سیماب بھی ہوں تو پشت آئینہ کا

مذمت بگاڑ تلخ کلامی سے اپنا تو   زاہد کبھی نہ ہووےگی ہم سے شراب ترک

کھٹک رہا ہوں رقیبوں کو گو کہ زار ہوں میں   تمہارے کوچہ میں گویا عدو کو خار ہوں میں
صفا یہاں تک ہے مشت خاک اپنی   موے پہ بھی کسی آئینہ کا غبار ہوں میں

بسان کاغذ مسطر کھنچیں رگیں تن کی　　یہ کیفیت ترے نامہ کا انتظار ہوں میں

اڑتی پھرتی ہے مشت خاک اپنی　　ہم سلیمان اپنے وقت کے ہیں

رکھا کم ظرفیٔ دل نے ہمیں محروم ساغر سے　　ہوئے بیہوش شیشہ دیکھتے ہی اس کی محفل میں

کل عیاں کم سخنی آپ کی ہو گی معلوم　　گر مرا نامۂ اعمال کھلا محشر میں

توبۂ مے ساتھ شیشے ہی کے یکجا ٹوٹ جائے　　خاطر ساقی نہ ٹوٹے میری توبہ ٹوٹ جائے

کب سخن کا اپنے ہر آشفتہ طبعوں کو مذاق　　میرے مضمون کے سمجھنے کو بھی سمجھو چاہئے

(مخزن)

منظور

حیرت بہ شکل آئینہ یاں دو بدو رہی　　تصویر یار آٹھ پہر روبرو رہی
جوں زلف اس کے پاؤں پہ سر رکھ کر سوار ہوں　　ہر شب نصیب جاگنے کی آرزو رہی
رنگین مزاج قابل صحبت ملا نہ یار　　افسوس عمر بھر ہمیں یہ جستجو رہی

رشتہ ہے اس پری کے جو زلف رسا کے ساتھ　　جوں دود شمع کشتہ ہیں نالے ہوا کے ساتھ
کھولو قبا کے بند تو جی کھول کر ملیں　　دل بستگی ہے آپ کے بند قبا کے ساتھ
کرتی ہے قتل سادگی تیری بسان تیغ　　پرواز مرغ جاں کو ہے رنگ حنا کے ساتھ
بیمار ہجر کا تیرے درماں وصال ہے　　آؤ سبز رنگ زہر پلا دے دوا کے ساتھ
پاؤ گے اپنی سنگ دلی کی سزائے سخت　　آخر تو کام تمکو بتوں ہے خدا کے ساتھ
کس رنگ سے وہ ہاتھ سے اب جانے پائیں گے　　باندھوں گا ان کے پاؤں کو دردِ حنا کے ساتھ
ناطاقتی ہے زور مجھے دم نہ دیجیے　　اڑتا پھروں ہوں جنبش لب کی ہوا کے ساتھ

دیکھو ہوا ہے شوقِ اجابت میں شامل خاک — پہنچے ہم آسماں تلک اپنی دعا کے ساتھ

ہے محبوں سے ان کو خار عبث — مت کرو گل رخوں کو پیار عبث
باعث سیہ ماہ ہجری میں ہیں — داغ دیتے ہیں مجھ کو یار عبث
صاف جوں آئینہ ہوں اور مسانہ — مجھ سے رکھتا ہے تو غبار عبث
جو چراتا ہے آنکھ اب منظور — اس کا تم کو ہے انتظار عبث

(تاریخ گجرات)

افراط شوقِ وصل نے کار عدو کیا — آیا جو خواب میں وہ تو مجھ کو جگا دیا
جلتا عدو سے دیکھ اسے جوں شمع رو کے ہم — اے رشک تجھ کو آگ لگے جی جلا دیا
کھاتا ہے حیف جال پہ اب میرے یار باز — شوریدگی نے میری یہ اس کو مزا دیا
ہے ضعف گو یہ روز کے وہم نسیم نے — اس گل کا میرے ہاتھ سے دامن چھڑا دیا

پرتو ہے جوہر آنکھ میں خضر رہ دیں کا — جادہ ہے مرا تار نظر خلد بریں کا
صدقے قمر و خور تجھ پہ ہیں اے کان ملاحت — ہے شور جہاں میں ترے حسن نمکیں کا
چاندی کے ورق بن گئے منظور یہ دو لب — بوسہ جو لیا رات کو اس ماہ جبیں کا

دست رس تیرے پاؤں تک ہے اسے — خوب مہندی یہ رنگ لائی ہے
شب کہاں جاؤ گے اندھیرے میں — مستی ہونٹوں پہ کیوں چھائی ہے
پاؤں آنکھوں سے اس کے سہلانا — خوب خدمت یہ ہاتھ آئی ہے

(مخزن)

اجالا نور افزائی خدا جانے کہاں ہو تو — میری آنکھوں کی بینائی خدا جانے کہاں ہو تو
یہ بیتابی یہ بے خوابی جو تو ہوتا تو کیوں ہوتی — رہی کہتی ہے تنہائی خدا جانے کہاں ہو تو
جہاں تاریک اس بن ہے پر پروانہ وہ غائب ہے — چراغ بزم آرائی خدا جانے کہاں ہو تو
نہ مونس ہے نہ ہمدم ہے دلاسا کون دے مجھ کو — ہے جان اب تن میں گھبرائی خدا جانے کہاں ہو تو
بیکاری زیست میری ہو میں اے لیلیٰ ترا کالا — کہے ہے قیس صحرائی خدا جانے کہاں ہو تو

سنا جب حال مجنوں کا تو بولی رو کے یوں لیلیٰ ۔۔۔ میری زلفوں کے سودائی خدا جانے کہاں ہو تو
خیال ابن یامین چاہ میں تھا کہتے تھے یوسف ۔۔۔ مدد منظور ہے بھائی خدا جانے کہاں ہو تو

یکتا

تصور تھا سراپا حور کا پر جان من بھولے ۔۔۔ لکھا تجھکو پر یہ ہم نے لے رشک چمن بھولے
سراپا عالم تنہائی میں شہر و وطن بھولے ۔۔۔ تیرے وحشی بھٹکتے پھرتے ہیں صحرا و بن بھولے
خیال سایۂ بال ہما آنکھوں میں کھٹکے ہے ۔۔۔ کمر کی جستجو میں سو میاں یا در دہن بھولے
تیلت آسا عزیز یوسف مصری کی چاہت سے ۔۔۔ جھنکاتی ہے زلیخا کو کنویں چاہ ذقن بھولے
خطا میں مو بہ مو بیکے ہیں کس کے عنبریں گیسو ۔۔۔ جو بوئے نافۂ مشکین غزالان ختن بھولے
خدا حافظ ہے یکتا اب ہمارے دین و ایماں کا ۔۔۔ بتوں کے عشق میں عقبیٰ کا سب عیش دکن بھولے

(تاریخ گجرات)

ذکا

توحید

ذکا خواہش ہو گر ایماں و دیں کی ۔۔۔ تو کر کچھ حمد رب العالمیں کی
تکبر فخر ہے زیبا اسی کو ۔۔۔ کیا کرتے ہیں سب سجدہ اسی کو
شرف پایا ہے کیا گل اور بونے ۔۔۔ یہ ہے کل اس کی قدرت کے نمونے
کیا پرگھٹ اسی نے سب پسار ۔۔۔ وہی مالک نرانجن اور نراکار

ذکا نے ایک تنبیہ نامہ لکھا ہے جس میں پچیس ۲۵ بند ہیں چند بند ملاحظہ ہو۔

خود مدح گو ہے خالق اکبر رسول کا ۔۔۔ رتبہ نہ پایا کوئی پیمبر رسول کا
ثانی نہ ہے جواب نہ ہمسر رسول کا ۔۔۔ کس درجہ اوج پر ہے مقدر رسول کا
ایسی کے نصیب بھلی بات ہو گئی ۔۔۔ کیا بخت ہے خدا سے ملاقات ہو گئی

لکھیں ہم ان کو قوم نصاریٰ و یا یہود ۔۔۔ مسجد کے مال کو جو سمجھتے ہیں ماں کا دودھ

کھوٹی دلیل لائے یہ جائز بتائیں سود ۔۔۔ باتیں یہ سب ہیں شرع محمدی سے لاوجود
جو جو کہ فعل بد ہیں وہ کل پیش آئیں گے ۔۔۔ یہ لوگ روزِ حشر میں کیا منہ دکھلائیں گے

رشوت جو لوگ کھاتے سنئے گا ان کا حال ۔۔۔ جاہل تو کیا جو عالم و فاضل ہیں باکمال
فتوٰی فروش ہو گئے فاسد ہے کیا خیال ۔۔۔ اتنا نہیں ہے علم یہودوں کی ہے یہ چال
سنّی کو چھوڑ دیجئے یہاں تک کریں بدی ۔۔۔ کیا رہ گئے ہیں مفتئ دینِ محمدی

یہ عرض ہے رسولِ خدا دل سے صبح و شام ۔۔۔ سرسبز میرے باغ مضامین رہیں مدام
فرمودۂ خدا کے سوا ہو نہ غیر کام ۔۔۔ سنت طریق مجھ سے ادا ہو جو ہیں تمام
کچھ ماسوا نہ اس کے کرامت نصیب ہو ۔۔۔ جنت ذکا کو اور شفاعت نصیب ہو

رفعت

اظہارِ مدعا سے بھی تحقیر ہو گئی ۔۔۔ اچھا معاف کیجئے تقصیر ہو گئی
ثابت کیا ہے گل سے سوا ہے تمہارا حسن ۔۔۔ بلبل سے آج باغ میں تقریر ہو گئی

ہاں اے نگاہِ یار ستم میں کمی نہ ہو ۔۔۔ وہ درد کیا جو دل میں کبھی ہو کبھی نہ ہو
پھر زخم خون رونے لگے بزمِ یار میں ۔۔۔ پھر فکر پڑ گئی ہے ہماری ہنسی نہ ہو

نقشِ پا غیر کے لائے مجھے یاں تک رفعت ۔۔۔ گو وہ رہزن کے سہی کام تو رہبر کیلئے

میں گھر سے گیا اور وہ آئے میرے گھر میں ۔۔۔ کیا پھیر پڑا ہائے دعا اور اثر میں
ہے سوزِ محبت کی چمک حسن شرر میں ۔۔۔ اے تیرے جلوے ہیں پتھر کے جگر میں

جوانی میں تمنا کرتے تھے جس مہربانی کی ۔۔۔ وہ ان کی مہربانی آج خواہاں ہے جوانی کی
نگاہِ شوق پر وہ فاش کر دیگی تسلی کا ۔۔۔ کہاں تک بیٹھ کر پردے میں لوگے لن ترانی کی

وہ میری لاش پر کہتے ہیں کیا ہو ڈوں سر ملے گا　　　بس اب حد ہو گئی یہ انتہا ہے بدگمانی کی

وہ اور بزم مئے تھی پہلو میں تھے عدو کے　　　ہم اور دل ہمارا یا گھونٹ تھے لہو کے
وہ تیر مجھ پر آیا پھینکا تھا جو عدو پر　　　دیکھو نظر سنبھالو تم پھر نشانہ چوکے

ہم اور اس طرح بے بس ہوں یہ قدرت کے کرشمے ہیں　　　یہ بت اور اس قدر مغرور ہو شان خدائی ہے
شراب ناب کے چرچے ہمارے سامنے زعت　　　کہ ہم نے اپنے وقتوں میں بہت پی کر پلائی ہے

تمہارے غم نصیبوں کو ستم بن کر ہنسی آئی　　　رلایا مدتوں اس نے اگر دم بھر ہنسی آئی
قبا ٹکڑے ہوئی زر بھی گیا غنچہ کی مٹھی سے　　　تعجب ہے کہ ایسے وقت میں کیونکر ہنسی آئی

بیاں دوزخ کا واعظ کرتے ہیں کچھ اس فصاحت سے　　　یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آئے ہیں وہاں ہو کر

ترا نقش کف پا جب زمیں پر دیکھتا ہوں میں　　　تو ہر ہر گام پر اک ماہ انور دیکھتا ہوں میں
طبیعت فطرتاً ضدی ہے اس کو کیا کروں اے دل　　　وہ مجھ کو منع کرتے ہیں تو اکثر دیکھتا ہوں میں

رسوائی کے خیال سے دشمن کے ڈر سے آج　　　کیا بچ کے جاتے ہیں وہ مری رہگذر سے آج
کھویا گیا ہے دل کسی مشتاق کا ضرور　　　کچھ چیز ڈھونڈتے ہیں وہ نیچی نظر سے آج
کس پہ خفا ہوئے ہو کہو بھی تو کیا ہوا　　　غصہ برس رہا ہے تمہاری نظر سے آج

شاید وہ آج پھول کا ساغر اڑا گئی　　　بہکی ہوئی نسیم سحر بوستاں میں ہے
کہتے ہیں جذب دل سے ڈراتے ہو کیا ہمیں　　　باتیں ہی باتیں ہیں کہ اثر بھی فغاں میں ہے

سعید

اس مہ جمال کے لئے مضطر ہوں رات دن
قسمت میں میری چین یہ آسماں نہیں

دل چاہے تو رقیب سے ملئے ھزار بار
میں آپ کی طرف سے ذرا بدگماں نہیں

اس دن سے برق پاش نہیں ہوتا آسماں
جس روز سے چمن میں میرا آشیاں نہیں

زنداں سے عزم بھاگنے کا جب کیا سعید
پڑ پڑ کے پاؤں کہنے لگیں بیڑیاں نہیں

ہاں ذرا آج اے ہوائے شوق
پردہ اُٹھ جائے روئے دلبر سے

ہائے نیچی نظر کئے ظالم
جا رہا ہے میکدہ برابر سے

ہو رہی ہے یہاں تو حالت غیر
کب پھریں گے وہ غیر کے گھر سے

صورت ہے رنج کی بھی خوشی کی خبر کے ساتھ
بھیجا ہے اس نے غیر کو بھی نامہ بر کے ساتھ

رہنے دے پند بس نہ پریشاں دماغ کر
سودائے زلف یار تو ناصح ہے سر کے ساتھ

خط لکھ کے اس پری کو یہ دیوانگی بڑھی
خود مثل سایہ جاتے ہیں ہم نامہ بر کے ساتھ

احساں سبک سروں کا نہیں لیتے ذی وقار
گلشن میں کون جائے نسیم سحر کے ساتھ

کریں دریافت وہ تجھ سے ہمارا حال اے قاصد
تو کہہ دینا کہ اچھے ہیں تمہاری یاد کرتے ہیں

مبارک ہو انہیں بزم عدو کی رونق افزائی
سعید اب گور کی منزل کو ہم آباد کرتے ہیں

ملتے کیوں روز اوس ستمگر سے
ہم ہیں ناچار قلب مضطر سے

رکھ کے محروم ایک ساغر سے
خوں نہ رلواؤ دیدۂ تر سے

اپنا آنچل سنبھال کر بیٹھو
ڈھل گیا دیکھو شانہ و سر سے

دے کر ساقی لڑا لیں جام کو ہم
اپنے ٹوٹے ہوئے مقدر سے

پاتے موقع جو بزم ناز میں ہم
کرتے کچھ عرض بندہ پرور سے

ہاں ذرا آج اے ہوائے شوق
پردہ اٹھ جائے روئے دلبر سے

دم پرا اپنے بنے گی آج ضرور
یہ ٹپکتا ہے ان کے تیور سے

ہائے وقت آخر آئے تو
وہ نہ ٹھہر کر زیادہ دم بھر سے

کشتۂ ناز اے سعید ہوں میں
وہ جلا دیں گے ایک ٹھوکر سے

تم سا حسین کون بھلا دو جہاں میں ہے
شہرہ تمہارے حسن کا کون و مکاں میں ہے

جلوہ نما ہمیشہ دل عاشقاں میں ہے
گر اس مکاں میں وہ نہیں تو کس مکاں میں ہے

نبیوں میں کس کو مرتبہ معراج کا ملا
یہ خاص وصف سید عالی نشاں میں ہے

رہتا ہے باغ باغ میرا عندلیب دل
کیا شاد مدحت دہن گلفشاں میں ہے

یارب بہار باغ مدینہ دکھا دے اب
دل بیقرار گلشن ہندوستاں میں ہے

گھر ہم نے اپنا کوئے نبی میں بنا لیا
بلبل کا آشیاں چمن بے خزاں میں ہے

ہوتے ہیں قتل منکر شانِ حبیب حق
جوہر عجب سعید کی تیغ زباں میں ہے

شوکت

قصیدۂ تہنیت جشن سیمیں حضرت سلطان غازی عبدالحمید خاں

ہے آج باغ جہاں میں نئی طرح کی بہار
صبا نے جھاڑ دیا پتیوں سے گرد و غبار

بچھایا سبزے نے فرش زمردیں یکسر
ادب سے سرو کھڑے ہیں بسان خدمتگار

صبا جو چلتی ہے ہر غنچہ مسکراتا ہے
یہ معجزہ ہے کوئی یا ہے شوخیٔ رفتار

روش پہ باغ کی رقصاں ہیں ہر طرف طاؤس
لگاتے حوض میں غوطے ہیں فاض نو تیار

خوشی سے پتوں میں پھولوں نہیں سماتا ہے
جو پہنے بیٹھا ہے اک زر و بار ہار سنگھار

ہجوم گل کا ہے یہاں تک بقول خواجہ وزیر
جگہ نہیں جو کرے عندلیب دا منقار

سماں یہ دیکھا تو حیرت سی ہو گئی مجھ کو
ہر ایک شخص سے میں نے کیا یہ استفسار

بیان کیجئے یہ دھوم آج کیسی ہے
یہ جشن کس کا ہے اور کون ہے وہ عالی وقار

وہ سن کے بولا نہایت ہی مجھ کو ہے حیرت
کہ اس کی وجہ سے واقف نہیں ہو تم زنہار

یہ سنیے جو کہ ہیں فرمانروائے کشور روم
وہ یعنی حضرت عبدالحمید خاں سرکار

ہے جن کا لطف و کرم عام رعیت پر
ہر ایک شاد ہے صوفی سے تا بہ بادہ گسار

انہیں کی آج ہے پچیسیا سالہ جوبیلی
یہ اُن کے واسطے سامانِ عیش ہے تیار

یہ سُنکے میں نے سنبھالے وہیں دوات وقلم
اور ایک گوشہ میں جاکر لکھے یہ چند اشعار

ہے مطلع مطلعِ خورشید سے بھی روشن تر
سمجھ ہی لیں گے سخن سنج اس کو بے تکرار

دعا یہ دیتا ہے گردوں بھی تجھ کو لیل ونہار
کہ شاد باش از امروز تا بہ روزِ شمار

ہمیشہ اوج پر ہو تیرا نیّرِ اقبال
رہے عدو کا ترقی پہ رات دن ادبار

جو خیر خواہ ہیں تیرے جہاں میں شاد رہیں
عدو کو تیرے ندامت ہو تجھ کو عزّ و وقار

ہو موجزن ترا بحرِ کرم زمانے میں
رواں جہاں میں جہاں تک ہیں قلزمِ زخار

ہو فوج تیری ہمیشہ مظفّر و منصور
ہو فتحیاب ہمیشہ یہ لشکرِ جرار

دُعا پہ ختم کرو شوکت اس قصیدے کو
الٰہی شاد رکھ اس کو جہاں میں لیل و نہار

نمونہ از غزلیات

کبھی میری بھی بستی تھی کہیں میں بھی متنفس تھا
مگر اب کہہ نہیں سکتا کہاں تھا اور کیونکر تھا

چلے آنا تھا بے کھٹکے بھلا کس بات کا ڈر تھا
یہاں آنے میں حارج کون تھا یہ آپ کا گھر تھا

ہمارا قتل بھی منظور تھا تم کو تو کیا ڈر تھا
مناسب تھا مبارک تھا بہت موزوں تھا بہتر تھا

نہ ہوتا فاش پر دیدۂ تر کا تو بہتر تھا
مگر کیا کیجیے پہلو میں دشمن قلبِ مضطر تھا

وہ کیا اچھی گھڑی کیا نیک ساعت تھی کہ مقتل میں
تمہارے ہاتھ میں خنجر تمہارے پاؤں پر سر تھا

نشانہ کیا اڑا سکتا وہ اِن ترچھی نگاہوں سے
مگر تقدیر سیدھی تھی ہمارا دل ہی زد پر تھا

رسا تھا ذہن اپنا اس قدر پہلے کہ اے شوکت
جو دیکھا جو پڑھا جو سن لیا فوراً وہ ازبر تھا

گھونگٹ تو الٹ بیٹھے پردہ تو اٹھا بیٹھے
اب شرم سے کیا مطلب جب چار میں آ بیٹھے

محفل میں رقیبوں کی جانے کو تو جا بیٹھے
ہم سب سے الگ بیٹھے وہ سب سے جدا بیٹھے

آئے نہ عیادت کو مہندی کے بہانے سے
آنا ہی نہ تھا ان کو اک بات بنا بیٹھے

خالق کی عبادت سے محروم رکھا تم نے
جب ہم نے کیا سجدہ تم سامنے آ بیٹھے

۱؎ کلام شوکت مطبوعہ

آتے ہی چلے اُٹھ کر کہتے ہو خدا حافظ　　کیا خوب یہ آنا تھا کیوں آئے تھے کیا بیٹھے
عاشق وہ نہیں ہرگز شوکتؔ جو یہ کہتے ہیں　　ظالم تیرے ملنے سے ہم ہاتھ اُٹھا بیٹھے

آپ کی رفتار آفت ہوگئی　　فتنے اُٹھ اُٹھ کر قیامت ہوگئی
مرتے مرتے میں نے توبہ توڑ دی　　اتنی فرصت بھی غنیمت ہوگئی
پاؤں پھیلا کر لحد میں سو رہے　　اب زمانے بھر سے فرصت ہوگئی

شیدا

لبوں پر میرے دشمن کا گلہ شکوہ نہیں رکھتا　　نظر میں جو کھٹکتا ہو میں وہ کانٹا نہیں رکھتا
مثل ہے سانپ کا کاٹا ہوا رسی سے ڈرتا ہے　　غلط ہے یہ کہ میں اندیشۂ اعدا نہیں رکھتا
خدا جانے کہ کیا ایسی خطا سرزد ہوئی ان سے　　گل و غنچہ کو دو دن بھی تر و تازہ نہیں رکھتا
خرام ناز کو اب روک لے اے فتنۂ محشر　　قیامت کے لئے باقی کوئی فتنہ نہیں رکھتا
وہ کہہ دیتا ہے منہ پر صاف اپنا ہو کہ بیگانہ　　لگی لپٹی کسی کی بھی کبھی شیدا نہیں رکھتا

کلیوں سے ہو سجی ہوئی پھولوں کی ڈالیاں　　پاس زبان کے ساتھ ہوں نازک خیالیاں

شاد

شمع حریم حق کا پروانہ دل ہوا　　حرص و ہوا کی لو میں یہ اپنا بجھا دیا

ناتوانی کا بوجھ اُٹھ جاتا　　شکوۂ نارسائی کر لیتے
ہوئی امید شادؔ جینے کی　　چند روز اور ان پہ مر لیتے

آن کے بگڑنے میں میری بن آئی شادؔ خوب　　غصے سے وہ جو چڑھتے میں لپٹا پیار سے

قطب (منشی)

پیر و واعظ مولوی صاحب ۔۔۔ جبہ جبہ شکل غرائب
نبیوں کے وارث شیوہ خوشامد ۔۔۔ اہل ایماں والے مصائب
علم فقہ، تفسیر و عقائد ۔۔۔ کچھ نہیں جانیں قاضی و نائب
منطق حکمت پڑھنا عبث ہے ۔۔۔ جب تک نہ ہوئی ہو رائے صائب
بے منصب کو کوئی نہ پوچھے ۔۔۔ گروہ عقل کل کا ہو صاحب
بندے خدا کے ان کے خدا ہیں ۔۔۔ خواہشیں دل کی اور مطالب
یار ہے ساتھی ہر دم اپنا ۔۔۔ کس کے مرید ہوں کس کے طالب
دنیا ساری ناٹک شالا ۔۔۔ شاں تیری اللہ رے صاحب
حس و قویٰ کمزور ہوئے جب ۔۔۔ طاقت نہ رہی تو بن گئے تائب
جزر و مد ہے بہر جہاں کا ۔۔۔ کس کے نوکر کس کے صاحب
قوموں کی حالت یوں ہی رہی ہے ۔۔۔ مغلوب کوئی کوئی غالب
مثل مگس تو دل کو سمجھانا مت ۔۔۔ دنیا کل ہے شہد شوائب
ہم نے قطب جب غور سے دیکھا ۔۔۔ دنیا کے ہیں کام عجائب

منیر

سنو ہر سمت سے آتی ہے صدا یہ پیہم ۔۔۔ سال نو آیا گیا پر نہ گرانی کا الم
کر گیا سال گزشتہ غربا کو برباد ۔۔۔ انڈیا بھر میں تباہی کا اڑا کر پرچم
حال ابتر ہے رعایا کا پریشاں ہیں غریب ۔۔۔ ہو گئے شاہ بھی اس دور میں درہم برہم
گو مٹا جنگ و جدل پر نہ ملی آسائش ۔۔۔ دیدیا راحت و آرام کو اس دہر نے سم
بیٹھنے بھی نہ دیا چین سے ظالم نے ۔۔۔ گولے بربادی کے برسائے تباہی کے بم
غربا کاٹیں نہ کیوں عمر کے دن مر مر کے ۔۔۔ تنگدستی نے لیا گھر ہیں غریبوں کے جنم
رنگ چہرے کا زمانہ نے اڑایا ایسا ۔۔۔ گرمیٔ چہرہ اڑ جاتا ہے جیسے شبنم
نظر آتا ہے پریشانی کا ہر سو منظر ۔۔۔ گوش زد ہوتی ہے آواز گرانی ہر دم

مال کا لندن و جاپان سے آیا سیلاب / اور اٹھے ہند سے دولت و ثروت کے قدم
ہوش میں آ یہ زمانہ کی شکایت کیسی / شکوہ کر اپنا منیرؔ آج حوالۂ تعلیم
ہو گئے غیر زمانہ کے اثر سے ہشیار / قوم سوتی رہی کہتی رہی مدہوش منم
چھوڑ کر محنت و کوشش ہوئے آرام طلب / اور بزرگوں کے طریقے سے ہوئے نا محرم
اپنی ہی شامت اعمال کے ہیں سب جلوے / اپنے ہاتھوں ہوئے ہم آپ گرفتار الم
قوم اب اپنی کرے تحصیل علوم / غیر اقوام سے بڑھ جائے یہ دو چار قدم
کشمکش چھوڑ کے آپس میں محب بن جائیں / دوست تو دوست عدو کو بھی منالیں ہمدم
ہندوؤں نے بھی دیا ساتھ مسلمانوں کا / تا کہ ہو جائے محبت کی گرہ مستحکم
دل کے آئینہ سے اب دور کریں زنگ نفاق / متفق ہو کے رہیں تا ہو خدا کا بھی کرم
پست دنیا میں نہ ہوں جاہل و کاہل ہو کر / بام دولت پہ چڑھیں عقل کی لیکر سلّم
قوم میں اچھا ہو ہر شخص کو بیوپار کا شوق / قعر افلاس سے نکلیں نہیں با [illegible] رم و حشم
وقف تقدیر نہ ہوں محنت و تدبیر کریں / یاد رکھیں برکت کے لئے حرکت ہے لازم
سعی سے جہد سے ہیں گوہر مقصود بدست / مرد میداں نہیں ہمت کریں چھانیں قلزم
پیرو حق ہوں [illegible] کے تا دست نگر / تابع دین رہیں نجائیں نہ جاہل ادھرم
خود فضیحت دگراں را چہ نصیحت ایدل / ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوائے والے الم
خرچ ہو سو کا اور آمد نہ ہو کوڑی جسے / اس کا کیا حشر ہو ہو کیوں نہ وہ پابند؟
نہ ہوا دین کا تو اور نہ دنیا کا منیرؔ / نہ خدا تجھ کو ملا اور نہ ہوا وصل صنم
اب یہ سال آیا ہے اللہ خوشی دکھلائے / شکل ارزانی نظر آئے گرانی ہو کم
نظم آشوب زمانہ یہ لکھی تو نے منیرؔ / چاہیے اس کے لئے سال بھی ہو جائے رقم

لکھدے مصرعہ حافظ پئے سال سمت
این چہ شوریست کہ در دور قمری بینم
۷۶ سمت ۱۹

نوٹ:۔ منیرؔ کا پورا کلام دستیاب نہیں ہوا۔

نوحہ

ابتدائی حصہ (اپنے جوان بیٹے کی وفات پر) منتخب اشعار

آج کس کا غم ہے زیرِ آسماں   نوحہ گر ہیں کس لئے پیر و جواں
آج کس بد بخت کا اجڑا چمن   آج کس کے باغ میں آئی خزاں
غم زدہ بیٹھے ہیں سب کس کیلئے   کیوں ہیں جوئے اشک آنکھوں سے رواں
کون پرارماں گیا دنیا سے آج   کس کا غم کرتے ہیں یہ خورد و کلاں
آج کس کا جل گیا نخلِ امید   بلبلِ دل کا ہے اجڑا آشیاں
یہ کہا دل نے کہ اے پرسانِ حال.   مجھ سے سن اس رنج و غم کی داستاں

آخری اشعار

ختم کر بس اے منیرِ دل فگار   تا بہ کے یہ رنج و غم کی داستاں
فکر کر اب بہرِ تاریخِ وفات   لکھ کہ جس سے ہو سنہ ہجری عیاں
بود شنبہ ہشتم از ثانی ربیع   سوئے جنت رفت احمد از جہاں

۱۳۲۹

منعم

شمع رو آتی صدا ہے لبِ پروانہ سے   دل لگی کرتی ہیں پریاں ترے دیوانہ سے
تذکرہ حسن کا سنکر ترے دیوانہ سے   قیس و فرہاد چلے آتے ہیں ویرانہ سے
جن کے تقویٰ کی رہا دھوم تھی کل رندوں میں   آج وہ مست چلے آتے ہیں میخانہ سے
دیکھ بوتل کو تو کہتے تھے لنڈھا جاؤنگا سب   زاہدا بھر گیا جی ایک ہی پیمانہ سے
کاکلیں جان کے چھونا نہیں ان گالوں کو   یہی آتی ہے صدا شانہ کے دندانہ سے

خوش نصیبی کا یہ باعث ہے ترا اے منعم
تجھے پیغام جو آتے ہیں پریخانہ سے

(مملوکہ راقم۔ اصلاح یافتہ علوی)

در عالی کے درباں گر تلطف سے نظر کرتے — تو بیشک میرے آنے کی انہیں جلدی خبر کرتے
کبھی تو وصل سے اپنے مجھے بھی شاد کرنا تھا — کسی کا کیا ضرر ہوتا نہ اپنا تم ضرر کرتے
تمہیں اغیار کی حالت پہ ہر دم نظر الفت ہے — بھلا کیا حرج ہوتا گر توجہ تم ادھر کرتے
وہ بے تابانہ ہو کر رحم کرتا ہمدم و اسد م — کہ جس دم نالہائے خستہ دل پورا اثر کرتے
اجیا وصل کی تدبیر کیونکر مجھ کو بتلاتے — بھلا کیا چارۂ تقدیر یہ وہ چارہ گر کرتے
امید وصل خوباں پوری ہوتی اس دم اے منعم — خدا کا خوف گر دل میں بت بیداد گر کرتے

(مملوکہ راقم۔ اصلاح یافتہ محمد منظور)

مہ چرخ خود آرائی خدا جانے کہاں ہے تو — شہ خوبان زیبائی خدا جانے کہاں ہے تو
دکھا چہرۂ انور مجھے دکھلا دے اے دلبر — ہوں مدت سے تمنائی خدا جانے کہاں ہے تو
خیال زلف پیچاں نے ترے اب مار رکھا ہے — یہ سر پر ہے بلا آئی خدا جانے کہاں ہے تو
بہت کی جستجو میں نے نہ پایا پر پتہ تیرا — سراپا آرائے یکتائی خدا جانے کہاں ہے تو
تری فرقت میں اے جاناں کہا کرتا ہے روز و شب — یہ منعم تیرا شیدائی خدا جانے کہاں ہے تو

مناوی

لوری

تسنیم پیاری۔ دل کی دلاری — گوری نیاری۔ بیٹی ہماری
رانی سو جا۔ جانی سو جا۔ اچھی سو جا — بچی سو جا۔ سو جا۔ سو جا۔ سو جا۔ سو جا
تسنیم و کوثر۔ جنت کی نہریں — لوری تجھے دیں۔ دونوں کی لہریں
منی سو جا۔ ننھی سو جا۔ پیاری سو جا — نیاری سو جا۔ سو جا۔ سو جا۔ سو جا

جب صید دید پھنس کے تہ دام آئیگا — خود حسن عشق بن کے سر بام آئے گا
دین فرنگ بن کے جب اسلام آئیگا — دنیا میں امن عام کا پیغام آئے گا
مذہب جوان رکھ کہ رہے قوم بھی جواں — یعنی بشکل علم عمل کام آئے گا
موتی بچا کے رکھ عرق انفعال کے — محشر کے روز دامن تر کام آئے گا

سنا ہے عشق کا انجام خوش ہے　　پر اس کی ابتدا کیا جانے کیا ہے
سکوں تو ابتدا ہی سے ہے کافور　　ہوس کی انتہا کیا جانے کیا ہے
یہ بھاتی بھی لبھاتی بھی ہے سب کو　　منادی کی ندا کیا جانے کیا ہے

غایت سخن کی کیا جو اثر کا نشاں نہیں　　سحر خرد نہ ہو تو وہ شعر و بیاں نہیں
امکان دید عکس رخ یار کیا رہے　　مرآۃ دل ہی جب ترا صورت نشاں نہیں
یہ عشق بھی تو عنصر ایماں ہے پھر بھلا　　کیوں پیش اس کے کیجئے قربانیاں نہیں

نظم جشن آزادی

گئی جب اوج پر درماندگی ہندو مسلماں کی　　وطن کی بیکسی نے لی خبر دونوں کے ایماں کی
متاع حریت بہر وطن نعمت ہے یزداں کی　　غلامی کی بلا۔ ادبار اور لعنت ہے شیطاں کی
وطن ہے جسم اور جنتا وطن کے جسم کی جاں ہے　　ترقی جسم کی بھی ہو۔ ترقی ہو اگر جاں کی
فرنگی تاجروں کی حکمرانی؟ الاماں، مولا　　اڑائیں دھجیاں جس نے ہمارے جیب و داماں کی
ہماری صنعت و حرفت ہوئی بربادیوں ان سے　　ہری کھیتی اجاڑے جیسے ادھم کوئی حیواں کی
فرنگی بادشاہی سے فرنگی تاجری بدتر　　مچی اک کربلا تھی کمپنی کے ظلم و ؟ کی
بالآخر لی ہی کروٹ ہند کے مظلوم کیڑے نے　　بغاوت ملک میں برپا ہوئی ہندو مسلماں کی
اماں اہل غدر کو دینے ہی کا تو نتیجہ تھا　　گرفتاری۔ اسیری۔ سید صوفی سلیماں کی
فدا کر کے وطن پر اپنے دونوں شاہزادوں کو　　شہنشاہ ظفر نے عمر باقی نذر زنداں کی

حشمت

جلسے میں لوگ کرتے ہیں تحسین و آفریں　　مجھ کو یہ نعت گوئی نے حشمت صلا دیا

آہ و نالہ درد و غم اور ہجر جاناں کے سوا　　کوئی دنیا میں میرا مونس و ہمدم نہ ہوا

چلمن اٹھا کے دیکھتا ہے کوئی اِدھر اُدھر　　کہتا ہے حسن میں نہ رہوں گا حجاب میں

طوفانِ نوح سے ہے سوا طوفان اشک مرا   دریا کے ہیں بند یہ دونوں حباب ہیں

غنچہ دہن سے کچھ نہ سنا وصل کا جواب   مضمون سمٹ کر اس لبِ جنباں میں رہ گیا

بوسہ لینے پہ مچلتا ہوں اگر میں شبِ وصل   وہ جھڑک کر مجھے پہلو سے اٹھا دیتے ہیں
گاہے گاہے وہ میرے خواب میں آکر حشمت   میری سوتی ہوئی قسمت کو جگا دیتے ہیں

دنیا ہی بہاتی ہے لگا کر یہ جھڑی آنکھ   چھوٹی ہے نگاہوں میں پر عظمت میں بڑی آنکھ
فرقت میں جو یاد آتی ہے تیری تو ستمگر   اشکوں سے بنا دیتی ہے موتی کی لڑی آنکھ
کل خواب میں دیکھی ہیں تیری بالوں کی لڑیاں   آج اشکوں سے کیوں باندھ رہی موتی کی لڑی آنکھ
بھولے سے کبھی آتے نہیں وہ خواب میں حشمت   قسمت کو تیری دیکھ کہاں جا کے لڑی آنکھ

بھروچ کے شعراء: تذکرہ

شوق

میر عباس علی خلف قاضی سید زین العابدین قدس سرہٗ شوق تخلص کرتے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب سید احمد جعفر شیرازی تک پہنچتا ہے۔ والد کا انتقال شوق کی صغر سنی میں ہو جانے کی وجہ سے خاندانی کا احترام کرتے ہوئے نواب گورنر بہادر بمبئی نے ان کے لئے ماہانہ پچاس روپیہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ شوق متقی و پرہیزگار شخص تھے۔

فائق

سید محمد نور الدین حسین بن قاضی سید احمد حسین شیرازی فائقؔ تخلص کرتے تھے۔ بمقام بھروچ ۱۸۲۳ء/۱۲۳۹ھ میں فائق پیدا ہوئے اور ۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ مادۂ تاریخ 'فروغ' ہے۔ موصوف گجرات کے مشہور بزرگ سید احمد جعفر شیرازی کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے دسویں امام محمد تقی تک پہنچتا ہے۔ فائق کے ایک بزرگ سید ابراہیم متوفی ۱۲۱۴ء/۶۱۱ھ مدینہ سے شیراز گئے۔ ان کی اولاد میں سے سید محمود شیرازی شیراز سے سندھ آئے اور سندھ سے گجرات میں آ کر سکونت اختیار کر لی۔ فائق کے اسلاف بھروچ احمد آباد وغیرہ میں تقریباً دو سو سال تک عہدۂ قضاۃ پر فائز رہے۔ فائق کے جد امجد سید احمد حسین عرف سید میاں ۱۷۶۳ء/۱۱۷۷ھ میں دہلی میں ایک شہزادہ کے اتالیق مقرر کئے گئے تھے۔ شاہ عالم ثانی نے بھروچ کے نواب مرزا رفیع الدولہ کے عہد میں سید احمد حسین کو

بھروچ میں عہدۂ قضاۃ پر مامور کیا تھا اس وقت سے اب تک اس خاندان میں قضاۃ چلی آتی ہے۔ فائق کے خاندان میں بیعت و خلافت کا سلسلہ بھی بزرگوں سے قائم ہے۔

فائق نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی شادی احمد آباد کے قاضی صدر الحق کی صاحبزادی سے ہوئی تھی ان سے کوئی اولاد نہ تھی۔ دوسری شادی بھروچ کے ایک رئیس حکیم میر غلام علی کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ ان سے دو بیٹے ہوئے۔ ایک سید محمد عرف سجاد حسین جو صغر سنی میں فوت ہو گئے۔ دوسرے بیٹے سید احمد حسین تھے۔ فائق کے بعد سید احمد حسین جانشین ہوئے۔ سید احمد کے بیٹے سید نورالدین تھے مولوی عبدالحق بابائے اردو نے مخزن شعرا کے دیباچہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ موصوف بڑے علم دوست تھے۔ ان کے دو بیٹے ہیں جو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں ایک بیٹے سید زین سورت میں ٹریننگ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے خدمت انجام دے کر سبک دوش ہو چکے ہیں۔

فائق کی تعلیم و تربیت قدیم طرز پر گھر میں ہوئی تھی۔ موصوف معقول علمی ادبی استعداد رکھتے تھے۔ انہیں فارسی سے زیادہ شغف تھا۔ ان کے خاندان میں اکثر بزرگ صاحب علم و صاحب تصنیف گذرے ہیں۔ فائق کو بھی یہ ذوق وراثتہً ملا تھا۔ ان کی تصانیف یہ ہیں:۔

۱۔ طالع نجوم ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء (۲) ذکر فرمارو ایان ہندوستان (۳) تذکرۂ سادات شیرازیہ ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء (۴) انشار اسلام خانی (۵) مخزن شعرا (تذکرۂ شعرائے گجرات) بعض کتابوں پر تقریظیں بھی ہیں۔

قطبی:

جمال الدین حسن خان خلف نواب نور الدین خان نواب بھروچ قطبی تخلص کرتے تھے موصوف کا عالموں میں شمار تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

اعجاز

عبدالقادر نام اور اعجاز تخلص کرتے تھے۔ رضوان مراد آبادی (شاگرد غالب) سے مشورۂ سخن کرتے تھے[1] وطن بھروچ تھا۔ گجرات کے اساتذۂ فن میں شمار کئے جاتے تھے۔ امیرؔ و داغؔ سے انہیں نیاز حاصل تھا۔ لکھتے ہیں۔

تحریر داغ کہتی ہے جادو بیاں مجھے ۔۔۔ خط میں امیر نے بھی لکھا نکتہ داں مجھے
اعجاز اپنے نام کا میں ایک ہی تو ہوں ۔۔۔ کیا جانتے نہیں بت ہندوستاں مجھے

حضرت سیماب سے ان کے نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ ایک دفعہ سیماب مرحوم مشاعرہ کے سلسلے میں سورت تشریف لائے تھے۔ محلہ ترکی واڑہ میں محمدی محل نامی حویلی میں مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ مصرعہ طرح نہ جانے کیا تھا مگر قافیہ ردیف "نظر کے سامنے" تھا۔ اعجاز نے اپنی طرحی غزل پڑھی جس میں ایک جگہ "پیش نظر کے سامنے" لکھ گئے تھے جب صدر مشاعرہ حضرت سیماب نے اپنا کلام سنانا شروع کیا تو اعجاز پر اس طرح چوٹ کی۔

کھل گیا سیماب اعجاز بھروچی کا بھرم
لکھ گیا مرد خدا پیش نظر کے سامنے

اعجاز نے تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں ۱۹۲۰ء کے آس پاس انتقال کیا۔ ان کے پوتے کا پیشہ وکالت ہے ان کے نواسے مرحوم عبدالقادر بھی شاعر تھے کمتر تخلص کرتے تھے۔ سورت سے ہجرت کر کے کراچی چلے گئے تھے۔ کمتر صاحب نے اب شعر گوئی ترک کر دی ہے صادق سورتی ان کے استاد تھے۔ کمتر نہایت متقی و پرہیزگار شخص تھے۔ تصوف کی طرف طبیعت زیادہ مائل تھی۔ اعجاز صاحب کے حالات زندگی سے کمتر صاحب نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔

بھروچ کے دیگر شعراء میں مولوی محمد افروز سید عبدالرحیم جوش۔ شیخ غلام علی شاہ جولاں سید ابراہیم دلبر اور امیر صاحب مفتوں بھی قابل ذکر ہیں۔

۱۔ اعجاز کے کلام کا مجموعہ راقم کے کتب خانہ میں ہے

نمونہ کلام

مثنوی

عجب نہیں دہن یار گر نہ آئے نظر	دکھائی دیتا ہے چشمہ بھی آب حیواں کا!

ہم شوق سے اٹھاتے ہیں بیداد اس کی شوق	تاب عدو ہے کیا کہ اٹھائے جفائے دوست

ہمنشیں ڈرتے ہیں بسکہ مجھ کو لاغر دیکھ کر	بیٹھتے ہیں پاس میرے گرتو بستر دیکھ کر

مضمون مارزلف کیا آن میں شکار	طاؤس جب خیال کا اپنے ہوا بلند

جگر کے ٹکڑے کرو دل کو چور چور کرو	جو تم سے ہوسکے، مت اے بتو قصور کرو

فائق

دن بدن طفل اشک ہیں ابتر	دیکھیں اطوار کیا نکلتے ہیں
شمع کی قبر پر نہیں حاجت	اپنے سب داغ دل کے روشن ہیں

جان دی تب ہوا وصال صنم	نفع کو دیکھ اور ضرر کو دیکھ
شمع پروانہ دیکھتا ہے کیا	تو مری سوزش جگر کو دیکھ
کیا وہ جیتا ہے ہجر میں ظالم	پوچھتا ہے یہ نامہ بر کو دیکھ

ان کا پیکاں ہے آبدار بہت	پر مرے خون کا پیاسا ہے

یاس اُمید کے جھگڑے میں پھنسے ہیں فائق　　کب خدا جانے ہمیں ان سے رہائی ہوگی

اِس بلندی پہ کیوں فلک ہے غرور　　جتنی رفعت ہے وہ ہی پستی ہے

بے نیازی ہے اس کی قابلِ ناز　　جرم بخشے ہے ہر بہانے سے
اس دہن نے کیا لبِ معشوق　　جی تنگ آگیا زمانے سے
حیف ہے چھوڑ دے گلی اس کی　　فائق اغیار کے ڈرانے سے

یار کے ہم ہیں تشنۂ دیدار　　آبِ کوثر سے کیا ہو سیرابی

دم آگیا جدا دوں کا بس ناک میں ہمدم　　دیوانگی کرنے لگی زنجیر کے ٹکڑے
فائق جو کئی دن سے مقلد بہ قضا ہیں　　اس واسطے کرتے ہیں مزامیر کے ٹکڑے

اندیشۂ صبح میں شبِ وصل　　بس صبح ہوا وصال اپنا
کہتے کہتے حال دل قاصد کو پہنچے یار تک　　شوق نے کیا منزلِ مقصود کو پہنچا دیا
خواب میں نظارہ ہونے کے سبب پوچھی اُمید　　بختِ خفتہ نے وہ تعبیر کو پلٹا دیا

ہوا یہ غم کہ کھلی جب خلد میں آنکھ　　یہاں کوچے سے تیرے کون لایا !

اپنی قسمت کے لکھے کو روئیے　　کیا گلہ ہے گنبدِ دوار کا

زلف کے کھلتے ہی تاریکی ہوئی سب میں نمو　　روزِ محشر پہ گرا سایہ شبِ دیجور کا

کاٹے ہے اب انگشت کو حسرت سے وہاں میں　　کشتہ جو اسے فائق بیدل نظر آیا

نہیں قابلیت کی حاجت رہی کچھ　　پھنسانے کو ہے کافی مرگ چھالا

گر ہم کنار ہونگے نہ اس بحر حسن سے　　دنیا سے پھر کریں گے کنارہ بسان موج

کس طرح دل کا اب حصار کریں　　عشق پہنچا ہے فوج غم لے کر

اعجاز

شیشہ میں مئے سرخ بھری آئیگی　　دیوانہ بنانے کو پری آئے گی
اعجاز میں مدہوش ہوا جاتا ہوں　　لینے کو خبر بے خبری آئے گی

خیال زلف لیلیٰ جان بنکر دل میں رہ جاتا　　جنون قیس کا پردہ اگر محمل میں رہ جاتا
بندش کو کبھی ہم سے قصد وکد ہی نہیں　　مضمون کی کسی وقت خوشامد ہی نہیں
آورد بھی موجود رہا کرتی ہے　　اعجاز پر آمد فقط آمد ہی نہیں

ہم محمدؐ کو جب محبوب خدا کہتے ہیں　　سامعیں صلِ علیٰ، صلِ علیٰ کہتے ہیں
متکلم پوچھا کہا تو نے تو پھر کہہ دے توئی　　اے احد احمد بے میم کو کیا کہتے ہیں
روح تازہ دل اعجاز میں پڑ جاتی ہے　　قم جوان کے لب اعجاز نما کہتے ہیں

ہے تو شان خدا غریب نواز　　ہو گیا درد یا غریب نواز
دیکھتا ہوں میں کعبۂ دل میں　　کچھ عیاں کچھ چھپا غریب نواز
ہو گئے سینکڑوں غریب امیر　　خوب ہے یہ عطا غریب نواز
سوچتا ہوں کہ عقل ہے کیا چیز　　دیکھتا ہوں ہے کیا غریب نواز
دردمندان عشق کو مل جائے　　درد دل کی دوا غریب نواز
میں نہ بھولوں کبھی تجھے دم بھر　　ہو نہ مجھ سے جدا غریب نواز
عاشق اہل چشت ہے اعجاز　　ہے فدا تجھ پہ یا غریب نواز

محو نگہ ناز کیا کرتے ہیں　　ہر وقت یہ غماز کہا کرتے ہیں
اچھی طرح پہچان لے جادو والے　　بندے ہی کو اعجاز کہا کرتے ہیں

قطعی

منحصر کچھ منہ کے بوسے پر نہیں اپنا سوال　　پاؤں کے دو ہاتھ کے دو بازو کے غبغب کے دو
بوسہ وہ پہلے دیا کرتے تھے ہم کو بے حساب　　خوبیِ قسمت کہ اب ٹھہرے ہیں بدلے سب کے دو
ایک بوسہ اس کفِ پا کا غنیمت ہے ہمیں　　یہ کہاں اپنا دہن کہتے جو دو تم لب کے دو

بڑودہ کے شعراء کا تذکرہ

شیدا

خواجہ سعید الدین ابن الخال نواب حسام الدین حسین خان بہادر چغتائی نژاد تھے۔ ان کے بزرگ دہلوی تھے۔ شیدا بڑودہ میں پیدا ہوئے۔ صاحب مخزن شعراء کا بیان ہے کہ نہایت نیک سیرت و خوش طبع آدمی تھے اور ذہن سلیم اور فکر مستقیم رکھتے تھے۔ سنگلاخ زمینوں میں دو دو تین تین غزلیں کہتے تھے۔

ایک دفعہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نواب بڑودہ کے مہمان تھے۔ شیدا شیفتہ سے نیاز حاصل کرنے گئے۔ اور مصرع طرح چاہا اور جب بہت اصرار کیا تو شیفتہ نے یہ شعر پڑھ دیا۔

احباب تنگ کرتے ہیں فکر سخن کو اور تنگ آرہے ہیں جان سے اپنی سفر میں ہم

اسی وقت شیدا نے اس پر پوری غزل کہی اور مصرع اولیٰ میں تبدیلی کرکے اپنا مقطع پڑھ دیا۔

شیدا طرح مانگے تو کہتے ہیں شیفتہ تنگ آرہے ہیں جان سے اپنی سفر میں ہم

شیفتہ نے غزل سن کر بہت داد دی۔

۱۲۵۵ھ/۱۸۴۱ء میں سفر حجاز و زیارت وغیرہ سے واپس آنے کے بعد جوانی میں انتقال کیا۔ شیدا صاحب دیوان تھے۔

وفا

میرزا ابراہیم علی خان میر سرفراز علی خان سہسوانی کے پوتے اور میر اکبر علی خان کے بیٹے

طالب اور وفا تخلص کرتے تھے ۔ ۱۸۳۵ء اور ۱۸۴۰ء کے درمیان وفا پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور سن شعور کو پہنچنے کے بعد سورت میں اپنے چچا نواب میر جعفر علی خان کے پاس رہے جہاں منشی لطف اللہ فریدی سے عربی فارسی اور انگریزی پڑھی تھی ۔ ۱۸۶۰ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد وفا بڑودہ چلے گئے اور سلوہ دار سردار کی اسامی ان کے نام منتقل کر دی گئی ۔

وفا خوش رُو اور وضعدار شخص تھے ۔ قد میانہ ، بدن چھریرا اور رنگ صاف تھا ۔ داڑھی بہت خوبصورتی کے ساتھ ترشواتے تھے ۔ سر پر بڑودوی پگڑی ، انگرکھا اور آڑا پاجامہ پہنتے تھے ۔ آنجہانی بیشن پرشاد بنارس والوں کے پاس بھی ان کی تصویر تھی ۔ میر صاحب بہت خوش گلو تھے ۔ ہر ماہ اپنے دولت کدہ پر مجلس میلاد منعقد کرتے اور خود قصائد میلاد پڑھتے ۔ آواز میں درد تھا ۔ جب موصوف پڑھتے تو مجلس میں سکتہ کا عالم ہو جاتا ۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا شہرہ لکھنؤ تک پہنچا تھا اور عالم پیا نے انہیں بلا کر سنا اور خوب داد دی تھی مگر ۱۸۵۷ء میں تو عالم پیا کا کھیل ختم ہو چکا تھا ۔ ممکن ہے مٹیا برج میں انہیں طلب کیا گیا ہو ۔ وفا کی طبیعت مذہب و تصوف کی طرف مائل تھی ۔ موصوف احمد آباد کے صوفی محمود میاں چشتی کے مرید تھے ۔

میر صاحب غالب کے شاگردوں میں سے تھے ۔ ان سے غالب کی خط و کتابت بھی تھی ۔ معلوم نہیں غالب سے کبھی ملاقات بھی ہوئی تھی یا نہیں سلسلۂ شاگردی ۱۸۶۶ء میں بتوسط حکیم احمد حسن فدا قائم ہوا تھا ۔ ایک جگہ شاگردیٔ غالب پر اس طرح فخر کیا ہے ۔

کیا استاد اپنا تم نے غالبِ سخنداں کو ۔ بجالاؤ وفا شکر خدا ہو صاحبِ قسمت

اُردوئے معلیٰ میں ان دونوں کے نام خطوط ہیں ۔ رسم خط و کتابت غالب کی وفات تک قائم رہی تھی ۔ ایک خط میں غالب نے اپنی تصویر بھیجنے کا بھی ذکر کیا ہے ۔ وفا کے ہاں بیٹا تولد ہوا تو غالب نے ایک رنگین عبارت نثر میں اور ایک رباعی و قطعہ اور ایک قطعہ حکیم احمد حسن کا اکمل الاخبار میں چھپوا دیا تھا ۔ اس سلسلہ کے بہاری لال ، میر فخر الدین وغیرہ کے قطعے بھی اخبار میں چھپوا دیے گئے تھے ۔ غالب کی رباعی اور قطعہ ان کے خط میں بھی درج ہیں ۔

ل ضمیمہ ۔ میر صاحب کا خاندان

وفا کی شادی بڑودہ کے منشی غلام قادر کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ چار فرزند میر احتشام علی، میر ناصر علی، میر یوسف علی اور میر محمود علی تھے۔ میر احتشام علی بھی شاعر گزرے ہیں جاوؔ تخلص کرتے تھے۔ میر ابراہیم علی وفا نے بمقام بڑودہ ۱۸۸۵ء میں انتقال کیا۔

فدا

حکیم سید احمد حسن مودودی فدؔا اور جمالؔی تخلص کرتے تھے۔ حکیم صاحب میر سرفراز علی سہسوانی کے عزیزوں میں سے تھے۔ سہسوان سے بڑودہ اٹھ آئے تھے۔ ان کے ایک عزیز میر محمد علی زمیندار و مجسٹریٹ سہسوان کا بیان ہے کہ موصوف حاذق طبیبوں میں سے تھے۔ بڑودہ میں مطب کرتے تھے۔ ۱۳۰۲ھ میں انتقال کیا۔ ان کے فرزند اکبر الحاج حکیم حافظ سید محمود حسن بھی شاعر تھے۔ افسؔر تخلص کرتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں لگ بھگ وفات پائی۔ عمر تقریباً اسی سال تھی۔

غالب کے خط بنام احمد حسین قنوجی ۲۱ ستمبر ۱۸۶۰ء سے پتہ چلتا ہے کہ فدا حکیم احمد حسین قنوجی (برادر صدیق حسن خان) کی وساطت سے ۱۸۶۰ء میں غالب کے شاگرد ہوئے تھے۔ فدا کے نام غالب کے گیارہ خط ہیں۔ فدا نے ایک خط میں غالب کو قبلۂ قبلہ یا کعبۂ کعبہ لکھا ہوگا۔ غالب نے اس پر انہیں تنبیہ کیا تھا کہ یہ سوء ادب ہے۔ میر ابراہیم علی اور میر عالم علی (عالم علی بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں) فدا کی وساطت سے غالب کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہوئے تھے۔ غالب نے ایک خط میں کبر سنی کی وجہ سے اصلاح سے معذرت لکھی ہے مگر ۱۸۶۶ء کے خط میں شکایت پائی جاتی ہے کہ "آپ کی غزلیں برستی ہیں کہاں تک دیکھوں"۔ ایک دفعہ میر ابراہیم علی خاں نے فدا کے ذریعہ سو روپیہ غالب کے نام بھیجا ہوگا۔ شاید فدا نے کئی بار رسید کے لئے یاد دلایا ہوگا۔ غالب لکھتے ہیں: "سو روپے کے نوٹ کی رسید سو بار مانگتے ہو"۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب بہت پرگو تھے مگر افسوس کہ ان کے خاندان کے لوگوں سے بھی ان کا کلام دستیاب نہ ہو پایا۔ تھوڑا سا کلام میر ابراہیم علی وفا کے مجموعۂ کلام کے حاشیہ پر ملتا ہے۔ نمونۂ کلام میں مذکورہ کلام درج ہے۔

افسر صاحب کے سات بیٹے سید احمد حسین، الطاف حسین، مشتاق حسین، اعجاز حسین، یوسف حسین، ساجد حسین اور سجاد حسین اور پانچ بیٹیاں تھیں۔

مائل

میر عالم علی جناب رسالدار میر مودود بخش صاحب کے خلف الرشید تھے۔ سہسوان ضلع بدایوں کا یہ معزز خاندان بڑودہ اٹھ آیا تھا۔ ریاست میں خاندان کے افراد کو سردار بہادر کا خطاب عنایت ہوا تھا اسی طرح سرکار برطانیہ سے خان بہادر کا خطاب دیا گیا تھا۔ مائل کی تعلیم قدیم طریقہ پر ہوئی تھی۔ اچھی استعداد کے مالک تھے۔ وفا اور فدا کے ساتھ ساتھ یہ بھی غالب سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ان کے نام مرزا کے کئی خطوط ہیں۔ موصوف حسنِ صورت اور حسن سیرت کے اعتبار سے شہرت رکھتے تھے۔ لوگ دور دور سے ان کے دیدار اور شرف ملاقات کے لئے آتے تھے۔
مائل نے عین شباب میں ۱۲۹۰ھ کے آس پاس انتقال کیا۔ مائل کے بیٹے خان بہادر میر مظہر علی ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز تھے۔ میر مظہر علی کے بیٹے میر اظہر علی بھی شاعر تھے۔ ان کا کلام شائع کیا جا چکا ہے۔ میر اظہر علی کے بیٹے میر محمد علی خاندانی روایات کو قائم رکھتے ہوئے سہسوان میں سکونت پذیر تھے۔

جادو[1]

میر احتشام علی جادو خلف میر ابراہیم علی وفا شاگرد غالب صاحب دیوان گذرے ہیں۔ دیوان ان کے خاندان میں محفوظ ہے۔

صدر

نواب میر صدر الدین حسین خاں خلف نواب وجیہ الدین حسین خاں نواب صدرا الدین یاور الدولہ صوبیدار اورنگ آباد کی اولاد میں سے تھے۔ بڑودہ کے نواب میر کمال الدین دوم کے بعد ان کے بھتیجے داماد صدر الدین صدر جانشین ہوئے۔
صدر ۱۸۷۸ء/۱۲۹۵ھ میں بتاریخ ۲۶ محرم الحرام بروز جمعہ بڑودہ میں پیدا ہوئے۔ صدر کی تین سال کی عمر تھی کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ نواب موصوف کی دستور کے مطابق

---

[1] ضمیمہ۔ میر صاحب کا خاندان [2] نواب بڑودہ کا خاندان

تعلیم و تربیت گھر ہی پر ہوئی۔ عربی فارسی اُردو کی معقول تعلیم حاصل کی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں نواب کمال الدین دوم کی بیٹی سے شادی ہوئی۔

صدر سچے مسلمان تھے۔ قوم و مذہب کے لئے دل میں درد رکھتے تھے۔ سرسید و حالی وغیرہ کی اصلاحی تحریکوں سے بہت متاثر تھے۔ گجرات میں موصوف نے سماجی مذہبی اصلاح کے لئے ہر ممکن طریقہ پر کوشش کی۔ چھوٹے چھوٹے رسالے لکھ کر چھپواتے اور مفت تقسیم کراتے تھے۔ نثر و نظم کے تقریباً ستر رسالوں کا پتہ چلتا ہے۔ بڑودہ کی جامع مسجد اور عربی فارسی کے پہلے مدرسہ کے بانی ہونے کا نواب موصوف کو فخر حاصل ہے۔

افسر

حکیم سید احمد حسن فدا شاگرد غالب نے فرزند حکیم سید محمود حسن افسر تخلص کرتے تھے حضرت جلال اور یاس سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ افسر نے پختہ عمر میں بہ سنہ ۱۲۷۰ھ/۱۹۵۱ء میں وفات پائی افسر کی اولاد میں سات بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔

اس دور سے تعلق رکھنے والے دیگر شعراء کے نام یہ ہیں۔

(۱) محمد حسن۔ احسن (۲) محمد احسان۔ احسان (۳) میر باقر۔ امیر (۴) سید برھان الدین خوشتر (۵) سید حاجی میاں۔ غالب (۶) سید حسین۔ فدا (۷) سید منصور۔ کامل۔ (۸) منشی محمد حسین۔ مشتاق (۹) شاعر۔

نمونہ کلام

شیدا

میں نے کہا کوچہ میں ترے آؤں تو بولا
جاتا نہیں جنت میں گنہگار کوئی شخص

ہنستا کسی گُرو سے نہیں میں کہ مبادا
ہوجائے گلے کا نہ میرے ھار کوئی شخص

کیا بڑی عمر ہے یاد اس کو ابھی کرتے تھے
وہ سواری بُت ہوش رُبا آتی ہے

کس مزے سے مجھے کہتے ہیں وہ دیکھ کے بوسہ
کس کو بیمارِ محبت کی دوا آتی ہے

قصد تو یہ شکنی خلد میں حوروں کو ہوا
تا دمِ مرگ جو شیدا نے نبھائی توجہ

بزم میں رونے لگا جو ابھی ہنستے ہنستے
تیرے شیدا کو خدا جانے کہ کیا یاد آیا

(مخزن)

وفا

ارمان کچھ ارم کے نہ باغ جناں کے ہیں
ہم تو نثار سید کون و مکاں کے ہیں

تیر نگاہِ یار کا آماج گاہ ہوا
یہ حوصلے ہمارے دلِ ناتواں کے ہیں

کرتے ہیں آسماں پہ ملائک بھی الحفیظ
شعلے بلند یہ میری آہ و فغاں کے ہیں

بس ہے جو ہوئی عمر دو روزہ بھی چین سے
ارمان کس کو زندگیٔ جاوداں کے ہیں

کیا غم جو ہو وسیلۂ محمود[1] حشر میں
طالب[2] مرید آپ تو قطبِ زماں کے ہیں

---

[1] وفا احمد آباد کے ایک صوفی شیخ محمود میاں چشتی کے مرید تھے۔
[2] اس غزل میں وفا نے طالب تخلص کیا ہے۔

شادیوں سینہ میں جب دل ناشاد نہیں ۔۔۔ اب وہ شیون نہیں نالہ نہیں فریاد نہیں
ہے بہت قتل کو اک جنبش ابرو کافی ۔۔۔ تیغ کیوں باندھتے ہو تم کوئی جلاد نہیں
کھینچ لیں گے تری تصویر تصور میں ہم ۔۔۔ کیا ہوا دہر میں مانی نہیں بہزاد نہیں
رنج عشاق سے کب چین ہے معشوقوں کو ۔۔۔ صید کی فکر میں صیاد بھی آزاد نہیں
چھیڑنے کو یہ جفا اس کی وفا ہے ورنہ ۔۔۔ طبع اس شوخ کی کچھ مائل بیداد نہیں

کبھی یاد آتا ہے ہٹنا ترا شرما کے جانانہ ۔۔۔ کبھی ہنس کر چمٹ جانا وہ تیرا بے حجابانہ
بت میکش تری بانکی ادا پھرتی ہے نظروں میں ۔۔۔ کبھی زلفوں کا بل کھانا کبھی وہ چال مستانہ
ہوئی آخر تمہارے ہجر میں جوشش وحشت ۔۔۔ اجاڑا ہم نے بستی کو بسایا جا کے ویرانہ
بیانِ دردِ فرقت کر کے تم احساں جتاتے ہو ۔۔۔ کہانی آپ کی سن لی میرا اب سنئے افسانہ

نوحہ

مقتل میں یہ شہ کہتے تھے بھائی میرے پیارے ۔۔۔ ہے ہے میرے عباس
اب کون اٹھائے گا علم بعد تمہارے ۔۔۔ ہے ہے میرے عباس
کس طرح نہ نکلیں دل سوزاں سے شرارے ۔۔۔ ہے ہے میرے عباس

اے صبا لا خبر کربلا کی
کیا حقیقت ہوئی اہل جفا کی

ہے کہاں خیمہ شاہ والا
کس کے گھر کا وہ مہر اجالا
شمع ہے کس کی بزم وفا کی
اے صبا لا خبر کربلا کی

نظر آتا ہے ویراں مدینہ
تھا جو رشک گلستاں مدینہ

فدا (حکیم احمد حسن)

تمہارے غم میں آخر وضع بنا ہم نے فقیرانہ ۔۔۔ اٹھایا شہر سے بستر بسایا جا کے ویرانہ
کہا رو رو کے میں نے شب جو اپنے غم کا افسانہ ۔۔۔ تجاہل دیکھئے کہتے ہیں تو کس کا ہے دیوانہ
لپٹ جاتا ہے فرط شوق سے کیا بے حجابانہ ۔۔۔ فدا ہم دیکھ کر جلتے ہیں وصل شمع و پروانہ

وسکے تو کیجئے ڈھب آخری دیدار کا — لب تک آپہنچا ہے دم اس ناتوانِ زار کا
ہم ہی کچھ مرتے نہیں ہیں آپ کی اس چال پر — اک جہاں پامال ہے اس ناز کی رفتار کا
عاشقوں کا کوچۂ قاتل میں یہ ہے اژدحام — روز ہے امتحاں ہوتا ہے خوں دو چار کا

مائل (عالم علی)

گل پوش بعد مرگ ہمارا مزار ہے — کیا لطف ہے کہ عین خزاں میں بہار ہے
ظالم کدورتوں کی تری انتہا ہے کچھ — ہم خاک ہو گئے ترے دل میں غبار ہے
انکار بادہ ساقی سے ناصح نہ ہو سکا — معذور ہوں کہ طبع مروت شعار ہے
کیونکر اٹھا سکے وہ مسی کی دھڑی کا بار — اپنا ہی رنگ جس لب نازک پہ بار ہے
حیلہ سے مہندی ملنے کے ہاتھ اس کے چھو لئے — مائل بھی اپنے فن کا بڑا دستکار ہے

منہ رکھنے میرے منہ پہ وہ کہتے ہیں پیار سے — مائل ہے اب بھی جی میں ترے کچھ ہوس رہی

خطا ثابت کریں گے اپنی ہم اور انکو چھیڑیں گے — سنا ہے ان کو غصہ میں چمٹ جانیکی عادت ہے

کہتے ہیں وہ مدام کہ ہیں تابع رضا — مائل ہے جی میں آج انہیں آزمایئے

(طور کلیم و بزم سخن۔ بھوپال)

جادو

کھینچ کر آہ رسا ہم بھی اثر دیکھیں تو — ان کو کیوں کر نہیں ہوتی ہے خبر دیکھیں تو
ہاتھ دھر دیکھو مرے سینے پہ پھر کہ لینا — نہیں الفت کا ترے دل میں گذر دیکھیں تو
کس نزاکت سے بگڑ کر یہ نزاکت نے کہا — آپ اور قتل پہ باندھیں گے کمر دیکھیں تو
میں بھی ہوں غیر بھی ہیں بزم میں پھر دیر کیا ہے — جنبش تیغ ادا تیر نظر دیکھیں تو
ہے مقابل خم گیسو سے خم دور جگر! — بانکپن رزم میں ہوتا ہے کدھر دیکھیں تو
سخت جانی مری ہر بات یہی کہتی ہے — آج وہ برشش شمشیر دو سر دیکھیں تو

نہ ہوا اس بزم میں دشمن کا گزند اے جادو — آپ کی سحر بیانی کا اثر دیکھیں

کہہ چکے تھے ابھی نہ ساری بات — کاٹ دی آپ نے ہماری بات
یا نبیؐ شرم حشر میں رہ جائے — آپ کے ہاتھ ہے ہماری بات
وعدۂ وصل کر تو لو مجھ سے — خیر ایفا ہے اختیاری بات
لوٹ لیتی ہے جبر و طاقت و ہوش — بھولے پن کی وہ پیاری پیاری بات
صاف بے دل کو چاٹ جاتی ہے — تیغ براں ہے یا تمہاری بات
حشر میں پیش داورِ محشر — رکھ لے شرم گنہگاری بات
کیسا ہوا آپ کا اثر جادو — چار ہی دن کی تھی وہ ساری بات

میرے گریے سے خدا جانے رہے کیا ہو کر — یہ وہ قطرہ نہیں تھم جائے جو دریا ہو کر
نزع میں بہر عیادت وہ نہ آئیں نہ سہی — موت ہی کاش چلی آئے مسیحا ہو کر
ہنس کے یہ طالب دیدار سے کہنا ان کا — طور سے آئے ہو کیا حضرت موسیٰ ہو کر
ہائے اس بیخودیٔ شوق نے مارا ظالم — رہ گئے وصل میں ہم محو تماشا ہو کر
میں بھی قائل ہوں مسیحا کی مسیحائی کا — مجھ سا بیمار سنبھل جائے جو اچھا ہو کر
گرمیٔ حسن سے یہ دست حنائی تیرا — خوب چمکا ہے چراغ ید بیضا ہو کر
شکوۂ غیر پہ بولے وہ بگڑ کر جادو — مجھ پہ منہ آنے لگے میرے ہی شیدا ہو کر

واعظوں کو ہے بڑا درد گنہگاروں کا — ذکر ہر دم ہے خدا خانوں میں میخواروں کا
پاؤں کیا خاک اٹھے ضعف سے بیماروں کا — سر پہ چڑھا آتا ہے سایہ تری دیواروں کا
درد کیا تم کو غم ہجر کے آزاروں کا — حال بیمار سے پوچھے کوئی بیماروں کا
سخت جانی کی کشاکش سر مقتل توبہ — دم ہو باہر کہیں تیغے سے نہ تلواروں کا
اف رے ایذا طلبی نام شفا کا سن کر — چلوؤں سوکھ گیا خوں ترے بیماروں کا
قطرۂ خون جگر ہے دل سوزاں پہ تپاں — لوٹتا آگ پہ دیکھے کوئی انگاروں کا
آبلے پھوٹ کے رونے میں جنوں میں کیا کیا — آگیا ذکر زباں پر جو کبھی خاروں کا

ڈھونڈتا کس کو اے دستِ جنوں دہشت میں   اب بجز تار نفس نام نہیں تاروں کا
داغ عصیاں بھی ہے خورشید قیامت گویا   نام روشن نہو کیوں ہم سے گنہگاروں کا
صلح کل کوئی بھی جادو سا نہیں دنیا میں   دوست دشمن کا ہے گر یار ہے پیاروں کا

کسی پہلو مرا دل شاد کرنا   مجھے اپنا سمجھ کر یاد کرنا
پھنسانا سہل ہے دام بلا میں   مگر دشوار ہے آزاد کرنا
شب وعدہ تصور ہی میں آکر   دل ویراں مرا آباد کرنا
میں اے صیاد مرغ بینوا ہوں   مجھے صدقے ہی میں آزاد کرنا
بہت نازوں کا پالا ہے مرا دل   اسے ناحق نہ تم برباد کرنا
ذرا تھمنا ذرا رکنا دم ذبح   روا یوں خنجر فولاد کرنا
سنو جادو کی جب جادو بیانی   تو منہ سے تم بھی کچھ ارشاد کرنا

واعظ کہاں کا خون اڑا بخیط شراب   ایماں ڈبو نہ دے گی ترا گھونٹ بھر شراب
کیونکر دیا حرام اسے بے نیاز میں   دل کا علاج چارہ درد جگر شراب
مسجد میں کی کسی نے عبادت تمام دن   پی تھی کسی نے میکدہ میں رات بھر شراب
دنیا میں ہے حرام تو عقبیٰ میں ہے حلال   رکھتی ہر ایک جا ہے نرالا اثر شراب
جادو عجب نہیں ہے جو ساقی کی یاد میں   برسائے جائے اشک مری چشم تر شراب

غیر سے وصل کا اقرار یہ کیا   مجھ سے ایک بوسہ پہ تکرار یہ کیا
میں تمہیں جان سے بڑھ کر سمجھوں   اور تم مجھ سے ہو بیزار یہ کیا
چپ ہوئے کیوں دم غرض مطلب   ہے نہ اقرار نہ انکار یہ کیا
بخشے جائیں گے نہ روز محشر   جز بالفت کے گنہگار یہ کیا
لیکے دل پھیر لیں تونے آنکھیں   او ستمگار دل آزار یہ کیا
بے خودی کچھ تو مجھے سننے دے   کہہ رہے ہیں مرے غمخوار یہ کیا
نیچی نظروں سے سر بزم عدو   گھورتے ہو مجھے ہر بار یہ کیا

تم جو پلٹے تو خدائی پلٹی   ہو گئے یار بھی اغیار یہ کیا
قتل کرنا تھا عدو کو کہ مجھے   رہ گئے کھنچکے تلوار یہ کیا
جلوۂ طور نے موسیٰ سے کہا   لے مری طالب دیدار یہ کیا
کچھ عجب سحر بیان ہے جادو   چلتے فقرے ہیں سب اشعار یہ کیا

رُباعی

حسرت نہ کوئی اے دل نادان گئی   بے تابیٔ دل بن کے جواوسان گئی
درد بدل عشق کہوں کیا جادو   آئی جو طبیعت تو مری جان گئی

ایضاً

گلزار سخن میں شکل خوشبوہوں میں   بندش کہتی ہے قتل گیسوہوں میں
تسخیر زباں یہ کہہ رہی ہے مجھ سے   کیوں سحر بیاں نہوں کہ جادوہوں میں

(از قلمی دیوان)

صدر

شریعت سے بیزار ہر پیشوا ہے   نہیں عیب تھا جو وہ اب برملا ہے
ترقی میں جن کا قدم بڑھ رہا ہے   ہر اک علم پر جان و دل سے فدا ہے
عجب ہائے عالم میں محشر بپا ہے   نہ رنگ محبت نہ بوئے وفا ہے
حسد کا مرض اس قدر بڑھ رہا ہے   ہے جائز ستم اور غیبت روا ہے
ہر اک دوست اسراف میں مبتلا ہے   لیڈروں کو خوب ان پر وظیفہ ملا ہے
جو ناقدر کے ہاتھ میں زر لگا ہے   بزرگوں کا سرمایہ سب لٹ رہا ہے
حماقت کو دانش پہ قابو ملا ہے   کہ پابندی رسم دنیا سے سوا ہے
ہر ایک خود نمائی کا شیدا بنا ہے   کہ پیر و جواں کا یہی مشغلا ہے
میرے درد کو دیکھ بولے اطبا   نہ اس کا علاج اور اس کی دوا ہے

ہر اک قوم ہنستی ہے اپنی کجی پر — یہ کیسی روش ہے یہ کیسی ادا ہے
گئی آدمیت گئی رسم الفت — وہ دکھڑا پرانا ہے یہ دکھ نیا ہے
اکڑتے ہیں اس مفلسی پر مسلمان — یہ ہنسنے کا موقع کہ رونے کی جا ہے
ہے بلبل کی جا جھاڑ کا اب نشیمن — چمن کی جگہ خار کا بن اگا ہے
کرے صدر کیا کیا گلا کج روں کا — کہ گھر میں اسی غم سے آہ و بکا ہے

ذرا غیر قوموں کی ہمت تو دیکھو — فراوانیٔ علم و دولت تو دیکھو
بچی یا گئی ہے شرافت تو دیکھو — گئی یا رہی آدمیت تو دیکھو
ذرا وقت کا قدر و قیمت تو دیکھو — میسر ہے ہنگام فرصت تو دیکھو
کرو غیر [illegible] تو بیٹھ — اٹھا آئینہ اپنی صورت تو دیکھو
کرو اب نہ تم عیب جوئی کسی کی — ذرا اپنی ناگفتہ حالت تو دیکھو
دھرے ہاتھ پر ہاتھ بیٹھے ہو بے غم — یہ ہے ہاتھ اپنی فلاکت تو دیکھو
نہ شوق تجارت نہ ذوق سیاحت — اگر جینے کی ہے ضرورت تو دیکھو
نہ خواہش ہنر کی نہ فکر معیشت — مآل اس کا سوچو مضرت تو دیکھو
بد اعمالیوں نے کیا ہم کو رسوا — اگر وا ہو چشم بصیرت تو دیکھو
نہیں تم کو پروائے دین و عقبیٰ — یہ چھائی ہے کس درجہ غفلت تو دیکھو
بھلا خود نمائی کے دعوی سے حاصل — ذرا جیب و داماں کی حالت تو دیکھو
زباں سے نہ کہنا کہ ہم ہیں مسلمان — دلوں کی کدورت کثافت تو دیکھو
نہ عزت کی چاہت نہ ذلت سے نفرت — یہ کیسی بنی اپنی درگت تو دیکھو
نہ خوف خدا ہے نہ شرم پیمبر — یہ اسلامیوں کی علامت تو دیکھو
بدی سے ہے رغبت نکوئی سے نفرت — بڑھی کس قدر ہے جہالت تو دیکھو
نصیحت سے بیزار ناصح سے ان بن — کہاں تک ہے پہونچی جہالت تو دیکھو
غم قوم میں صدر جینا کٹھن ہے — یہ کیسی پڑی ہے مصیبت تو دیکھو

دنیا میں زیست ہے تیری جور و جفا کے ساتھ — افسوس دن گذرتے ہیں مکر و دغا کے ساتھ

اے کور دیدہ ربط نہ رکھ فتنۂ جہاں کے ساتھ — دل کو لگائے بیٹھا ہے کسی بے وفا کے ساتھ
نفرت ہے راست بازوں سے اے مست کجروی — پایا جمایا تو نے نہ صدق و صفا کے ساتھ
زاہد میں اور خدا میں ہے پیمان دوستی — دعویٰ ہے دشمنی کا تجھے پارسا کے ساتھ
دل دادا خود نمائی پہ رہتا ہے کیوں بشر — چھوڑے گا گر خودی تو ملے گا خدا کے ساتھ
سب خاص و عام آج تو بدعت پسند ہیں — الفت کہاں کسی کو ہے خیر الوریٰ کے ساتھ
عمر عزیز تیری ہے مصروفِ حرص و آز — آزار خلق ہے تیری ہر ہر ادا کے ساتھ
دولت پہ کر گھمنڈ نہ حشمت پہ کر غرور — سیرت درست کر لے تو خوف خدا کے ساتھ
خواہش ہے گر نجات کی رکھ شرع میں قدم — چل صدرؔ بے خطر تو اسی رہ نما کے ساتھ

افسرؔ

کہاں تک کریں ضبط اے چشم تر ہم — بہت پی چکے اشکِ خونِ جگر ہم
کشش حسن اور عشق کی دیکھ لینا — کھنچو کچھ اُدھر تم، رکیں کچھ اِدھر ہم
وہاں آنکھ اُٹھی۔ یہاں آہ نکلی — گرے تیر کھا کر اُدھر وہ۔ اِدھر ہم
خبر ہی نہیں اپنی منزل کی ہم کو — بتا بے خودی جا رہے ہیں کدھر ہم
یہ کیا کہہ رہے ہو ستمگر نہیں ہیں — دکھائیں تمہیں آؤ زخم جگر ہم
تمہیں کیا بتائیں کہ کیونکر بسر کی — تڑپتے رہے ہجر میں رات بھر ہم
بہے اشک تو ابرو رو کے بولی — کہیں ڈوب جائیں نہ اے چشم تر ہم
بہ زخم نگہ زخم خنجر نہیں ہے — عبث رکھتے ہیں چارہ گر دل پہ مرہم
نہیں پھرتی پتلی دم نزع افسرؔ — انہیں دیکھتے ہیں اِدھر اور اُدھر ہم

پاس مسجد کے جو دروازہ ہے میخانے کا — شب کو کرتا ہے تقاضا کوئی پیمانے کا
گر یہی حال رہا آپ کے دیوانے کا — قیس لکھ دیگا قبالہ کسی ویرانے کا

احمد آباد کے شعراء کا تذکرہ

باقر

منشی باقر علی باقر احمد آباد کے جید صوفی شاہ عالم بخاری قدس سرہٗ کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے بڑے بھائی کاظم علی کھیڑ کے فوجدار تھے۔ باقر دو چار سال کھمبات میں قیام کرنے کے بعد ۱۸۸۲ء/۱۳۰۰ھ میں بمبئی چلے گئے۔ بمبئی میں خورشید جی جی بھائی (مشہور پارسی خاندان) نے انہیں اپنے حلقۂ مصاحبین میں شامل کرلیا تھا۔ صاحب مخزن شعرا کا بیان ہے:

"فاضلے است سخن سنج نکتہ پرور و عالمے خوش کلام و خوش فکر در رسوم شعر و قوافی و انشار عروض بے نظیر روزگار است۔"

حسن

سید حسن خلف منشی باقر علی باقر حسن تخلص کرتے تھے۔ تحصیل علم اپنے والد سے کی اور مشورۂ سخن بھی انہیں سے کرتے تھے۔ گجرات میں حسن ثانی ولی مانے جاتے تھے۔

آفریں تجھ کو حسن بعد ولی کے تو نے — صبح مضمون سے بدل کیا گجرات کی رات

موصوف کا کلام ان کے پوتے سید مظہر علی سے راقم کو کم دستیاب ہوا ہے۔

رسوا

مرزا عبداللہ بیگ بن قائم قلی خان رسوا تخلص کرتے تھے۔ قائم قلی کچھ مدت کے لئے احمد آباد کے ایک صوبیدار کے دیوان رہ چکے تھے۔ دھولقہ اور پٹلاد (گجرات) ان کی جاگیر تھی۔ خاندان کے چند افراد جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانے میں ذمہ دار منصبوں پر سرفراز تھے۔

رسوا نے حضرت بڑا صاحب خدا نما سے کسب باطنی کیا تھا۔ آخر عمر میں خوف خدا کی وجہ سے اپنا دیوان غرق آب کر دیا تھا۔ صرف دو شعر دستیاب ہو سکے۔

ظفر

سید مظفر حسین بن سید غلام رسول نقوی۔ احمد آباد کے قطبی بخاری تھے۔ انگریزی فوج میں میر منشی کے عہدہ پر ایک عرصہ تک فائز رہے۔ اس کے بعد کراچی کے قریب کیٹی بندر میں بعہدہ فوجدار مامور کیے گئے۔ سندھ کے بمبئی علاقہ سے الحاق کے بعد انہیں دھولقہ جیکھلی وغیرہ گجرات کے اضلاع میں فوجدار کے عہدہ پر فائز رہے۔ ملازمت سے دست بردار ہونے کے بعد کاشتکاری کرتے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں ساٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

سید مظفر حسین ظفر تخلص کرتے تھے۔ اور زیادہ تر مدح اہل بیت میں اشعار کہتے تھے۔ صاحب مخزن شعرا کا بیان ہے کہ ظفر کو فارسی نثر نویسی اور تاریخ دانی میں مہارت حاصل تھی۔

علوی

غلام جیلانی نام اور تخلص علوی تھا۔ علامہ شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کی اولاد سے تھے۔ سن رشد سے کھمبائت میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ بجھو کے شاگرد تھے۔

عرفی

غلام وجیہ الدین عرفی علامہ شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کے خاندان سے تھے۔

منیر

نام محمد تخلص منیر اور وطن احمد آباد تھا۔ سید احمد احمد کے شاگردوں میں سے تھے۔ مرزا کام بخش خلف مرزا سلیمان بخش کے ہمراہ دہلی گئے تھے۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔

نجف

محمد شفیع عرف مرزا نجف مرزا نواب نجف تخلص کرتے تھے۔ مصنف مرآت احمدی علی محمد

خان بادشاہی دیوان   کے جداعلیٰ تھے۔ وطن کھمبائت تھا۔

احسن

سید احسن بن سید غلام رسول سید مظفر حسین ظفر کے حقیقی بھائی احمد آباد میں قاضی حسین کے کوچے میں رہتے تھے۔ زمینداری پر گذر اوقات کرتے تھے۔ ۱۸۸۰ء ۱۲۹۸ھ کے لگ بھگ پچاس کی عمر میں وفات پائی۔

بہار

منشی عبدالرزاق بہار احمد آباد کے باشندے تھے۔ انہیں نواب رضوان مرادآبادی کے شاگرد ہونے کا فخر حاصل تھا۔ محکمۂ پولیس میں جمعدار تھے۔ تمام عمر احمد آباد کے سابرمتی جیل میں بطور جمعدار کام کرتے رہے وہاں سے رٹائر ہونے کے بعد ریاست کھمبایت کے جیل خانہ کی جمعداری پر فائز ہوئے۔ بہت ہی قوی ہیکل اور چیچک رو تھے لہٰذا جیل خانوں میں قیدی ان سے بہت ڈرتے تھے۔ کھمبایت میں چند سال کام کرنے کے بعد واپس احمد آباد آکر بقیہ عمر گزاری۔ نعت خوب کہتے تھے۔ اعجاز بھروچی ان کے استاد بھائی تھے۔

سہیل

محمد عمر نام تھا سہیل تخلص کرتے تھے۔ سورت وطن تھا اور یہیں محلہ رانی تلاؤ (تالاب) میں رہتے تھے سہیل گجرات کی ٹپنی (دٹپنی)، بوہرہ جماعت کے رکن تھے۔ زردوزی کی صنعت میں خوب ماہر تھے اور یہی ذریعہ معاش تھا لیکن آخر عمر میں ترک کر دیا تھا۔ سہیل خوش الحان ہونے کی وجہ سے مدح خوانی کی مجلسوں میں ہوا باندھ دیتے تھے۔ اسی کی وجہ سے شعر گوئی کا بھی شوق ہوا۔ اور منشی عبدالقادر اعجاز بھروچی کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے تھے۔
سہیل کو اردو سے دلی لگاؤ تھا اور عمر بھر اردو کی خدمت کرتے رہے آخری عمر میں احمد آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ احمد آباد جانے کے بعد شعر و سخن کی مجلسیں گرم کیں اور اس ذوق و شوق کو زندہ کر دیا۔ ۱۹۱۱ء/۱۳۳۰ھ میں احمد آباد سے تحفۂ ادب نامی اردو نظموں اور غزلوں کا ایک ماہوار رسالہ جاری کیا تھا۔

سہیل نے ۱۹۱۱ء/۱۳۳۰ھ میں ایک شاندار مشاعرہ منعقد کیا تھا جس میں نوح ناروی نے بھی شرکت فرمائی تھی سہیل کا حلقۂ تلامذہ بہت وسیع تھا۔

سہیل نے قریب پچپن سال کی عمر میں ۲۲ یا ۱۹۲۱ء میں بمقام احمد آباد انتقال کیا۔ مزار بی اں کے قبرستان میں ہے۔ محمد سہیل کا ایک بیٹا بھی شاعر ہے ناچیز تخلص کرتا ہے۔

سہیل نے اپنا کوئی دیوان مرتب نہیں کیا۔ ان کا کلام شمالی ہند کے رسالوں پیام یار، جلوۂ یار، زبان اُردو، کمال دلی، پیام عشق وغیرہ میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ہمیں سہیل کی صرف تین غزلیں اور حالات ان کے شاگرد رشید جناب نخشر صاحب سے دستیاب ہوئے ہیں۔

کمتر

سید سراج الدین عرف باوامیاں قادری کمتر تخلص کرتے تھے۔ ۱۸۵۰ء میں بمقام ویرم گاؤں (قریب احمد آباد) پیدا ہوئے تھے۔ اس خاندان کے بزرگ سید شاہ تاج الدین اور شاہ قیص بڑے صوفی گذرے ہیں۔

کمتر نے اُردو فارسی، عربی اور انگریزی کی واجبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کرلی تھی۔ حکومت برطانیہ کی جانب سے کاٹھیاواڑ کی مختلف ریاستوں میں کمتر کو اعلیٰ عہدوں پر بھیجا گیا تھا۔ ریاست رادھن پور میں چیف جج تھے۔ گونڈل ریاست میں جائنٹ اڈمنسٹریٹر، وڈیا ریاست میں منیجر اور دوبارہ رادھن پور میں دیوان کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ رادھن پور میں پانچ سال دیوان کے فرائض انجام دینے کے بعد احمد آباد چلے گئے جہاں بقیہ عمر عبادت میں گذاری ہر ماہ کی گیارھویں کو نیاز کرتے تھے۔ کمتر بہت مخیر تھے۔ ان کے گھر سے شاید ہی کوئی سائل خالی ہاتھ جاتا۔ ۱۹۱۱ء میں بتاریخ ۱۱ نومبر شب کو گیارہ بجے کمتر نے انتقال کیا۔ بمقام رائے کھڑ انہیں کی کوٹھی کے باغیچہ میں دفن کیا گیا ہے۔ کمتر کے فرزند سید مصطفیٰ حسن صاحب نے چند سال قبل انتقال کیا۔

کمتر کو شاعری سے شغف تھا نعت زیادہ کہتے تھے۔ ان کے کلام کے چھوٹے گلدستے (۱) میلاد نامہ (۲) امداد غیبی (۳) پیغام مجبوری (۴) فروغ ایزدی (۱۹۰۰ء) (۵) فروغ دل (۱۹۱۱ء) (۶) عطائے خیر المرسلین (۱۹۰۳ء) (۷) الارمغان (۱۹۰۵ء) (۸) التحفہ (۱۹۰۸ء) شائع ہو چکے ہیں۔

نسیم

منشی امیر میاں نسیم احمد آباد کے ایک معزز فاروقی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا سنہ ولادت ۱۸۷۰ء ہے۔ احمد آباد کے ایک پرائمری سکول میں بطور مدرس خدمت انجام دیتے تھے۔ ملازمت کے آخری ایام میں احمد آباد کے زنانہ پرائمری پرکٹسنگ اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے اور وہاں سے ترقی کر کے ڈپٹی انسپکٹر ہو گئے تھے۔

نسیم کو اردو فارسی اور گجراتی سے شغف تھا۔ نسیم نے مولانا روم کی مثنوی کے چند حصے گجراتی میں ترجمہ کئے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں گجراتی پر عربی فارسی کے اثر کو واضح کیا ہے۔ شاعری میں یہ بہار کے شاگرد تھے۔ افسوس کے ان کے صاحبزادے سے بھی ان کا کلام دستیاب نہ ہو سکا۔

جناب فخرالدین فخر نے قطعہ تاریخ وفات کہا ہے۔

ہوا ہے سر سر تیز اجل سے پژمردہ — نہال گلشن فاروق کا گل خنداں
عقیل صاحب ادراک منشی کامل — امیر دولت علم و ادب امیر میاں
مدرسوں میں نمونہ تھی آپ کی ہستی — معلمی کے کمالات سر بسر تھے عیاں
نسیم کہہ کے لیا باغ شاعری نے انہیں — جو دیکھا چشمۂ فیض بہاراں میں لرزاں
نشان بوئے گل تر وہ ہو گئے رخصت — تھا جن کا رنگ حقیقت میں زینت بستاں
اندھیرا کیوں نہ ہو دنیائے فہم و دانش میں — ہوا ہے موت کے پردے میں مہر علم نہاں
لکھا ہے مصرع سال وفات فخر نے یوں — مدرسین کے استاد صاحب عرفاں

۱۳۶۲ھ

اس دور کے دیگر شعراء میں میر احمد علی انجم، شیخ علی اللہ طالب، ۱۹۴۳ء محمد کاظم میر ذوالفقار علی مسیح، سجاد، علاؤالدین اور مرزا کے نام ملتے ہیں۔

نمونہ کلام

باقر

ہم کو یہ منظور ہی ہووے اگر دیکھنا — زلف و رخ یار کا شام و سحر دیکھنا
تیری میری ہے یہی شرط محبت کہ تو — ہوتے میرے غیر کو نہ آنکھ بھر کر دیکھنا
موتی کا بالا تیرا دیکھ کر رخسار پر — پھول کے ہیں بول اٹھا شمس و قمر دیکھنا
باقر اگر ہوں میں تو مر کے گروں گا یہیں — کہنے پہ موقوف کیا ہوگی خبر دیکھنا

جو لب سے اپنے تبسم وہ گلعذار کرے — دہان غنچہ صبا کیوں نہ بخیہ دار کرے

حسن

گر گریہ کی طغیانی پہ دیدۂ نم پکڑے — پھر نوح کا طوفاں بھی جھک جھک کے قدم پکڑے
توصیف صنم اپنی لکھنے کے لئے یارو — پروانے کے پر کا جب ہاتھوں میں قلم پکڑے

کیجئے کرم بہر خدا رات کی رات — بات کی بات میں گذری ہے ملاقات کی رات
مرہم دیدۂ خونبار میں سمجھا اس کو — مہندی چھوٹی جو ملی مجکو ترے ہاتھ کی رات
ایک تو ہجر کی شب دوسری زاری اپنی — اس طرح کی تو نہ دیکھی کبھی برسات کی رات
اہل مقبول شب قدر کو اور اہل جنون — ہجر کی رات کو سمجھے ہیں مناجات کی رات
آفریں تجھ کو حسن بعد ولی کے تو نے — صبح مضمون سے مبدل کیا گجرات کی رات

ہے سراب خشک دریا یہ نظر کے سامنے — ابر بھی پانی بھرے ہیں چشم تر کے سامنے
کھل پڑے زلفوں کے اس کے بال یوں رخسار پر — شام نے جلوہ کیا ہو جوں سحر کے سامنے

یہ دربینی نہیں ہے دانۂ روالبلا　　چشم بدتا جاگرے پہلے گہر کے سامنے

مانگ میں دُر نہیں تمہارے ہیں　　اُوٹ میں ابر کے ستارے ہیں
چرخ تک ہم نے آہ ماری ہے　　یہ ستارے نہیں شرارے ہیں
سامنے اس کے کوئی مت جانا　　اس کی مژگاں تو سب دُھارے ہیں
بخدا شعر تیرے میر حسن　　ایک سے ایک نیارے ہیں

ابر کیا کم ہے عبث ہاتھ نہ شمشیر کے پھینک　　دیوے گی وہ کئی سرکاٹ کے نخچیر کے پھینک
بور طالع کہ ملا تجکو حسن منصب عشق　　پھاڑ کے جبکہ فرمانوں کو جاگیر کے پھینک

سلام

دنیا میں غم شہ میں جو ہو خستہ تن اپنا　　کافی یہ سند ہے کہ ہو مسکن عدن اپنا
ہے نام خدا ورد زبان پنجتن اپنا　　یہ بات بڑی اور ہے چھوٹا دہن اپنا
داغوں سے غم شاہ کے دل رشک ارم ہو　　فردوس سے ہم دوش ہے صحن چمن اپنا
قدر گہر فاطمہؓ امت نے نہ جانی　　شبیر نے لاچار ہو چھوڑا وطن اپنا
مدفون جو کیا فاطمہؓ کے مہ کو تہ خاک　　یاد آیا مہ و مہر کو روز گہن اپنا
قاسم نے یلوں سے کہا صمصام پکڑ کر　　جوہر تو دکھا دیوے کوئی تیغ زن اپنا
ہے الفت مہدی سے جو تازہ چمن دل　　پھولوں سے مہکتا ہے حسن پیرہن اپنا

قصیدہ

جہاں میں عمر سا حیراں ہوں اور　　ستم زمانہ کا دیتا نہیں ہے دم کا قرار
اسیر پنجۂ جور و جفا یہاں تک ہوں　　ہے تو دیکھ کے حیراں ہیں سب صغار و کبار

امن کی جاہ نہیں ایسی جہاں پناہ ملی | لبوں پہ اس لئے نالہ ہے میرے سو سو بار
دہک رہی میرے سینے میں آتش غم ہے | یہ سینہ ہے میرا یا ہے خلیل کا گلزار
نظر مجھے نہیں آتا ہے اب زمانے میں | خبر جو لیوے کوئی غمزدے کا ہو غم خوار
ابھی یہ دل سے تھا سوال و جواب میرا | نہفتہ اس سے یہ سب کر رہا تھا میں تکرار
کہ یک بیک مجھے آواز کان میں آئی | کہا کسو نے رہ لطف سے کہ اے ہشیار
یہ کیا ہیں وہم و خیالات فاسدہ تجھکو | اگرچہ مطلب دل کا حصول ہے درکار
پناہ گیر ہو تو اب نامدار کے گھر | کہ جس کی عقدہ کشائی کی اس قدر ہے پکار
اگرچہ عقدہ ہا لاحل جہان کے ہو ویں | پران کے ناخن ہمت کو کچھ نہیں دشوار
سنا جو میں نے تو خوش ہو کہا زہے طالع | مجھے بھی دل میں یہی بات تھی مرے دلدار
میں اب کروں ہوں بیاں اس کو دل کا مطلب کچھ | لکھوں ہوں اسکی ہی خدمت میں اپنا حال زار
یہاں تو اور بھی کہنے کو ہیں بہت اُمرا | پناہ بیکس و غربا اسی کی ہے سرکار!
مجھے ہی آئی تمنائے دل وہ حاتم ہے | سوا اسی کی نہیں اور مجھ کو خواہش کار
جو اس غریب کی جا ہو حضور باشوں میں | کہ اس قدر نہ ملے گا مجھے کوئی سردار
سخاوت اس کی زباں سے اگر بیاں کروں | بہا شکن ہو گہر کا سخن دم گفتار
وہاں بھلا کوئی دم مارے کیا شجاعت کا | کہ جس کی فتح و ظفر ہووے جوہر تلوار
عیاں قصیدہ میں ہے نام نامدار اس کا | کرے کوئی جو سرے لفظ ہشت بیت شمار

ابتدائی پانچ بیتوں کے سرحروف ،ح ،س ،ا م ،ا ل ،د ،ی ،ن ۔ دو ابیات سے حسام الدین نکلتا ہے)

مجال رستم و اسفندیار کو کب ہے | کہ ایسے شیر کے حملے سے وہ بچیں اک بار
وہ گرز مارے جو غصہ سے کوہ سنگ خارا میں | تو شکل طور ہو ہر سنگ سے نکل کے شرار
حسن تو ہاتھ اٹھا کر خدا سے مانگ دعا | قبول خاطر عالی ہوں یہ تیرے اشعار

رسوا

بستان دل کے اندر گلزار ہیں تو ہم ہیں | اشجار ہیں تو ہم ہیں اثمار ہیں تو ہم ہیں
ہیں عندلیب بے نطق اس گلشن جہاں میں | اس عین لامکاں کے مختار ہیں تو ہم ہیں

ظفر

قابل ہے گہر بھرکے درج دہن اپنا — وصف دُر زہرہ ہے سلائی سخن اپنا
مسکن ہو بلا ریب بہشت عدن اپنا — خادم جو سمجھ لیوے حسین و حسن اپنا
امت جو پیاری تھی رسولِ دوسرا کی — شبیر نے پیارا نہ کیا جان و تن اپنا
کشتوں کے یہ پشتے کیے سرور نے کہ ان میں — پھر منہ نہ بتاتا تھا کوئی تیغ زن اپنا
شہ کہتے تھے ثابت قدمیٔ حق سے ہے مطلوب — واں سینکڑوں حربے ہیں یہاں ایک تن اپنا
اکبر کو دکھا کہتے تھے حضرت رفقا سے — پہنچے گا جو میدان میں یہ صف شکن اپنا
چھ لاکھ میں یا اس سے فزوں لشکر اعدا — پر رخ نہ بتاویگا کوئی فیل تن اپنا
صغرا نے لکھی خط میں یہ اکبر کو حقیقت — کیا بھول گئے بھائی ہیں صدقے وطن اپنا
لاچار ہے بیمار ہے غمگیں ہے یہ دکھیا — تنہائی میں دکھ کس کو سناوے بہن اپنا
ہے ضعف یہاں تک کہ قدم ہل نہیں سکتا — سر کا بھی اٹھاتا نہیں اب بوجھ بدن اپنا
زینب نے پیاسوں کو دکھا کر کہا بھائی — مرجھائے ہے بے آب ہر اک گلبدن اپنا
سرور نے کہا ہائے جگر پھول سا شق ہو — کچھ بس نہیں چلتا ہے یہاں پر یہ من اپنا
امید قوی ہے کہ مکاں خلد میں ہوگا — محشر میں وسیلہ ہے ظفر پنجتن اپنا

علوی

خاک ڈالی دیدۂ وریاں میں اپنے ضعف نے — ہم گئے محفل میں اور وہ دیکھتا ہی رہ گیا

تو فلک یہ سے اگر یہ سر احسان ہوتا — ہیں سیہ بخت تو تھا کاکل خوباں ہوتا

اتنی مدت سے میں عریاں ہوں کہ اے جوش جنوں — چاک کرنا بھی گریباں کا میں بھول گیا

گرہ باز ایک کبوتر بھیجا اس کو بدلے قاصد کے — کہ تا عقدہ کھلے اس پر مری بیتابیٔ دل کا

یہ عالم اس کے جوبن کا جس محفل میں وہ گل تھا — وہاں گل ہو گئی تھی شمع اور پروانہ بلبل تھا

تصدق پائے نگاریں ترے دھو کر پینا   ہے تپ دل کو میرے شربت عناب سے خوب

سرمۂ سحر تصور ہے مرا اے عسلوی   اس کو اب مجھ سی ہوا خود کو چھپانا مشکل

مرا تو ناصحو! اس سے بھی دن نکلتا ہے   شراب کا ہے کو ہے آفتاب شیشے میں

اہل جنت کو ہوا عرصۂ محشر دوزخ   تپش دل جو وہاں لائی پریشاں مجھکو

عشق کا کل نہ چھوڑنا عسلوی   سانپ رکھا بھی کام آتا ہے

جس جائے دیکھوں صورت جاناں نمود ہو   آئینہ دار بن گئے دیوار و در مجھے

اہل سخن یہاں کے بھی سحر البیان ہیں   موتی نہیں اگلتے ہیں کچھ شاعران ہند

عرفی

کس نے کی جنبش ابرو کہ گرا طاق سے یہ   پھر ہوا شیشۂ دل چور دوبارا اپنا

غبار نقش پائے گل رخاں ہوں   ہوا خواہوں کہو بادِ صبا کو
طبیعت ہو رسا عرفی جب اپنی   دکھائے یار گر زلف رسا کو

اب کس کو کہیں سوا خدا کے   بت سنتے ہیں عرض کب کسی کی
تھی وصل کی شب بھی ہاتھ پائی   پائی نہ مراد ہم نے جی کی

خاموش بقول گویا عرفی   اچھی نہیں شرح عاشقی کی

شمع اس کو دیکھتے ہی خود بخود جلنے لگی　　اس کے حسن گرم میں طرفہ اثر پیدا ہوا

ان کا دشوار تھا آنا پہ وہ آئے ہیں تو اب　　مجھ کو دشوار ہوا آپ میں آنا شب وصل
آئینہ چھوڑ خدا کے لئے اس بت کو ذرا　　کوئی دم ہم کو بھی آنکھیں ہیں لڑانا شب وصل
محو آرائش اسے سمجھے نجف ہم نافہم　　پیچ تھا یار کی زلفوں کا بنانا شب وصل

منیر

قطرہ مہر ہو جس پر تری اے رشک قمر　　کب اسے چاہ ہو پھر یوسف کنعانی کی
بے وفائی کا تری شور تھا اک عالم میں　　تجھ پہ دل ہم نے دیا اور یہ نادانی کی
طاق ابرو میں صنم کیا سجدہ جب سے　　کافر عشق ہوئے ترک مسلمانی کی

احسن

سید احسن نقوی بخاری گجراتی — رسالہ نور ایمان ۱۳۱۲ھ بھاؤنگر

جو روتے ہیں سلامی شاہ کی تشنہ دہنی پر　　وہ بخشے جائیں گے محشر میں ایک قطرے پانی پر
عدن کو جب سدھارے اکبر ناشاد دنیا سے　　تو شاہ دیں بہت روئے پیمبر کی نشانی پر
یہ رتبہ سر کٹانے سے ہوا حاصل فدائی کو　　کہ سرور مرحبا کہتے تھے حر کی جانفشانی پر
رضا لی جب علی اکبر نے رن میں سر کٹانے کی　　ہوا تاریک تب سارا جہاں حیدر کے جانی پر
مریض کربلا کے صبر کو دیکھو مصیبت میں　　کہ جاری تھا شکر حق اس ناتوانی پہ
مکاں ہم کو ملے گا دوستوں لاریب جنت میں　　جناں واجب ہے شہ کے غم میں اشکوں کی روانی پہ
مشرف کر خداوندا شہ دیں کی زیارت سے　　کہ جان و دل سے ہوں یا رب فدا حیدر کے جانی پر
لئے خنجر چڑھا شمر لعیں سینے پہ سرور کے　　نہ آیا رحم ظالم کو ذرا بھی ناتوانی پر

علی مشکل کشا کے معجزے دنیا میں ظاہر ہیں
سزا پاتا ہے منکر آپ کے دل کی گرانی پر

بہار

بیاں کیا وصف ہو نورِ خدا کے   بنے سرتاج سارے انبیاء کے
ہوا وحدت کو جس دم شوقِ کثرت   احد ظاہر ہوا احمد میں آ کے
ہوا ہے پھر خیالِ دشتِ طیبہ   کروں پرزے نہ کیوں جیب و قبا کے
تقاضا ہے یہ مجھ سے میرے دل کو   جھکا دے سر درِ احمد پہ جا کے
دکھا جلدی بہارِ خستہ جاں کو   میسر مولا مدینہ میں بلا کے

کروں کیا شکوے چرخِ فتنہ زا کے   بگاڑا ہائے ظالم نے بنا کے
چمن میں لوٹتی ہے بوئے گل کو   عجب انداز ہیں بادِ صبا کے
زمانہ بھر میں ہے بت کی خدائی   خدائی بھر میں ہیں دعوے خدا کے
ہوئی جانِ حزیں کی خیر مشکل   کھلے ہیں بند اس بت کی قبا کے
اٹھایا ہائے ظالم نے نہ مجھ کو   برنگِ اشک آنکھوں سے گرا کے
ہوئے پامال ہم دستِ خزاں سے   بہار اس گلشنِ ہستی میں آ کے

کبھی اے دل انہیں ڈھا کر عدو کا گھر دکھا دینا   تماشا ضبط کا لے صبر کے خوگر دکھا دینا
تمہارے دوست ہی تو دیکھتے ہیں آنکھوں سے ورنہ   ذرا دشمن کو تو بدلے ہوئے تیور دکھا دینا
بہت کچھ ناز ہے اپنی برش پر تیغِ قاتل کو   اسے اے سخت جانی تو بھی کچھ جوہر دکھا دینا

یہ ادنی شعبدہ ہے ایک میرے قاتل کا   تلی جو تیغ نظر میں ادھر ہلال ہوا
بشر کی عمر بسر اس طرح سے ہوتی ہے   یہ دن ہوا یہ مہینہ ہوا یہ سال ہوا
یہ کس کے واسطے مہندی ملی ہے تلوؤں میں   پھر آج کہیے تو کیا شوق پائمال ہوا
وہ الجھے گیسو کے سلجھانے سے غضب ٹوٹا   کہ بال بال مری جان کا وبال ہوا

کمتر کے پیام نجوری کی سنہ تالیف از بہار

مرحبا مرحبا زہے دیواں — جس میں اشعار نعتیہ ہیں سبھی
ہیں مصنف جناب باوا میاں — یہ چہارم کتاب ان کی چھپی
نعت گوئی کا شوق ہے ان کو — اہلِ شعرا میں ہیں فہیم و ذکی
حب احمد میں جاں نثار ہیں وہ — مرحبا ہیں سخی و ابن سخی
طبع جودت کا کیا بیاں کیجے — جب اٹھایا قلم غزل لکھی
نئے مضموں کی تلاش ہر یک — نظم مرغوب بندشیں اچھی
فکر تاریخ پھر اب ہوئی مجھ کو — ہاتف غیب نے ندا یوں دی
سرِ دیواں بہار لکھ تاریخ — نسخۂ آفتاب مدح نبیؐ

۱۳۱۷ھ

نہیل

ہوتا نہ کیا کیجے اقرار کسی سے — کیا آپ کو مل جاتا ہے خاطر شکنی سے
یہ شیشہ نہیں ہے کوئی پیمانہ نہیں ہے — دل ٹوٹا ہوا جڑ نہیں سکتا ہے کسی سے
اغیار مرے بھیس میں پھرتے ہیں ہمیشہ — کھا جائیں کسی روز وہ دھوکا نہ کسی سے
اقرار ہوا ہے کہ وفا وعدہ کریں گے — کہنا یہ کسی کا ہے کہ کہنا نہ کسی سے
چوری سے بھی محفل میں نہیل آنے نہ پائے — دربانوں کو تاکید ہوئی ہے یہ ابھی سے

بتوں کو دے دیا دل یا الٰہی ہیں بہت چوکا — مگر پھر بھی یہ کہتا ہوں ابھی الفت کا ہوں بھوکا
شب مہتاب ہے ساقی ہے مے ہے صحن گلشن ہے — قیامت ہے نہ ہونا ایسے جلسے میں وہ مہرو کا
غضب ہے لیکے انگڑائی مرے پہلو سے اٹھ جانا — بڑھایا درد پہلو میں اسی پہلو تہی نے پہلو کا
نظر ملتے ہی شیدائی بنے جاتے ہیں سودائی — اثر ہے تیری آنکھوں میں ستم ایجاد جادو کا
محبت اس بت کافر کی گھر کرنے لگی دل میں — گذر ہونے لگا پھر خانۂ کعبہ میں ہندو کا
غم دل بر میں وہ چھائی اداسی اے نہیل آخر — ہمارا گوشۂ خلوت نہیں میدان ہے ہو کا

یوں تو ہے ڈھونڈے کسی کا بھی پتا ملتا نہیں — یہ مثل سچ ہے کہ گھر بیٹھے خدا ملتا نہیں
بت سے پوچھو اس تجاہل کا ٹھکانا کچھ تو ہو — مدتیں گذریں ہمارا مدعا ملتا نہیں

مرمٹے ہم جیتے جی ایسے کسی کی راہ میں
کہ نشاں مرقد کا بھی بعد فنا ملتا نہیں

دیر میں مسجد میں کعبہ میں کلیسا میں کہیں
ہائے اس چھپ جانے والے کا پتا ملتا نہیں

جی بہلنے کی نظر آتی نہیں صورت کوئی
دن تو کیا اب رات بھی وہ مہ لقا ملتا نہیں

غم کا پتلا ہم کو اس غم نے بنایا ہے سہیل
ان کو ملتا ہے ہمیں کیوں مدعا ملتا نہیں

کمتر

چھیڑ بیٹھے اور قصہ قطع کر میرا کلام
کچھ ندامت آگئی اے دل مرے مذکور کی

سیم اور زر کا صنم اکثر بنے اور ٹوٹ جائے
کیا تھا تیرا صنم آذر بنے اور ٹوٹ جائے

کمترین اس سخت جانی پر بھی آ جاتا ہے طیش
روز ہی فرما کشی خنجر بنے اور ٹوٹ جائے

دل شکستہ یوں تعجب کیا ہے اے دریائے حسن
اشک تیرے بحر میں گوہر بنے اور ٹوٹ جائے

گو ہمارے آگے ان کو شام سے نیند آگئی
کیا عجب رکھتے ولا ہیں طالع بیدار ہم

دیکھئے کیونکر مجھے صحبت وہ پیارے یار سے
جس قدر وہ بے شکر اس ہی قدر غمخوار ہم

نعتیہ

وہ در کی خاک کو کحل البصر ہم اپنی کرتے ہیں
جبیں سائی کو جس جا مہر و مہ سر اپنا دھرتے ہیں

نہ کیوں عرش بریں کو فخر کفش پا سے اس کی ہو
قدم بوسی کو جس کے در پہ کروبیں اترتے ہیں

خدائے پاک فرماتا ہے سچے ہیں وہی مومن
محبت جی سے بڑھکر جو نبیؐ سے کر گذرتے ہیں

اسی محکم وسیلہ سے ہوئے ہیں کمترین افضل
فدا یہ جان و دل کو اس لیے ہم تم پہ کرتے ہیں

دید کر کے آئے تم کیوں منتظر ہر دل نہ ہو
انتظاری بعد لطف وصل کیوں حاصل نہ ہو

اس لئے آتے ہیں سب کے بعد صدر انجمن
کون دے تعظیم گر اول سے پر محفل نہ ہو

مسجد نبوی میں لازم ہے مؤذن ہو بلال
کچھ نہیں محراب ابرو وہ کہ جس میں تل نہ ہو

جانتے ہیں سب کے ہم بھی آپکے ہیں جاں نثار
میری الفت کے جو تم ہوتے نہیں قائل نہ ہو

جب ملائک تم پہ ہوتے ہیں نہ دل دے فدا
میں تو اک انسان ہوں کیوں دل مرا مائل نہ ہو

تاب کیا کمتر نگہ کو ہوتی ان کے دید کی
جلوہ گاہ میں آنکھ کا پردہ اگر حائل نہ ہو

گئے عرش پر آپ سیارہ بن کر
اتر آئے اک پل میں مختار بن کر

مٹی ظلمت کفر تم سے جہاں کی
تم آئے شہ شش انوار بن کر

تمہارا رہبر تو امت کا ہر ایک پیمبر   تمہیں آئے خلقت کے غمخوار بن کر

مرزا

سوال وصل پہ کیوں اس قدر بگڑ بیٹھے   خوشی کی بات میں کیوں آپ کو ملال ہوا
بوقت نزع وہ آئے نصیب دیکھو تو   تمام عمر ہوئی جب مرا وصال ہوا
ہوا ان کے آتے ہی پورا ہوا میرا وعدہ   یہ ان کا وصل ہوا یا مرا وصال ہوا

نسیم

کمتر کے پیغام مہجور کی سنہ تالیف از نسیم

ثنائے شہ دیں نہ مرغوب کیوں ہو   ہے احسن سے احسن جہاں میں یہی بات
خدا جس کی فرمائے تعریف اس کی   زمانہ میں مدح کیوں ہو نہ وہ ذات
ثنائے رخ و زلف لکھتے ہیں سید   نہیں اور کچھ شغل دن ہو کہ ہو رات
مجازی تکلم سے ان کو ہے نفرت   نہیں چاہتے لغو گوئی خرافات
ذکاوت طبیعت میں حق نے وہ دی ہے   طبیعت فصیحوں کی ہو جائے بس مات
ہمیشہ دعا ہے خدا سے یہ اپنی   بلند ان کے دونوں جہاں میں درجات
لکھوائے نسیم اس کا سال مسیحی   ہے منقوط۔ مہاف و تبارک غزلیات
۱۸۹۹ء

قطعہ تاریخ ولادت باسعادت سید فخر الدین فخر گجراتی ۔ از نسیم

خوشی آج کچھ مجھ کو ایسی ہوئی
مرے بھانجے کو خدا نے دیا   وہ فرزند کہ گویا ہو جلیل
ہمیشہ محمد کا سایہ رہے   خدا اس کا ہر وقت ہوئے کفیل
شب و روز عیش و خوشی میں رہے   کبھی ہو نہ اس کی طبیعت علیل
بنا مہر دنیا میں مشہور ہو   ملے مرتبہ اس کو ایسا جلیل
وہ ذی عقل ذی شان و ذی علم ہو   کہ مانے ہر اک عاقل اس کی دلیل
بہت طول عمر و مراتب ملیں   ہوں دوست اس کے آباد دشمن ذلیل
لکھو تم بھی سال تولد نسیم
لئیق و خسرو و مند و دانا عقیل

۱۳۱۵ھ

تبصرہ

۱۸۵۷ء / ۱۲۷۲ھ تا ۱۹۵۰ء / ۱۳۶۹ھ

یہاں ۱۸۵۰ء تا ۱۹۵۰ء ایک صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا ایک سرسری جائزہ مقصود ہے۔ اس کو ایک دور نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس ایک صدی میں ادب کئی ادوار سے گذرا ہے۔ عہد ولی اور عہد میر کی طرح عہد غالب، عہد اقبال، ترقی پسند تحریک وغیرہ وہ سنگہائے میل ہیں جن کا ہر سنگ میل ادب میں ایک نئے موڑ کا پتہ دیتا ہے۔

اس صدی میں سرسید سے مولانا ابوالکلام آزاد تک ادب میں کئی اصناف کو متعارف کرایا گیا اور کئی طرز نگارش منظر عام پر آئے اسی طرح صنف غزل میں غالب و مومن سے اصغر و جگر تک اور نظم میں حالی سے اقبال تک سینکڑوں اساتذۂ فن گذرے جن کے فکر و فن سے اردو شاعری کی عظمت دوچند ہوگئی اور اس کی افادیت مسلم قرار پائی۔ غرض اس صدی میں ادب میں غیر معمولی انقلاب آیا۔ ادب کی بلندی و پستی گہرائی و گیرائی اور وسعت و پہنائی کے جائزہ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک سو سال کے عرصہ میں اردو زبان و ادب نے ترقی کی ایک سو منزلیں طے کرلی ہیں۔

گجرات میں اس ایک صدی کے دور میں شاعروں کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے۔ اس دور کے نصف اوّل کے شعراء میں میاں مجھو، میاں منظور، میاں داد خاں سیاح، حسن وغیرہ کا اساتذہ میں شمار ہوتا تھا۔ اس دور کے شعراء میں سے سیاح، وفا، فدا، عالم علی کو غالب سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ میاں مجھو بھی اپنے قیام دہلی کے موقع پر ذوق، مومن وغیرہ سے مشورۂ سخن کرچکے تھے۔ اس دور میں بھی بعض امراء نے شعر و سخن کی محفلیں بدستور قائم رکھیں۔ دراصل انہی کی سرپرستی کی وجہ سے گجرات میں اردو کی بات بنی رہی ورنہ گجرات تجارت کا ایک اہم مرکز ہے اور یہاں کی تاجر

قوموں کو علم و ادب سے خاص شغف نہیں ہے بھوا اور منظور کی بعض مثنویاں بھی پائی جاتی ہیں۔ بھو کی ایک مختصر مثنوی افیونی نامہ کے نام سے ملتی ہے۔ بھو نے افیون کی چند خوبیاں بیان کی ہیں یہ شاید اس لئے لکھی گئی ہے کہ کھبائت کے نواب صاحب اس کے عادی تھے اور میاں بھوان کے میر منشی رہ چکے تھے۔ ان کے شاگرد منظور نے افیون کی مزمت میں چند شعر کی مثنوی لکھ ڈالی۔ منظور کی دو بزمیہ مثنویاں جگر سوز (۱۸۴۸ء) اور منظور جہانی ملتی ہیں۔ منظور اس صنف کے مرد میدان نہیں تھے۔ مثنوی کے فن سے واقف نہیں تھے۔ منظور کی ایک مثنوی دریا موج کے نام سے ملتی ہے۔ اس میں سورت کے ایک سیلاب تاپتی ندی کا مفصل حال ہے منظور نے دیوان ولی مرتب کر کے ۱۲۸۰ھ میں شائع کیا تھا۔ انھوں نے منظور الاخبار کے نام سے ایک اخبار کا بھی اجرا کیا تھا۔

جہاں تک غزل کا تعلق ہے۔ گجرات کے متغزلین کے کلام میں وہی روایتی مضامین، تشبیہیں، استعارے، محاورے وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ انداز بیان میں بھی کوئی خاص ندرت نہیں پائی جاتی۔ ایک غور طلب نکتہ یہ ہے کہ یہاں کے بعض شعرا کو اساتذہ دہلی سے تلمذ کا شرف حاصل تھا لیکن انہی شعرا کا کلام لکھنوی مکتب خیال سے بے حد متاثر پایا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شعرا کو زبان کی سجاوٹ بہت زیادہ مرغوب تھی۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے: رعایت لفظی کی مثالیں :

منظور :

اس کی جو الجھی طبیعت بال سلجھانے کے وقت — جی میں ڈر کر دانت کھولے رہ گیا کیا شانہ آج
میں تو ہوں گم نگاہی کا مارا — تم نے کیوں مجھ کو نیچہ مارا
ہوں جو لاغر کنا پتا مجھ سے — خس کا منگواتے ہیں وہ اکثر عطر
ہے تجلی گاہ موباف زری کے نور کی — اس کے کب جوڑے کو پہنچے چوٹی کوہ طور کی

اخلاص

اس بت کافر کو ٹھہرایا الجھ کر پاؤں میں — سر پہ ہے احسان میرے رشتۂ زنار کا
مرگئے ہاتھ سے چھٹتے ہی کنار دامن — رشتۂ عمر مگر تھا ترا تار دامن

شوق

مضمون مار زلف کیا آن میں شکار — طاؤس جب خیال کا اپنا ہوا بلند

شوق

ہر روز قصد ہیں تصور سے شوق ہم　　دیکھا کسی کو کرتے ہیں ہر چند دور بین

فائق

گر ہم کنار ہوں گے نہ اس بحرِ حسن سے　　دنیا سے پھر گریں گے کنارے جانِ مج
ان کا پیکاں ہے آبدار بہت　　ہاں میرے خون کا پیاسا ہے

محاوروں کا استعمال :-

مجھو

دل چرانے میں ہاتھ ہلکا ہے　　نہیں خوبوں کا اعتبار افسوس
مہ نے اس سے جو لی رات لڑائی منہ کی　　تا ابد داغ لگا ایسی تو کھائی منہ کی

علوی

شبو کی نرم روح میں دن بھر مہک　　پھولے نہ اپنے بر میں سماتی ہے یاسمن

محسن

آج اس جھوٹے کی جھوٹی منہ لگی کیا مجھے　　جو پھڑکتے ہیں مرے پیرہن کچھ شب لب

فاضل

فرطِ شوق وصل سے دو قدم سے بے اٹھ اٹھ نزع میں　　مرتے دم پاؤں نکالے کیا ترے بیمار نے

تشبیہ واستعارہ

مجھو

دامن پشواز ٹھوکر سے اچھل جاتا نہیں　　مارتا ہے موج یہ بحرِ لطافت وقتِ رقص
ہر روش کی ہے چوٹی ایڑی تک　　سرو پہ شام آئے سایہ ڈھلتا ہے
شیشۂ ساعت سے ہیں ہم خاکسار　　خاک ہیں بس اپنے پیراہن میں جسم

اخلاص

دیکھ اس پری کو شمع جو دیوانی ہو گئی　　رشتہ ہے اب میرے گریباں کے تار کا

عربی الفاظ اور تراکیب

مجھو

وہ شرم سے کبھی نہیں آتا ہے سامنے　　مجھ کو نہ لائے کیوں نہیں مدِ رتقا ریا

یوں توڑے شیشۂ محتسب اور اس طرح ملے　　بنت العنب کی خاک میں حرمت بزار حیف
بے اشد تحقیق قدر الما رمن قید الحدید　　گھر سے کبھی صورت سے باہر آئے ہم آئینہ

قدیم ترکیبیں اور محاورے

بخشش

تاثیر تیرے عشق نے مجھ پر زری نہ کی　　میں کیا کروں نصیب نے کچھ یاوری نہ کی

شعلہ

قرار دل کو نہ تھا اس کی ٹھوکروں آگے　　سواری جبکہ کئے تم نے اسپ تازی کی

باقر

تیری میری ہے یہی شرط محبت کر تو　　ہوتے میرے غیر کو نہ آنکھ بھر دیکھنا

افضل

کل سے جو خط انھوں کا آیا ہے　　مجھ کو دیوانہ سا بنایا ہے

غمگین

شمع رویوں کی ملاقات سے تو کرتا منع　　ناصحا آگ لگو اس تیرے سمجھانے کو

متروک ترکیبوں کا استعمال؛

بخشش

جب کہ اس گل کا مجھے بیشتر پان آتا ہے　　تن بے جان میں سو رنگ سے جان آتا ہے

خوشتر

کثرتِ داغوں سے پہلے دل ہوا رشک چمن　　پیرہن ابھی پھر تو سرخ اشکوں سے گلگوں ہو گیا

۱۹۲۰ء تا ۱۹۵۰ء گجرات میں ان گنت شعرا گذرے ہیں جن کے مفصل ذکر کے لئے الگ ایک باب درکار ہے۔ اس موقع پر اختصار کے پیش نظر دو چار استاد شعرا کے نام گنا دینے پر اکتفا کرتا ہوں۔

اس دور کے استاد شعرا میں سورت کے صادق، احقر، نور بڑودہ کے افسر احمد آباد کے فخر، کلیم، زخمی وغیرہ خصوصیت رکھتے ہیں۔ محمد صادق زبا والے موسیقی کے علاوہ شاعری میں بھی اچھا خاصا دخل رکھتے تھے۔ شباب کا زمانہ رنگ رلیوں میں گذرا جب دن خراب آئے تو معاش کی فکر ہوئی۔ کئی سال مطب بھی کیا۔ ان کے زمانہ میں سورت میں حاذق طبیب ہوا

تھے لہٰذا طبابت سود مند ثابت نہ ہوئی۔ آخری چار پانچ سال ریاست سچین میں میر منشی کی
حیثیت سے خدمت انجام دی۔ وفات سے دو تین سال قبل ایک آنکھ کے موتیابند
کا آپریشن کرایا تو آنکھ جاتی رہی۔ راقم نے دریافت کیا کہ یہ سانحہ ہے تو فرمایا لارڈ ویول
وائسرے ہوکر آئے تھے انھوں نے یہ تمغہ دیا میری قدر و منزلت کے سلسلہ میں۔ صادق
کے شاگرد تو کئی تھے۔ ان میں سے بکیس اور کمتر قابل ذکر ہیں۔ راقم کو بھی ان سے شرف تلمذ حاصل
تھا۔ جناب احقر میمن جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت خوددار شخص تھے، برف کا کاروبار کرتے تھے،
ہمیشہ اپنے خیالوں میں ڈوبے ہوئے رہتے تھے۔ بعض اوقات راستہ پر ہی برف کی
لاری کھڑی کر دیتے اور کسی چبوترے پر بیٹھ کر شعر موزوں کرنے رہتے۔ حکیم سید تو بھی استادوں
میں شمار کیے جانے تھے۔ جوان شاعر ان سے اصلاح لیتے تھے۔ رفعت سورتی ان کے
استاد تھے۔ سورت کے ایک شاعر محمد انور تھے۔ انور تخلص کرتے تھے۔ سورت کے حکیم خاندان
سے تعلق رکھتے تھے دنیا دیکھے ہوئے تھے۔ روٴسا میں ان کی رسائی تھی بعض امیروں کے
بچوں کے اتالیق کی حیثیت سے خدمت انجام دی تھی۔ انگریزی زبان پر بہت قدرت
حاصل تھی۔ حاضر جوابی کا یہ عالم تھا کہ طوائفیں بھی ہار مان جاتی تھیں۔ آخری زمانہ میں ناؤ
نوش سے تائب ہوکر صوم و صلوٰۃ کے پابند ہوگئے تھے ۱۹۶۷ء میں بعمر ۷۰ سال انتقال
کیا۔ یہ استادوں میں تو شمار نہیں کیے جاتے تھے مگر شعر خوب کہتے تھے ایک دفعہ ایک
جلسہ میں انور نے کوئی شعر پڑھا جس میں لفظ فِقہا تھا۔ انور نے اس کو فُقہا پڑھا تو حکیم
احمد سعید ستیہ نے لقمہ دیا کہ فِقہا پڑھیے اور بار بار سعید لقمہ دیتے۔

احمد آباد کے نامی گرامی شاعر فخر الدین فخر غوثی مشائخ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ فخر کے
شاگردوں کا ایک گروہ تھا۔ بعض شعرا سے ان کی خوب چوٹیں ہوتی تھیں۔ شعرائے ان کو فخر
گجرات کا خطاب دیا تھا۔ بہت پرگو شاعر تھے اور پڑھنے کا انداز بھی بہت دلکش تھا
ایک دفعہ سورت میں نواب حفیظ الدین کے محل میں ایک شاندار مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔
بڑودہ کے کہنہ مشق استاد افسر صدر تھے۔ احمد آباد کی بڑودہ کی بھروچ سے بھی شعرائے شرکت کی تھی۔
مصرع طرح تو یاد نہیں رہا لیکن قافیہ دل، بسمل وغیرہ تھا۔ فخر نے بدقسمتی سے مہمل کو مُہمِل باندھ
دیا تھا۔ جیسے ہی شعر پڑھا تو استاد گرامی صادق نے خوب زور سے داد ان الفاظ میں دی
کیا مہمل کہا۔ فخر کو غلطی کا احساس ہوگیا۔ کلیم بہت پرگو اور کہنہ مشق شاعر تھے ساکن احمد آباد

نے ازروئے قدردانی کلیم کی جبلی منائی تھی۔ راقم نے بھی مقالہ پڑھا تھا۔ ان کے فرزند جمیل بھی شاعر ہیں۔ خاص بازار میں کتابوں کی دکان ہے۔ گڑگاواں کے رہنے والے ایک شاعر زخمی تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے احمد آباد میں مستقل اقامت اختیار کرلی تھی۔ طبابت پیشہ تھا۔ احمد آباد میں سیکڑوں شاعر ہیں۔ بعض شمالی ہند سے فکر معاش میں احمد آباد آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ ۱۹۴۳ء میں ایک عام مشاعرہ حضرت ماہرالقادری کے اعزاز میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس کی صدارت راقم کے سر پڑی تھی۔ ایک نوجوان شاعر نے غزل پڑھنے سے پہلے فرمایا: "ایک رباعی پیش کرتا ہوں"۔ لیکن جب پڑھنا شروع کیا تو قطعہ پڑھ ڈالا۔ ماہر صاحب میری صورت دیکھنے لگے میں نے کہا انہیں سے دریافت کیجئے۔ جب وہ پڑھ چکے تو ماہر صاحب نے فرمایا یہ قطعہ ہے رباعی نہیں۔ نوجوان شاعر نے جواب دیا "رباعی قطعہ جو چاہیں سو کہہ لیجئے!"

فہرست ضمیمہ ۱

گجرات کے چند خاندان

(سورت)
۱ حضرت سید جلال الدین المعروف پوتھاجے دانا صاحب کا خاندان
۲ عیدروس خاندان
۳ رفاعی خاندان
۴ مولانا غلام محمد کا خاندان
۵ حضرت سید عبدالوہاب بخاری کا خاندان
۶ قادری خاندان
۷ مدنی خاندان
۸ سورت کا نواب خاندان
۹ نواب بیلہ کا خاندان
۱۰ میر غلام بابا کا خاندان
۱۱ بخشی خاندان
۱۲ سچین کا نواب خاندان
۱۳ ملا خاندان عمدۃ التجار
۱۴ شیخ خاندان عمدۃ التجار
۱۵ شیخ چلپی کا خاندان عمدۃ التجار
۱۶ مرزا عاشور بیگ کا خاندان
۱۷ باکلنظ خاندان
۱۸ حکیم میر عیسیٰ کا خاندان
۱۹ حکیم شیخ محمد میاں کا خاندان
۲۰ منشی لطف اللہ فریدی کا خاندان
۲۱ سید نثار حسین شیبی بہاری کا خاندان
۲۲ سورتی جمدار کا خاندان
(بھروچ و بڑودہ)
۲۳ شیرازی خاندان
۲۴ بھروچ کا نواب خاندان
۲۵ بڑودہ کا نواب خاندان
۲۶ میر صاحب کا خاندان
(احمد آباد و کھمبائت)
۲۷ حضرت قطب عالم بخاری کا خاندان
۲۸ حضرت قاضی محمود دریائی کا خاندان
۲۹ علامہ شاہ وجیہ الدین گجراتی کا خاندان
۳۰ باوا میاں قادری کا خاندان
۳۱ کھمبائت کا نواب خاندان
(سوراشٹر)
۳۲ جوناگڑھ کا نواب خاندان
۳۳ مانگرول کا نواب خاندان

حضرت سید جمال الدین المعروف بہ خواجہ دانا صاحب

خواجہ دانا صاحب خلف سید بادشاہ پردہ پوش کا سلسلۂ نسب امام علی نقی تک پہنچتا ہے۔ یہ خاندان اتنا مقتدر تھا کہ چغتائی بادشاہ سلطان حسین مرزا ابراہیم حسین مرزا، شیخ مرزا وغیرہ نے ازروئے عقیدت اپنی بیٹیاں اس خاندان میں بیاہی تھیں۔ خواجہ دانا صاحب کی والدہ بھی بادشاہ زادی تھیں خواجہ صاحب ۱۴۹۲ء/۸۹۸ھ میں بمقام جنوق (خوارزم سے چار فرسنگ کے فاصلہ پر) پیدا ہوئے۔ موصوف ابھی چار ماہ کے تھے کہ والد ماجد سید بادشاہ اسماعیل صفوی کے فتنہ میں شہید ہو گئے۔ سید بادشاہ نے اپنے ایک عزیز و شاگرد خواجہ ابوالحسن کو خواب میں خواجہ صاحب کی پرورش و پرداخت کے سلسلہ میں بشارت دی۔ خواجہ ابوالحسن نے اس پر عمل کرتے ہوئے شیر خوار بچہ کو دایہ سے لے لیا۔ اور خوارزم سے نکل کر ماوراالنہر کے ایک جنگل میں پانی کے ایک چشمہ کے قریب اقامت اختیار کی۔ بچہ کے دودھ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ابوالحسن نے سجدہ میں سر رکھ کر اللہ سے التجا کی تین روز کے بعد ایک مادہ آہو آئی جس کے دودھ پر عرصہ تک پرورش ہوتی رہی۔ دودھ کی عمر نکل جانے کے بعد صحرائی برگ و بار پر گذر ہونے لگا۔ جنگل میں بارہ سال کے بعد خواجہ ابوالحسن کا انتقال ہو گیا۔ ابوالحسن کی وفات کے بعد خواجہ موصوف اسی دشت میں گذر بسر کرتے رہے حضرت پردہ پوش نے خواجہ سید محمد کو بشارت دی کہ جمال الدین ہنوز محتاج تربیت ہیں۔ سید محمد تلاش کرتے ہوئے جنگل میں پہنچے اور چھ سال خواجہ جمال الدین کی تربیت کی۔ اس کے بعد خواجہ صاحب بابا جوباں مجذوب ترکستانی کی ملاقات سے مشرف ہوئے۔ بعدہٗ بلخ تشریف لائے۔ اور خواجہ محمد پارسا کے بنیرہ خواجہ عبدالہادی کے گھر پر قیام کیا جہاں حضرت پارسا کی حرم محترم شاہ بیگم نے آپ کو آداب خورد و نوش سکھلائے۔ پیر خاں بن جانی بیگ والی توران آپ کا معتقد تھا۔ اسی نے اپنی رضاعی بہن کو آپ کے عقد میں دیا۔ عرصۂ دراز تک بلخ میں قیام کرنے کے بعد آپ سندھ اور ٹھٹھ کے راستے آگرہ تشریف لے گئے۔ آگرہ میں شیر شاہ کے بیٹوں اور دوسرے امراء نے نذر عقیدت پیش کی۔ آگرہ سے بڑودہ تشریف لائے۔ جہاں حضرت نظر بدخشی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ بڑودہ میں تھوڑی مدت قیام کرنے کے بعد حکم الٰہی کے مطابق سورت تشریف لائے۔ سورت میں قلعدار قلیج خاں اور دیگر امراء نے استقبال کیا۔ موصوف نے بڑودہ تشریف لائے ہوئے بمقام برہانپور شہزادہ دانیال

کے بچہ کے لئے دعا کی تھی۔ جس کو اللہ نے دوبارہ حیات بخشی۔ اس وجہ سے شہنشاہ اکبر بھی آپ کا معتقد تھا۔ اور ایک لاکھ روپیہ نذرانہ پیش کیا تھا۔ آپ نے سورت میں خانقاہ تعمیر کرائی۔ یہ خانقاہ محلہ بڑے خاں کے چکلہ میں واقع ہے۔ آپ نے ایک سو چالیس سال کی عمر میں سنہ ۱۶۰۷ء/۱۰۱۶ھ پانچ صفر بروز جمعہ انتقال کیا۔ مزار اسی خانقاہ میں ہے۔

خواجہ صاحب کے فرزند اکبر سید محمد قاسم نے ۱۶۱۰ء/۱۰۱۹ھ میں انتقال کیا۔ لہٰذا آپ کے دوسرے فرزند خواجہ ابوالحسن آپ کے جانشین ہوئے۔ ۱۶۴۴ء/۱۰۵۴ھ میں ابوالحسن صاحب کے انتقال پر آپ کے فرزند سید محمد جانشین ہوئے اور ۱۶۶۷ء/۱۰۷۸ھ میں انتقال کیا۔ آپ کے بعد فرزند خواجہ نورالحسن سجادہ نشین ہوئے۔ آپ نے ۱۷۱۴ء/۱۰۷۸ھ میں وفات پائی۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند فیض الحسن سجادہ نشین ہوئے۔ ۱۷۲۸ء/۱۱۵۱ھ میں وفات پائی۔ آپ کے اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ اس لئے آپ کے بھائی نورالاعلیٰ جانشین ہوئے آپ کے بھی اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ اس لئے آپ نے اپنے داماد سید ابوالحسن بن قاضی شرف الدین عرف الی اللہ خاں خواجہ فیض الحسن کو ۱۷۴۶ء/۱۱۵۹ھ میں اپنی حیات میں جانشین بنا دیا۔ خواجہ نورالاعلیٰ نے ۱۷۵۰ء/۱۱۶۴ھ میں وفات پائی۔ اس طرح سجادہ نشینی خانقاہ قاضی خاندان میں منتقل ہوگئی۔ اسی خاندان سے نواب غلام بابا تعلق رکھتے تھے۔

عیدروس خاندان

سید ابوبکر سکران بن عبدالرحمٰن السقاف بن محمد بن علی بن فقیہ المقدم محمد رضوان امام جعفر صادق کی اولاد سے تھے۔ آپ کا وطن حضرموت تریم تھا۔ ملفوظات و مناقب عیدروسیہ میں مرقوم ہے کہ جب آپ کے گھر میں فرزند سید عبداللہ پیدا ہوئے تو موصوف نے فرمایا۔ "الیوم عیدروس" عیدروس کے معنی صوفی کبیر کے ہیں۔ اس وقت سے یہ خاندان عیدروس کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ سید عبداللہ عیدروس کا انتقال ۱۴۶۱ء/۸۶۵ھ میں ہوا۔ آپ کا مزار عدن میں ہے۔ آپ جب عدن تشریف لائے تو وہاں دودھ کی بارش ہوئی تھی۔ سید ابوبکر کے فرزند سید احمد ہندوستان تشریف لائے۔ آپ کا مزار احمد نگر میں ہے۔ سید شیخ نے تریم میں ۱۵۱۳ء/۹۱۹ھ میں وفات پائی۔ اور سید حسن نے بھی بمقام تریم ۱۵۱۱ء/۹۱۶ھ میں وفات پائی۔ سید شیخ کے بیٹے سید عبداللہ نے بھی بمقام تریم ۱۵۲۴ء/۹۳۲ھ میں انتقال کیا۔

سید عبداللہ کے بیٹے اور سید شیخ کے پوتے سید شیخ بمقام تریم ۱۵۱۳ء/۹۱۹ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ والد بزرگوار کے ہمراہ حج بیت کے لئے گئے تھے۔ آپنے پندرہ سال کی عمر میں کئی تصانیف تصنیف کرلی تھیں۔ آپ نے ۱۵۳۴ء/۹۴۱ھ میں مکہ معظمہ میں شہاب الدین احمد بن محمد سے حدیث میں سند حاصل کی تھی۔ موصوف اپنے والد کے انتقال کے بعد (۱۵۳۷ء/۹۴۴ھ) ہندوستان تشریف لائے۔ اور یہاں ۱۵۴۹ء/۹۵۶ھ میں ملک حبش گئے۔ اور وہاں سے واپسی پر بندر مبارک سورت میں رونق افروز ہوئے۔ اور سورت سے ۱۵۵۱ء/۹۵۸ھ میں احمد آباد تشریف لے گئے۔ احمد آباد میں گجرات کا سلطان محمود بن لطیف خاں آپ کا معتقد تھا۔ ۱۵۵۳ء/۹۶۰ھ میں آپ دوبارہ سورت اور بھروچ تشریف لے گئے۔ اور واپس احمد آباد لوٹ گئے۔ اس سال آپ کے فرزند سید عبداللہ تشریف لائے اور خرقۂ خلافت حاصل کر کے تریم لوٹ گئے۔ سید شیخ کے دوسرے فرزند سید احمد ۱۵۶۱ء/۹۶۸ھ میں تریم سے سورت تشریف لائے اور لوٹ گئے۔ اور دوبارہ ۱۵۶۳ء/۹۷۱ھ میں سورت تشریف لائے۔ اسی سال سید شیخ نے سورت میں مسجد اس جگہ تعمیر کرائی جہاں رسول پاک ؐ نے خواب میں نشاندہی فرمائی تھی۔

۱۵۸۱ء/۹۸۹ھ میں شمس الشموس سید محمد بن عبداللہ اپنے دادا صاحب کے ایما سے ہندوستان تشریف لائے۔ سید شیخ نے اپنے پوتے کی آمد پر عربی میں قصیدہ فرمایا تھا۔ حضرت شیخ نے ۷۱ سال کی عمر میں بمقام احمد آباد ۱۵۸۲ء/۹۹۰ھ میں انتقال فرمایا۔ سید شیخ متوفی ۱۵۸۲ء/۹۹۰ھ کے چار فرزند تھے جبین خلف سید عبداللہ نے ۱۶۱۵ء/۱۰۱۹ھ میں بمقام تریم انتقال کیا۔ دوسرے بیٹے سید مصطفےٰ نے بمقام سورت انتقال کیا۔ آپ صاحب کشف و کرامات تھے۔ بچپن ہی میں آپ دیوار پر بیٹھ کر دیوار کے ٹکڑے کو گھوڑے کی طرح چلاتے تھے۔ آپنے ایک مردہ بکرے کو بھی زندہ کیا تھا۔ آپنے خورد سالی ہی میں انتقال کیا۔ تیسرے سید احمد نے ۱۶۱۵ء/۱۰۲۴ھ میں انتقال کیا۔ آپ کا مزار بھروچ میں ہے۔ چوتھے بیٹے سید محی الدین عبدالقادر اپنے والد سید شیخ کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ موصوف نے ۱۶۲۷ء/۱۰۳۷ھ میں بمقام احمد آباد انتقال کیا۔ سید عبدالقادر سجادہ نشین کے انتقال کے بعد سید جعفر صادق بن زین العابدین بن عبداللہ بن سید شیخ سجادہ نشین ہوئے۔ آپ کے عہد میں ۱۶۳۱ء/۱۰۴۱ھ میں مرزا زاہد بیگ سوداگر نے عیدروس کی خانقاہ میں منارہ اور گنبد اور مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ سید جعفر صادق نے ۱۶۵۴ء/۱۰۴۶ھ میں وفات پائی۔ جعفر صادق کے بعد سید شریف شیخ بن سید عبدالقادر بن سید شیخ متوفی ۱۵۸۲ء/۹۹۰ھ سجادہ نشین ہوئے اور ۱۶۸۴ء/۱۰۹۶ھ میں رحلت فرمائی۔ مزار سورت میں ہے۔ سید شریف شیخ کے بعد ان کے پوتے سید عبدالقادر بن سید عبداللہ سجادہ

نشین ہوئے۔ اور ۱۶۹۶ء/ ۱۱۰۸ھ میں وفات پائی۔ اور ان کے فرزند سید احمد سجادہ نشین ہوئے۔ ۱۷۰۲ء/ ۱۱۱۴ھ میں ان کے انتقال پر ان کے فرزند سید عبدالقادر سجادہ نشین ہوئے۔ اس موقع پر سید زین العابدین علی بن محمد بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن شمس الشموس سید محمد حضرموت سے سورت تشریف لائے۔ سجادہ نشین سید عبدالقادر نے اپنی دختر کی سید زین العابدین علی سے شادی کردی۔ چونکہ سید زین العابدین سجادگی کے حقدار تھے۔ اس لئے حضرموت سے ان کی آمد پر حکومت نے انہیں سجادہ نشین قرار دیا۔ اور سید عبدالقادر کے لئے وظیفہ مقرر کردیا گیا۔ سید زین العابدین کے بعد ان کے فرزند سید عبداللہ سجادہ نشین ہوئے۔ سید عبداللہ نے ۱۷۸۴ء/ ۱۱۹۸ھ میں وفات پائی۔ ان کے دو بیٹے سید محمد اور سید زین تھے۔ سید عبداللہ کے بعد آپ کے بڑے بیٹے سید محمد سجادہ نشین ہوئے۔ سید محمد صاحب نے پچاس سال رشد و ہدایت کی خدمت انجام دیکر ۱۸۴۰ء/ ۱۲۵۶ھ میں وفات پائی۔ سید محمد صاحب کے چار بیٹے تھے۔ سید سقاف متوفی ۱۸۱۴ء/ سید احمد، سید جعفر اور سید شریف شیخ تھے۔ سید سقاف کے دو بیٹے سید مصطفےٰ متوفی ۱۸۵۳ء/ ۱۲۷۰ھ اور سید احمد عرف منجھلے میاں متوفی ۱۸۳۸ء/ ۱۲۵۴ھ تھے۔ سید سقاف کی بیٹی خیر النساء کی شادی حکیم سید قمر الدین قادری (راقم الحروف کے نانا) سے ہوئی تھی۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ سید احمد کے بیٹے سید عبدالرحمٰن عرف جیا صاحب متوفی ۱۸۸۶ء/ ۱۳۰۴ھ تھے۔ موصوف نے تاریخ گجرات اور تاریخ آئینہ مانوس فی احوال عیدروس دو تصنیفیں یادگار چھوڑی ہیں۔ سید جعفر متوفی ۱۸۲۶ء/ ۱۲۴۲ھ کے تین بیٹے سید عمر متوفی ۱۸۴۱ء/ ۱۲۵۷ھ، سید عبدالقادر متوفی ۱۸۸۱ء/ ۱۲۹۹ھ اور سید علوی تھے۔ سید عبدالقادر متوفی ۱۸۸۱ء/ ۱۲۹۹ھ کے بیٹے سید حسین تھے۔ اور سید حسین کے دو بیٹے سید فخر الدین ابوبکر اور سید عبدالرحمٰن تھے۔ سید فخر الدین ابوبکر اسسٹنٹ کلکٹر تھے۔ موصوف کو فارسی، اردو اور انگریزی زبان پر قدرت حاصل تھی۔ فارسی پروفیسر مرزا حیرت (پروفیسر الفنسٹن کالج بمبئی) سے پڑھی تھی۔ اردو میں دو ایک اصلاحی رسالے ناول کے طرز پر ان سے یادگار ہیں۔ سید علوی کے نعتیہ دیوان باغ ارم کی تاریخ طباعت موصوف نے انگریزی نظم میں کہہ کر جدت طبع دکھلائی ہے۔ ابوبکر صاحب کے دو صاحبزادے سید عبدالقادر اور سید بدیع الدین پاکستان میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ ابوبکر صاحب رشتہ سے راقم کے خالو ہوتے ہیں۔ سید محمد صاحب کے انتقال کے بعد ان کے فرزند سید شریف شیخ کو سجادۂ طریقت

پر بٹھلایا گیا۔ ۱۸۵۱ء/۱۲۶۸ھ میں سید شریف شیخ کی وفات پر ان کے بیٹے سید حسن سجادہ نشین ہوئے۔ سید حسن صاحب حکومت برطانیہ کے بڑے وفادار سرداروں میں سے تھے۔ انہیں اسٹار آف انڈیا کا خطاب بھی دیا گیا تھا۔ اور مجلس قانون ساز رکن بھی نامزد کئے گئے تھے۔ موصوف نے ۱۸۸۰ء/۱۲۹۸ھ میں انتقال کیا۔ سید حسن کے دو بیٹے سید زین اور سید عبداللہ تھے۔ والد کے بعد سید زین سجادہ نشین ہوئے۔ سید علی کے بیٹے کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ لہٰذا سید علی کے بعد ان کے بھائی سید جعفر سجادہ نشین ہوئے۔ اور سید جعفر کے بعد ان کے بیٹے سید محمد باقر سجادہ نشین ہوئے جو اس وقت بقید حیات ہیں۔

سید علی عیدروس کا خاندان (چھوٹا عیدروس)

سید علی بن عبداللہ بن احمد بن حسین بن عبداللہ بن شریف شیخ بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ بن ابوبکر سکران ۱۶۳۵ء/۱۰۴۵ھ میں بمقام تریم پیدا ہوئے اور تحصیل علم کے بعد ہندوستان تشریف لائے۔ آپ صاحب تصنیف تھے۔ ۱۷۱۸ء/۱۱۳۱ھ میں وفات پائی۔ مزار سورت میں ہے۔ اس خاندان کی خانقاہ کو چھوٹے عیدروس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سید علی کے بعد آپ کے پوتے سید محمد بن عبداللہ سجادہ نشین ہوئے۔ سید محمد نے بمقام مدینہ منورہ ۱۷۶۹ء/۱۱۸۳ھ میں وفات پائی۔ سید محمد کے بعد ان کے بیٹے سید علی سجادہ نشین ہوئے۔ سید علی نے ۱۷۷۹ء/۱۱۹۳ھ میں بمقام مدینہ منورہ انتقال کیا۔ سید علی کے بیٹے سید حسین متوفی ۱۷۹۹ء/۱۲۱۳ھ سجادہ نشین ہوئے۔ سید علی کے دوسرے بیٹے سید عمر سقاف ۱۸۰۷ء/۱۲۲۲ھ میں وفات پائی۔ سید حسین کے بعد ان کے بیٹے سید احمد عرف کلو میاں سجادہ نشین ہوئے اور ۶۶ سال کی عمر میں ۱۸۲۵ء/۱۲۴۱ھ میں وفات پائی۔ کلو میاں کے تین بیٹے سید حسین، سید عمر، اور سید محمود تھے۔ کلو میاں کے جانشین سید محمد ہوئے۔ سید محمد نے ۱۸۵۹ء/۱۲۷۶ھ میں وفات پائی۔ تو ان کے بیٹے سید علوی جانشین ہوئے۔ سید علوی شاعر تھے۔ علوی تخلص کرتے تھے۔ ۱۸۹۷ء/۱۳۱۵ھ میں سید علوی نے انتقال کیا۔ سید علوی کے بعد سید ابوبکر عرف مولانا میاں بن سید عبداللہ بن سید عمر بن سید علی بن سید محمد بن عبداللہ بن سید علی سجادہ نشین ہوئے۔ مولانا میاں بھی لاولد تھے۔

بتاریخ ۸ نومبر ۱۹۲۸ء میں وفات پائی۔

رفاعی خاندان (سورت)

جید صوفی ابوالحسن سید احمد کبیر الرفاعی کے خاندان کے ایک بزرگ سید عبدالرحیم محبوب اللہ رفاعی مدینہ منورہ سے سورت تشریف لائے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی اور مدت دراز تک خلق اللہ کی رہنمائی کرنے کے بعد ۱۷۱۹ء/۱۱۳۲ھ میں انتقال کیا۔ موصوف کا مزار سورت میں بمقام بریادی بازار واقع ہے۔ اس زمانہ سے سورت رفاعی سلسلہ کا اہم مرکز قرار پایا اور اسی کو رفاعی کی خانقاہ کلاں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ محبوب اللہ کی اولاد میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں ایک بیٹے سید احمد متوفی ۱۷۰۰ء/۱۱۱۲ھ تلنگانہ میں مدفون ہیں۔ دوسرے سید محمد مہدی متوفی ۱۷۰۱ء/۱۱۱۳ھ راجپور کونکن میں آسودۂ خاک ہیں تیسرے سید نورالدین متوفی ۱۷۰۸ء/۱۱۲۰ھ کی آخری آرامگاہ سورت ہے اور چوتھے سید یوسف نے اپنے والد کے بعد خدمت رشد و ہدایت انجام دیکر ۱۷۳۱ء/۱۱۴۴ھ میں انتقال کیا۔ موصوف خانقاہ رفاعیہ کلاں سورت میں اپنے والد کے پہلو میں آسودۂ خاک ہیں۔ سید یوسف کے تین بیٹے سید علی مستان برہان اللہ، سید قمرالدین متوفی ۱۷۹۸ء/۱۲۱۳ھ اور سید عمادالدین احمد اللہ متوفی ۱۷۸۲ء/۱۱۹۶ھ تھے مزار رفاعی چھوٹی گاہ عرف رفاعی باغ میں ہے۔ سید علی مستان جانشین تھے۔ موصوف نے ۱۷۶۰ء/۱۱۷۴ھ میں انتقال کیا آپ کا مزار آپ کے والدین کے پہلو میں ہے۔

سید علی مستان کے بعد آپ کے بیٹے سید عبدالرحیم عزت اللہ ثانی جانشین مقرر ہوئے۔ موصوف نے ۱۲۱۱ھ میں وفات پائی اور والد کے پہلو میں دفن کئے گئے ہیں۔ ان کے جانشین ان کے بیٹے سید محمد حسین شمس الدین سیف اللہ تھے۔ موصوف نے بماہ رمضان المبارک ۱۸۳۲ء/۱۲۴۸ھ میں انتقال کیا۔ مزار خانقاہ کلاں میں ہے۔ سلسلۂ فقر رفاعیہ انہیں سے جاری ہوا ہے۔ سید محمد حسین کی شادی نواب سید اچھن کے بھائی سید مٹھن کے بیٹے بخشی میر نجم الدین کی بیٹی فاطمہ سے ہوئی تھی۔ سید محمد حسین کے دو بیٹے سید علی مستان ثانی متوفی ۱۲۶۶ھ اور سید محی الدین عرف مصری میاں متوفی ۱۸۲۷ء/۱۲۴۳ھ تھے۔ مصری میاں صاحب کمال بزرگ تھے۔ جوانی میں انتقال کیا۔ خانقاہ کلاں سورت

میں آسودۂ خاک ہیں۔ سید علی متان ثانی کی ایک بیٹی شریفہ بیگم کی شادی بخشی میر کمال الدین بن بخشی میر قمر الدین سے ہوئی تھی لہذا جب سید علی متان ثانی کا انتقال حیدر آباد میں ہوا تو ان کے نواسے بخشی میر امین الدین بن میر کمال الدین کو سید علی متان ثانی کے جانشین مقرر کیے گئے۔ بخشی میر امین الدین اگرچہ بخشی میر کمال الدین کے جانشین بخشی ہونے والے تھے لیکن بہت پہلے سے مزاج فقر کی طرف مائل تھا اس لئے اپنے والد کے انتقال پر بخشی کی جانشینی کے لئے اپنے چچا میر عظیم الدین کا نام پیش کر دیا اور جاہ و حشم سے گریز کیا۔ حضرت امین الدین صاحب نے مدت دراز تک رشد و ہدایت کی خدمت انجام دی سورت کے اطراف و اکناف میں ان کے ہزاروں مرید تھے۔ ۱۸۹۶ء/۱۳۱۴ھ میں عید الاضحیٰ روز انتقال کیا۔ موصوف کو خانقاہ کلاں سورت میں سپرد خاک کیا گیا ہے امین الدین صاحب کے تین بیٹے اور ایک بیٹی سید فیاض الدین عرف بڈھن صاحب، سید شمس الدین عرف قطب صاحب سید علی نواز عرف چھوٹے صاحب اور شریفہ بیگم تھے۔ سید فیاض الدین صاحب کی شادی حکیم میر یاور حسین (میر عیسیٰ کا خاندان) کی بیٹی سے ہوئی تھی اور شریفہ بیگم کی شادی بخشی میر صدر الدین خلف بخشی میر عظیم الدین سے ہوئی تھی۔ سجادہ نشین سید فیاض الدین صاحب نے ۱۳۶۶ھ میں انتقال کیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے سید برہان الدین سجادہ نشین ہوئے۔ برہان الدین نے بھی ۱۴۰۳ھ میں انتقال کیا۔ ان کے بعد ان کے فرزند اکبر سلیم اللہ جانشین مقرر ہوئے۔ سید فیاض الدین کی اولاد میں سید برہان الدین سید زین العابدین عرف فقیر صاحب، سید معین الدین سید صلاح الدین، سید تقی الدین، سید رفیع الدین اور ایک بیٹی صغرا بیگم ہیں۔ زین العابدین طباعت کرتے ہیں اور اس وقت خانقاہ رفاعیہ کے نظم و نسق کی بھی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ سید تقی الدین کی بھی طبیعت فقر کی طرف مائل ہے اور اپنے سلسلہ کو نبھاتے ہوتے ہیں۔ اس خاندان کا سلسلۂ بیعت لندن، پاکستان، افریقہ جیسے دور دور ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔

مولانا غلام محمد

مولانا غلام محمد کا اصل وطن احمد آباد تھا۔ مولانا نظام الدین فرنگی محلی سے تحصیل علم کی اور عارف باللہ سید عبد الرزاق ہانسوی سے کسب باطن کیا تھا۔ فن قرأت میں یگانہ روزگار

تھے۔ محمد انور صوبیدار برہانپور موصوف کا معتقد تھا۔ آپ کو مذکورہ صوبیدار برہانپور لایا تھا اور وہاں آپ کے لئے مدرسہ و خانقاہ تعمیر کرکے دہلی سے سالانہ چھتیس ہزار روپیہ وظیفہ مقرر کرادیا تھا۔ مولانا نے اپنے فرزند ولی اللہ کو احمد آباد سے طلب کرکے سات سال تعلیم دینے کے بعد حج بیت اللہ کے لئے بھیجا جہاں حضرت ولی اللہ نے شیخ ابوالحسن مدنی محدث سے حدیث و قرأت میں سند حاصل کی۔ مولانا غلام محمد نے بمقام برہانپور ۱۷۳۹ء/۱۱۴۹ھ میں وفات پائی۔ وفات سے قبل آپ نے اپنے ایک شاگرد خاص میاں جی سوداگر سے فرمایا کہ میری وفات کے بعد تیسرے روز برہانپور سے اراکین خانہ کو لے کر سورت چلے جانا۔ مولانا کی وفات کے تین چار روز کے بعد مرہٹوں نے برہان پور کو تباہ و تاراج کیا۔ مولانا کے فرزند ولی اللہ اور تمام اہل عیال نے سورت پہنچ کر سیدی عنبر کی مسجد واقع سید پورہ میں قیام کیا۔ یہ مسجد اس وقت خوب صاحب کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت ولی اللہ نے اسی مسجد میں درس و تدریس کا سلسلہ قائم کیا تھا۔ ولی اللہ کے شاگردوں میں شاہ فاضل سورتی اور شاہ تجرد خصوصیت رکھتے ہیں۔

ولی اللہ صاحب نے ۱۷۹۲ء/۱۲۰۶ھ میں انتقال کیا اور اسی مسجد میں دفن کئے گئے۔ موصوف کے فرزند غلام محمد بھی عالم و عارف تھے۔ آپ نے والد کے بعد درس و ہدایت کے سلسلہ کو قائم رکھا۔ آپ نے ۱۸۲۴ء/ ۱۲۴۰ھ میں وفات پائی اپنے والد کے پہلو میں سپرد خاک کئے گئے ہیں۔ مولانا غلام محمد کے بعد آپ کے فرزند غلام احمد عرف خوب میاں نے درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ خوب صاحب نے ۱۸۵۹ء/۱۲۷۶ھ میں انتقال کیا۔ آپ کا مزار آپ کے والد کے پہلو میں واقع ہے۔ خوب صاحب کے فرزند عبدالغنی تھے۔ عبدالغنی کی قبر بھی اسی مسجد میں ہے۔ شاہ تجرد بھی اسی جگہ درس و تدریس میں مشغول رہے تھے۔ مزارات کی قطار میں سب سے پہلا مزار شاہ موصوف کا ہے

-سید عبدالوھاب بخاری سورتی کا خاندان (شائق)

سید غیاث الدین شائق سید عبدالوھاب بخاری کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ عبدالوھاب صاحب سید یحییٰ ترمذی کی اولاد سے تھے۔ عہد جواتی میں سلطان بہادر گجراتی کے دور میں صاحب جاہ و ثروت تھے۔ سلطان کی شہادت کے بعد دنیا ترک کردی اور شیخ تاج الدین خلیفہ خواجہ

باقی باللہ نقش بندی سے خرقۂ خلافت حاصل کر کے سورت میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ آپ کے ایما سے محلہ سوداگر واڑہ میں مسجد تعمیر کی گئی جو چوڑگر کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ عبدالوھاب صاحب کو اسی مسجد میں سپرد خاک کیا گیا ہے۔ عبدالوہاب صاحب کے بعد ان کے بیٹے سید محمد جانشین ہوئے۔ عرصہ تک رشد و ہدایت کی خدمت انجام دینے کے بعد ۱۶۶۰ء/۱۰۷۱ھ میں سید محمد نے انتقال کیا۔ انہیں ان کے والد کے پہلو میں دفن کیا گیا ہے۔ سید محمد کی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ ان کی بیٹی سید عبدالحق سے منسوب تھیں لہٰذا سید محمد کے بعد سید عبدالحق سجادہ نشین ہوئے۔ ان کا سنہ وفات ۱۶۸۶ء/۱۰۹۷ھ ہے۔ سید عبدالحق کی بھی اولاد نرینہ نہیں تھی اس لئے ان کے داماد سید شاہ صاحب خلف سید مرتضیٰ بن سید صدرالدین سید عبدالحق کے جانشین ہوئے۔ سید مرتضیٰ کے تین بیٹے سید شاہ صاحب سجادہ نشین، قاضی میر سیف الدین جو سورت میں منصب قضاۃ پر فائز تھے قاضی سید سیف الدین کے دو بیٹے تھے ایک میر کمال الدین جو علی نواز خان کی سورت میں ایک جنگ میں شہید ہو گئے اور دوسرے سید فخر الدین تھے۔ سید مرتضیٰ کے تیسرے بیٹے سید وجیہ الدین المخاطب خان جہاں خان جو محمد شاہ کے عہد میں اکبرآباد کے صوبیدار تھے ان کی پوتی سید شاہ صاحب بن سید معظم سے منسوب تھی۔ غرض سید معظم بن سید شاہ صاحب والد کے بعد جانشین ہوئے تھے۔ ۱۷۲۲ء/۱۱۳۵ھ میں وفات پائی۔ بعدہ سید معظم کے بھائی سید مکرم ولد سید شاہ صاحب جانشین ہوئے اور سید مکرم کے بعد سید معظم کے بیٹے سید عبدالحق چچا کے بعد جانشین ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۷۷۸ء/۱۱۹۲ھ میں ہوا۔ سید عبدالحق کے چار بیٹے تھے (۱) سید زین العابدین عرف بڑا صاحب (۲) سید عبدالوہاب عرف میر صاحب انھوں نے ۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ میں وفات پائی (۳) سید معظم عرف بابا صاحب متوفی ۱۷۹۹ء/۱۲۱۳ھ اور (۴) سید شرف الدین عرف سید صاحب متوفی ۱۸۳۲ء/۱۲۴۶ھ سید شرف الدین کے بیٹے سید غیاث الدین شاہ لق متوفی ۱۸۶۰ء/۱۲۷۶ھ والد کے بعد سجادہ نشین ہوئے تھے۔

قادری خاندان

اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں قادری خاندان کے ایک بزرگ رشد و ہدایت کے سلسلہ میں عرب سے ہندوستان آئے تھے اور بمقام جنجیرہ (جزیرہ۔ قریب بمبئی) مستقل اقامت اختیار کر کے دینی خدمات انجام دیتے رہے اور وہیں انتقال کیا۔ ان کے دو بیٹے

حافظ سید احمد اور سید صالح جنجیرہ سے سورت آئے اور یہاں اقامت اختیار کرلی۔ حافظ سید احمد نے سورت میں سنہ ۱۸۳۹ء/۱۲۵۲ھ انتقال کیا۔ شیخ حسن جی کے قبرستان میں شیخ حسن جی کے پائنتی دفن کیا گیا ہے۔ سید صالح کے ایک فرزند سید نظام الدین تھے سید نظام الدینؒ بزرگوں کی روایات کو قائم رکھا۔ موصوف اچھے خطیب و واعظ تھے۔ وہ واعظ کے نام سے بھی مشہور تھے۔ سید صالح نے ۱۸۷۴/۱۲۹۲ھ میں وفات پائی۔ مزار شیخ حسن جی میں ہے۔

نظام الدین کی شادی سید فخر الدین سورتی جمعدار کی دختر امیر بیگم سے ہوئی تھی۔ امیر بیگم کا انتقال ہو جانے پر فخر الدین کی دوسری بیٹی نولاسی بیگم نظام الدین سے بیاہی گئی۔ نظام الدین کی اولاد میں دو بیٹے حافظ سید قمر الدین اور سید حفیظ الدین اور ایک بیٹی قادری بیگم تھیں۔ قادری بیگم کی شادی بخشی خاندان بیلی بخشی میر افضل الدین بن ضیا الدین قمر الدین سے ہوئی تھی۔ ضیا الدین بخشی میر عظیم الدین کے حقیقی بھائی تھے۔ قادری بیگم کے بطن سے دو بیٹے میر رکن الدین اور میر معز الدین تھے۔ دونوں لاولد انتقال کر گئے۔ میر معین الدین بخشی شوکت قادری بیگم کے سوتیلے بیٹے تھے۔ نظام الدین کے بیٹے سید حفیظ الدین خطیب و واعظ تھے۔ ایک مدت تک بمبئی میں مدنپورہ کی بڑی مسجد میں امامت کی خدمت انجام دیتے رہے اور ضعیفی میں سورت آگئے تھے۔ حفیظ الدین نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سورت کے سید حسن واعظ کی بیٹی تھیں ان سے ایک دختر صالحہ بیگم تھیں جن کی شادی سید رفیع الدین بن سید عزیز الدین سورتی جمعدار ہوئی تھی۔ حفیظ الدین نے دوسری شادی کوکن کے ایک قاضی خاندان میں کی تھی۔ حفیظ الدین نے ۱۹۲۷ء میں وفات پائی۔ مزار چوک بازار میں میمنوں کے قبرستان میں ہے۔

نظام الدین کے فرزند اکبر سید قمر الدین (راقم الحروف کے نانا) نے سورت کے علما شیخ فاضل اور حضرت محمد کاظم سے اکتساب علم کیا تھا اور علم طب میں حکیم عبد الرزاق رامپوری ان کے استاد تھے۔ موصوف حافظ قرآن بھی تھے۔ مطب کے علاوہ جامع مسجد میں بطور خطیب بھی خدمت انجام دیتے تھے۔ میمن قمر الدین صاحب کے بہت معتقد تھے۔ ان کی وفات پر میمنوں نے بہ اصرار تمام اپنے قبرستان میں سپرد خاک کیا۔

قمر الدین صاحب کی پہلی بیوی ملا عبد الوھاب کی دختر قمر النسا تھیں اور دوسری بیوی سید سقاف العیدروس کی بیٹی خیر النسا تھیں۔ قمر النسا کے بطن سے دو بیٹے ڈاکٹر سید جلال الدین

سید احمد تھے اور فرحت النساء (راقم کی والدہ)، شاہجہاں بیگم اور خیر النساء بیٹیاں تھیں۔ ڈاکٹر جلال الدین کو منشی فضل الدین لطف اللہ نے متبنّیٰ لیا تھا لہٰذا انہیں کے سایۂ عاطفت میں جلال الدین کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ جلال الدین نے ایل۔ ایم۔ ایس کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ابتدائی سالوں میں ریاست گانگواڑ اور ریاست خیرپور میں بطور سول سرجن خدمت انجام دی اور خیرپور سے لوٹنے کے بعد احمد آباد میں اپنا ذاتی مطب کھول دیا تھا۔ قیام احمد آباد کے زمانہ میں وہ تحریک خلافت میں پیش پیش تھے اور دیگر سماجی اور تعلیمی خدمات بحسن و خوبی انجام دیں۔ ۱۹۳۰ء میں موصوف اپنے وطن سورت چلے آئے اور سورت میں مطب کھول دیا۔ یہاں بھی انجمن اسلام اور سورت ڈسٹرکٹ مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے ایک فعال کارپرداز کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں پچھتر (۷۵) سال کی عمر میں وفات پائی قبران کے آبائی ہڑواڑ حسن جی میں ہے۔

جلال الدین کی شادی نصیر الدین سورتی جمعدار کی دختر حبیب النساء سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے ایک بیٹا ڈاکٹر سید سعید الدین احمد آباد میں مطب کرتے ہیں۔ حبیب النساء کے انتقال پر ان کی دوسری شادی سورت کے ایک معزز شخص سید حیدر شاہ کی بیٹی امیر النساء سے ہوئی۔ ان کے بطن سے ایک بیٹا سید محی الدین قادری ہے پاکستان کراچی پورٹ ٹرسٹ کے چیف انجنیر کی حیثیت سے خدمت دیکر ریٹائر ہو گئے ہیں۔ قمر الدین کی دو بیٹیوں فرحت النساء اور شاہجہاں بیگم کی شادی نصیر الدین سورتی جمعدار کے بیٹوں سید حمید الدین (راقم کے والد) اور سید کمال الدین سے ہوئی تھی اور تیسری بیٹی خیر النساء ایک مشائخ خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔ سب بھائی بہن اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اولادیں بقید حیات ہیں۔

مدنی خاندان

اس خاندان کے ایک بزرگ مولانا عیسیٰ مدنی احمد آباد گجرات تشریف لائے۔ ان کا نسب نامہ یہ ہے: عیسیٰ مدنی بن شیخ حسین محمد بن شیخ عبد الرحیم بن مولانا حماد الدین بن شیخ محمد بن مولانا شیخ احمد شرف جہاں بن شیخ موسیٰ بن شیخ حسن محمد بن شیخ عبد الغفار بن شیخ عثمان بن شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ، مولانا عیسیٰ مدنی علامہ شاہ وجیہ الدین قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے۔ مولانا نے ۱۶۷۹ء / ۱۰۹۰ھ میں بتاریخ ۱۵ رمضان انتقال کیا۔ مزار احمد آباد میں علامہ شاہ وجیہ الدین

کی خانقاہ میں ہے۔ مولانا عیسیٰ کے دو بیٹے شیخ احمد اور شیخ ابوالحسن تھے فرزند اکبر شیخ احمد مدنی عالم و صوفی تھے۔ موصوف نے رشد و ہدایت کے سلسلے میں سورت میں مستقل اقامت اختیار کرلی تھی۔
سنہ وفات ۱۶۸۵ء/۱۰۹۶ھ ہے آپ کا مزار بمقام برہانپوری بھاگل (دروازہ) سورت مرجع خلائق ہے۔

شیخ احمد مدنی کی ایک سے زائد بیویاں تھیں۔ ان کی اولاد میں شیخ یحیٰ، محمد معصوم عبدالحق، محمد ہاشم بیٹے اور امت الولی، راجی مبارک، خدیجہ بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹی کی شادی شاہ وجیہ الدین کے خاندان میں ہوئی تھی اور ایک کی شادی ابوالحسن مدنی کے بیٹے سے ہوئی تھی اور ایک کی شادی سید علی جمعدار کے ہاں بیاہی تھیں۔ شیخ یحیٰ لاولد تھے ان کا انتقال سورت میں ہوا اپنے والد کے پہلو میں مدفون ہیں۔ عبدالحق اور محمد معصوم اپنے چچا زاد بھائی خلیل الرحمٰن کے پاس بیجاپور چلے گئے تھے اور وہیں شادیاں کیں۔ عبدالحق کی بیٹی کی شادی بیجاپور کے ایک مشائخ سید محمد قادری سے ہوئی تھی جن سے کئی اولادیں تھیں۔ محمد معصوم کی اولاد بھی بیجاپور میں پھلی پھولی۔

مولانا عیسیٰ کے دوسرے فرزند قاضی ابوالحسن مدنی عالم و فاضل تھے۔ موصوف عالمگیر کے لشکر میں عہدۂ قضاۃ پر فائز تھے۔ ابوالحسن نے ۱۶۸۶ء/۱۰۹۷ھ میں وفات پائی مزار محلہ خان پور میں خانقاہ علامہ شاہ وجیہ الدین میں ہے۔ قاضی ابوالحسن کے دو فرزند تھے۔ ایک خلیل الرحمٰن اور دوسرے شیخن احمد شطاری خلیل الرحمٰن عالم و فاضل تھے۔ والد کے انتقال کے بعد عالمگیر نے انہیں بیجاپور میں صدر الصدور کے اعلیٰ عہدہ پر فائز کیا تھا اور بطور وظیفہ چند گاؤں عنایت کئے تھے۔ خلیل الرحمٰن نے تمام عمر فرائض منصبی کے علاوہ درس و تدریس میں میں گذاری۔ خلیل الرحمٰن کی شادی اپنی چچا زاد بہن راجی مبارک سے ہوئی تھی موصوف نے بتاریخ ۱۲ ربیع الاول ۱۷۳۰ء/۱۱۴۳ھ وفات پائی۔ مزار بیجاپور میں اندرون حصار ہے خلیل الرحمٰن کے فرزند محمد اکرم بھی مشاہیر علمائے دکن سے تھے۔ صدہا طلبانے آپ سے فیض حاصل کیا تھا۔
محمد اکرم نے ۱۷۸۶ء/۱۲۰۰ھ میں وفات پائی۔ مزار بیجاپور میں ہے۔ محمد اکرم کے فرزند محمد ابوالقاسم صدر بیجاپور تھے۔ ۱۸۱۵ء/۱۲۳۰ھ میں انتقال کیا۔ محمد ابوالقاسم کے فرزند محمد اکرم ثانی عرف بادشاہ صاحب بھی بیجاپور کے ممتاز علما و صوفیا میں شمار کئے جاتے تھے۔ موصوف بھی بیجاپور میں آسودۂ خاک ہیں۔ شیخن احمد شطاری بن قاضی ابوالحسن نے بھی دکن میں رشد و ہدایت کی خدمت انجام دی۔ موصوف دکن کے علما و صوفیا میں ممتاز درجہ رکھتے تھے ۱۲۳۸، ۱۸۱۵ء/۱۱ھ میں

انتقال کیا۔ مزار اورنگ آباد میں ہے۔ آپ کے فرزند مولانا شاہ غلام حسین نے ایک مدت تک آبائی سجادہ مشیخت کو رونق بخشنے کے بعد۔۔ ۱۸/۸/۱۲۱۴ھ میں انتقال کیا مزار حیدر آباد میں ہے۔

مولانا عیسیٰ مدنی کی اولاد میں چار بیٹیاں امت الستار اور امت العزیز راجی زینت، امت الروف تھیں۔ ان میں سے ایک حضرت صبغۃ اللہ بھروچی کے خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔ شیخ عیسیٰ مدنی کو حکومت کی جانب سے ہر سال تین نفر کا سفر حرمین ملا کرتا تھا۔ انہیں کھیج قطب پورہ، تیلوا، ڈوگرا ضلع بھروچ میں ایک ہزار بیگہ سے زائد زمین بطور وظیفہ عطا ہوئی تھی۔

سورت کا نواب خاندان۔

۲۳، ۶/۱/۱۱۳۶ھ میں سورت کا متصدی رستم علی خان تھا۔ اس کے بھائی شجاعت خان اور ابراہیم قلی مرہٹوں کے خلاف احمد آباد کے قریب جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔ رستم علی اپنے بھائیوں کا انتقام لینے کے لئے مرہٹوں اور حامد خاں کے خلاف لڑنے کے لئے سورت سے احمد آباد گیا لہٰذا اس کا بیٹا سہراب خان سورت کا متصدی مقرر کیا گیا مگر اس وقت کے قلعدار بیلگر خاں (مرزا گدا بیگ) اور ملا محمد علی نے ساز باز کر کے سہراب خاں کو بے دخل کر دیا اور بیلگر خاں کا چھوٹا بھائی تیغ بیگ خاں عرف مرزا گل ۳۱، ۶/۱/۱۱۴۴ھ میں متصدی بن گیا تیغ بیگ خان کو انگریزوں کی حمایت حاصل تھی ادھر مرکزی حکومت میں انتشار کی وجہ سے تیغ بیگ خاں نے نواب کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ ۴۶، ۶/۱/۱۱۵۹ھ میں تیغ بیگ خاں کا انتقال ہو گیا اس کے بعد اس کا بھائی بیلگر خاں نواب بنا لیکن ایک آدھ سال میں اس کا بھی انتقال ہو گیا تو اس کا چھوٹا بھائی صفدر خان جانشین ہوا۔ صفدر خاں کو سکون نصیب نہیں ہوا۔ بھروچ آصف جاہ کی جاگیر تھی سورت پر بھی مدت سے ان کی نظر تھی۔ آصف جاہ نے تیغ بیگ خاں کے داماد میر معین الدین عرف سید اچھن اور ان کے بھائی میر ضیاء الدین عرف سید شھن کو اعتماد میں لیا۔ سید اچھن نے صفدر خاں کے داماد علی نواز خاں سے ساز باز کی ادھر بیلگر خاں کے داماد وقار خاں قلعہ دار کو قید کر کے قلعہ کا قبضہ لے لیا۔ سید اچھن اور صفدر خاں کے درمیان جنگ ہوئی اور آخر کار سید اچھن نواب قرار پایا مگر ۵۸، ۶/۱/۲/۱۱۷۲ھ تک سورت کی نوابی کبھی ایک کے ہاتھ تو کبھی دوسرے کے ہاتھ رہی۔ سید اچھن کو انگریزوں کی پشت پناہی حاصل تھی لہٰذا دوبارہ سید اچھن نواب مقرر ہوا۔ اس وقت سند نوابی دہلی سے نہیں آئی تھی بلکہ دکن سے حاصل کی گئی تھی۔ اور انگریز نواب گری کا کردار ادا

کر رہے تھے۔ ۱۷۵۹ء/۱۱۷۲ھ میں انگریز قلعہ دار بھی بن گئے۔

۱۷۹۴ء/۱۲۰۹ھ میں نواب معین الدین عرف سید اچھن نے انتقال کیا۔ سید اچھن کے بعد انگریزوں نے ان کے بیٹے سید حفیظ الدین احمد خان کو جانشین بنایا۔ ۱۷۹۰ء/۱۲۰۴ھ میں سید حفیظ الدین کی وفات پر ان کے بیٹے سید نظام الدین مسند پر بٹھلائے گئے۔ سید نظام الدین نے ۱۷۹۹ء/۱۲۱۳ھ میں انتقال کیا۔ ان کے اولاد نرینہ نہیں تھی۔ لہٰذا ان کے بھائی سید نصیر الدین کو انگریزوں نے نواب تسلیم کیا مگر کمپنی نے شہر کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا اور صرف عدالت کا محکمہ نواب کے اختیار میں رہنے دیا۔ اس کے عوض کمپنی نے نواب کو ایک لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ اور شہر کے محصول کا پانچواں حصہ دیا۔ ۱۸۲۲ء/۱۲۳۷ھ میں سید نصیر الدین کی وفات پر ان کے بیٹے سید افضل الدین خان کو جانشین مقرر کیا گیا مگر محکمۂ عدالت بھی کمپنی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نواب وظیفہ خوار بنا دیا گیا۔

افضل الدین خاں کی اولاد میں صرف دو بیٹیاں تھیں۔ ۱۸۳۱ء/۱۲۴۷ھ میں دہلی سے مرزا کام بخش اپنے بیٹوں مرزا ہمایوں اور مرزا نجف کے ہمراہ سورت آئے تھے۔ یہ لوگ نواب کے مہمان تھے۔ افضل الدین خاں کی بیٹیوں کی نسبت ان شہزادوں سے قرار پائی۔ دونوں شہزادے بہت خراچ تھے۔ نواب کی دولت بے دریغ اڑانے لگے تو نواب نے تنگ آ کر نسبت توڑ دی اور شہزادے دہلی لوٹ گئے۔ بعدہٗ دونوں بیٹیوں کی شادی میر سرفراز علی سہسوانی (بڑودہ) کے بیٹوں میر اکبر علی اور میر جعفر علی سے ہوئی۔ ۱۸۴۲ء/۱۲۵۸ھ میں افضل الدین نے وفات پائی۔ ان کے بعد ان کے داماد میر جعفر علی کو جانشین قرار دیا گیا مگر وظیفہ کی رقم نصف کر دی گئی۔ ۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ھ میں میر جعفر علی نے ولایت جا کر ارباب حل و عقد کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا۔ ۱۸۴۵ء میں ان کی اہلیہ بختیار النسا بنت نواب افضل الدین کے انتقال پر مرحومہ کی وظیفہ کی رقم انہیں دی جانے لگی اور ۱۸۴۹ء/۱۲۶۶ھ میں ولایت میں وظیفہ کے متعلق پیش کردہ مقدمہ کا فیصلہ بھی ان کے حق میں ہوا۔ اس طرح انہیں سالانہ ایک لاکھ روپیہ وظیفہ ملتا تھا۔

میر جعفر علی خاں سورت میں ایک وضعدار امیر گذرے ہیں۔ شہر میں موصوف کو مقبولیت کا تمغہ حاصل تھا۔ ۱۸۶۱ء میں سورت میں جعفر علی مِل کے نام سے کپڑے کا ایک کارخانہ کھولا گیا تھا۔ مذکورہ کارخانہ ان کا ذاتی تھا یا اس میں ان کا حصہ (شیئرز) زیادہ تھا یہ کہنا مشکل ہے۔ ۱۸۶۳ء/۱۲۸۰ھ میں جعفر علی خاں نے وفات پائی۔ موصوف نے تین شادیاں کی تھیں۔ ایک بیگم

سے صرف ایک بیٹا ذوالفقار علی تھا۔ اسے تعلیم کے لئے ولایت بھیجا گیا تھا۔ میر ذوالفقار علی کی حویلی اس وقت پارسی پنچائت کی تحویل میں ہے جہاں پارسی یتیم خانہ ہے۔ اس کے بعض حصے اب تک موجود ہیں موصوف کے بیٹے تھے۔ ان میں سے میر غلام قادر (دربار کدھیا) نے بھروچ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ ان کا انتقال ہوچکا ہے۔ ان کے تین فرزند ہیں جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرچکے ہیں ان میں سے ایک نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا ہے میر جعفر علی کی دوسری بیگم سے دو بیٹیاں (بڑی بیگم) ضیاء النسا اور (چھوٹی بیگم) رحیم النسا تھیں۔ ۱۸۷۶/۱۲۹۲ھ میں ضیاء النسا (بڑی بیگم) کی شادی بیلہ کے نواب صاحب میر سعید عالم خاں سے ہوئی اور رحیم النسا (چھوٹی بیگم) قاضی خاندان کے میر غلام بابا (محب غالب) سے بیاہی گئی تھیں۔

نواب بیلہ کا خاندان

دکن میں پونا کے قریب بیلہ پور گاؤں ہے اس کے جاگیردار میر سعید عالم خاں کی شادی ۱۸۷۶ء میں نواب جعفر علی خاں کی بڑی بیٹی ضیاء النسا سے ہوئی تھی لہٰذا میر سعید عالم خاں نے سورت میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ سعید عالم صاحب نے ۱۸۸۷ء میں وفات پائی۔ ان کی اولاد میں دو بیٹے رسول عالم خاں اور محمود عالم خاں تھے۔ محمود عالم خاں بڑی صلاحیتوں[1] کے مالک تھے۔ انہیں گھوڑوں کا بہت شوق تھا۔ محمود عالم خاں نے عین جوانی میں بہ سنہ ۱۸۹۸ء میں وفات پائی۔ رسول عالم خاں کے دو بیٹے میر مسعود عالم خان اور میر سعید عالم خاں تھے۔ میر مسعود عالم خاں نے ۱۹۴۳ء میں وفات پائی۔ مسعود عالم خاں صاحب نے ہر ممکن طریقہ پر سورت کے مسلمانوں کی اصلاحی تحریکوں میں ہاتھ بٹایا ہے۔ موصوف برسوں سورت کے اسلام یتیم خانہ کے صدر رہ چکے تھے۔ اس وقت مسعود عالم خاں صاحب کے فرزند میر سلطان عالم خاں بقید حیات ہیں اور مسلمانوں کی اصلاحی و مذہبی تحریکوں میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ سلطان عالم خاں صاحب کو صوفیائے کرام سے والہانہ لگاؤ ہے۔ ان کا بیشتر وقت ذکر اذکار میں گذرتا ہے۔

میر جعفر علی خاں کی بڑی بیٹی ضیاء النسا سے میر سعید عالم خاں کی اور چھوٹی بیٹی رحیم النسا

---

[1] شہسواری، جواہر کی پرکھ، علوم وغیرہ

سے میر غلام بابا کی شادی ہوئی تھی اسی مناسبت سے دونوں امیروں کی حویلیاں بڑی باڑی اور چھوٹی باڑی کے نام سے مشہور ہیں۔ چھوٹی باڑی کے نشاں تک مٹ گئے۔ بڑی باڑی اب تک موجود ہے۔

میر غلام بابا کا خاندان

حافظ قاضی سید ابوالحسن ابن خواجہ سید شرف الدین المخاطب سید ولی اللہ ثانی بن سید فتح اللہ ترمذی سادات تھے۔ ان کے بزرگ سید یحییٰ ترمذی فیروز شاہ تغلق کے ہمعصر تھے۔ فیروز شاہ موصوف کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے اپنی ایک بیٹی بھی موصوف کے نکاح میں دی تھی۔ سید یحییٰ چودہ سال کی عمر میں مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے بیعت ہوئے تھے۔ جہاں گشت نے تعلیم و تربیت کے لئے سید یحییٰ کو اپنے ایک خلیفہ اخی جمشید کے سپرد کیا۔ اخی جمشید سے حصول علوم ظاہری اور کسب فیوض باطنی سے فارغ ہو کر حج بیت اللہ کے ارادہ سے موصوف نہر والا پٹن گجرات تشریف لائے۔ پٹن میں شیخ عبداللطیف پٹنی کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور قصد سفر کیا تھا کہ رسول اکرم ﷺ نے بشارت دی اور منع فرمایا۔ آپ نے سفر حج کا ارادہ ترک کر دیا اور بڑودہ تشریف لائے جہاں ۲۰ رمضان المبارک کو ۱۴۴۶ء/۸۵۰ھ میں آپ کا وصال ہو گیا۔ مزار ماتر یا تالاب کے قریب واقع ہے۔

خواجہ جمال الدین رحمتہ اللہ علیہ کے خاندان کے آخری شخص سید نور الاعلیٰ سجادہ نشین تھے۔ ان کے اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کے داماد نیز بڑے بھائی فیض الحسن کے دختر زادہ حافظ سید ابوالحسن صاحب سجادۂ خانقاہ اور منصب قضاۃ پر فائز ہوئے۔ سید ابوالحسن صاحب کے پانچ بیٹے میر محمد حسین، سید درویش، میر زین العابدین میر احمد اور میر محمد تھے۔ والد کے بعد میر محمد حسین سجادہ نشین مقرر کئے گئے۔ موصوف نے ۱۸۱۹ء/۱۲۳۵ھ میں وفات پائی میر محمد حسین کے چار بیٹے میر محمد مظفر حسین متوفی ۱۸۲۱ء/۱۲۳۷ھ، سید اخی، غلام نقشبند عرف حاجی میاں متوفی ۱۸۵۱ء/۱۲۶۸ھ اور غلام بہاء الدین تھے۔ میر محمد مظفر حسین والد کے جانشین ہوئے اور ان کے انتقال پر ان کے بھائی سید اخی (اوّل) مسند سجادگی و قضاۃ پر فائز ہوئے۔ سید اخی صاحب کے چار فرزند تھے ان میں سے جمال الدین عرف غلام خواجہ اپنے والد کے بعد جانشین ہوئے۔ ۱۸۷۷ء/۱۲۹۴ھ میں غلام خواجہ نے وفات پائی۔ غلام خواجہ صاحب کے

دو فرزند سید اخی (دوم) اور میر معصوم علی تھے۔ سید اخی (اول) کے دوسرے فرزند میر غلام بابا خساں محب غالب تھے۔ ان کی شادی نواب میر جعفر علی خاں کی بیٹی رحیم النسا سے ہوئی تھی۔ تیسرے بیٹے سید مصطفےٰ عرف گورو میاں اور چوتھے سید فیض الحسن عرف چھوٹو میاں۔ متوفی ۱۸۹۱ء/۱۳۰۹ھ تھے۔ چھوٹو میاں کے دو فرزند سید شرف الدین اور سید ابوالحسن تھے۔ سید جمال الدین کے بعد ان کے بیٹے سید اخی (دوم) جانشین ہوئے۔ سید اخی دوم کی شادی ملا خاندان میں نجیب النسا[1] بنت ملا عبدالحیٔ سے ہوئی تھی۔ سن میں سید اخی دوم کے انتقال پر ان کے اکلوتے فرزند سید محمد والد کے جانشین ہوئے۔ والد کے انتقال کے وقت یہ صغیر تھے لہٰذا ان کی والدہ خانقاہ اور امور قضاۃ کی نگرانی کرتی تھیں۔ سید علی بن سید حسن العیدروس کی دختر شریفہ بیگم ان سے منسوب تھیں۔ سید علی صاحب نے قاضی موصوف کی تعلیم و تربیت کی تھی اور جب یہ عمر کو پہنچے تو مرض دق میں مبتلا ہو گئے اور ۱۹۲۷ء میں انتقال ہو گیا۔ چوں کہ ان کے اولاد نہیں تھی اس لئے ان کے چچازاد بھائی سید جمال الدین میر معصوم علی سجادہ نشین اور قاضی شہر مقرر کئے گئے۔ قاضی مرحوم کے جنازہ میں شہر کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں شریک تھے۔ فاتحہ زیارت کے روز صبح نو بجے سید جمال الدین کو نواب سچین سیدی حیدر نے مسند پر بٹھلایا۔ راقم اس فاتحہ میں شریک تھا (بعمر ۱۵ سال)۔ راقم الحروف کے والد سید حمید الدین سورتی جمعدار قاضی جمال الدین کے ساتھ بیوہ نجیب النسا کی طرف سے وظیفہ، آمد و خرچ اور دیگر امور کی نگرانی کرتے تھے۔ قاضی جمال الدین صاحب نے انتقال کیا۔ فی الحال ان کے فرزند سید مظفر حسین سجادہ نشین خانقاہ اور قاضی شہر ہیں۔

اس خاندان کے چشم و چراغ میر غلام بابا ۱۸۳۴ء/۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ غلام بابا اور ان کے بھائیوں نے اپنے بڑے بھائی سید جمال الدین متوفی ۱۸۷۷ء/۱۲۹۴ھ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ موصوف نے چند سال سورت کے نامور عالم مولوی کاظم صاحب سے تحصیل علم کیا۔ ۱۸۵۵ء/۱۲۷۲ھ میں غلام بابا کی نسبت نواب میر جعفر علی خاں کی بیٹی رحیم النسا سے ہوئی اور ۱۸۵۹ء ۱۲۷۶ھ میں بڑے تزک و احتشام سے شادی ہوئی۔

---

[1] راقم کی والدہ کی رشتے سے خالہ تھیں

شادی کے بعد سے غلام بابا صاحب نے اپنی سسرال میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

غلام بابا نہایت حلیم الطبع، متواضع، ہر دلعزیز اور کشادہ دل رئیس تھے۔ ہر ادنیٰ اعلیٰ سے بلا تخصیص بہت عجز و انکسار سے پیش آتے تھے۔ راقم کے دادا سید نصیر الدین کے تعلقات غلام بابا صاحب سے خصوصی تھے۔ مہینے میں دو بار راقم کی آبائی حویلی بمقام برہانپوری گلی دادا صاحب کے ساتھ ماحضر تناول فرماتے۔ اس دور کے ایک ان پڑھ شاعر نبو میاں ذکا کو اکثر تنگ دستی سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے ایسے ہی ایک موقع پر عطیہ حاصل کرنے کے خیال سے غلام بابا کی ہجو میں چند شعر لکھ دیئے اور محل تک پہنچا دیئے۔ ذکا ان کے مزاج و شرافت سے خوب واقف تھا۔ غلام بابا نے ہجویہ اشعار سن کر دربار کے موقع پر ذکا کو طلب کیا اور شاعری کی قدردانی کے طور پر دو شالہ عطا کیا۔

موصوف کی بیگم رحیم النسا بھی بہت بڑے دل والی بیگم تھیں۔ ایک دفعہ ایک زردوز تنگ دستی کی وجہ سے کارچوب کا ایک چھوٹا سا پھول لے کر محل پر پہنچا اور کسی کنیز سے کہا کہ یہ پھول بیگم صاحبہ کی خدمت میں پیش کر اور میرا آداب عرض کر دے۔ بیگم صاحب نے پھول دیکھا پانچ روپئے دیئے اور کنیز سے کہا کہ ان سے کہنا کہ پھول بہت پسند آیا اور یہ پانچ روپے بیگم صاحب نے دیئے ہیں۔ کنیز نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ بیگم صاحب پھول تو چار آنے کا ہے آپ پانچ روپے دے رہی ہیں۔ بیگم صاحب نے جواب دیا پگلی! وہ پانچ روپے کی آس باندھ کر آیا ہے۔ چار آنے میں تو کہیں بھی بک جاتا وہ یہاں نہ آتا۔

غلام بابا نے علم حاصل کیا تھا۔ وہ اپنے علمی ادبی ذوق کی وجہ سے علم و ادب کے بڑے قدردان تھے نزدیک و دور سے ادیب شاعر، عالم وغیرہ ان سے تقرب حاصل کرنے کی غرض سے ان کی اور میاں داد خان سیاح کی خدمت میں قصیدے گذارتے تھے۔ موصوف نے امام غزالی کی احیاء العلوم کا اردو میں[1] ترجمہ کرایا تھا۔ میاں داد خان سیاح موصوف کے خاص مصاحبین میں سے تھے۔ سیاح کے توسط سے غلام بابا خاں کے مرزا غالب سے دوستانہ مراسم کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ غلام بابا خاں کے نام غالب کا پہلا خط نہایت دلچسپ ہے۔ غالب نے یہ خط موصوف کے خسر نواب میر جعفر علی خاں کے انتقال پر ۱۸۶۳ء/۱۲۸۰ھ

---

[1] نوٹ ترجمہ ناپید ہے۔

میں ازروئے ماتم پرسی لکھا تھا۔ اس میں قطعۂ تاریخ وفات بھی شامل ہے۔ غالب نے غلام بابا خاں کے بڑے بیٹے میر مظفر حسین کی ولادت، ۱۸۶۶ء/۱۲۸۳ھ میں ان کے چھوٹے بیٹے میر جعفر علی کی ولادت اور غلام بابا کی بیٹی بسم اللہ بیگم کی ولادت پر تاریخی قطعات لکھے ہیں۔ غلام بابا سے غالب کے دوستانہ مراسم خط و کتابت تک محدود رہے۔ اس نامور رئیس نے ساٹھ سال کی عمر میں ۱۸۹۲ء/۱۳۱۰ھ میں بتاریخ ۱۲ شوال انتقال کیا۔

میر غلام بابا کے بیٹے میر مظفر حسین اپنے والد کی تمام فطری خصوصیات کے حامل تھے۔ موصوف نے ۱۹۳۳ء میں بتاریخ ۲ رنومبر انتقال کیا میر مظفر حسین کی اولاد میں ایک بیٹا میر حفیظ الدین اور ایک بیٹی ہمایوں النساء تھیں۔ ہمایوں النسا کی شادی حیدر آباد کے امیر (دوالحسن ہوٹل والے) سے ہوئی تھی اور ہمایوالنسا کی بیٹی کی شادی گجرات میں کیرواڑہ کے ٹھاکور صاحب مان سینھ جی ممبر پارلیمان سے ہوئی ہے۔ یہ حفیظ الدین کو بھی شرافت طبع اور خوش خلقی وراثتاً ملی تھیں۔ موصوف مسلم لیگ کے بڑے وفادار کارکن تھے انہیں اپنی قوم کی فلاح و بہبود کا بے حد خیال تھا موصوف مرض دق میں مبتلا ہوگئے تھے تقریباً ایک سال صاحب فراش رہے۔ وفات سے قبل وصیت کی کہ میرے جنازہ پر شامیانہ یا کسی قسم کی امیرانہ علامت نہ ہو بلکہ ایک عام مسلمان کے جنازہ کی طرح جنازہ لے جایا جائے۔ موصوف نے ۱۹۴۲ء میں بتاریخ ۲۴ رجون انتقال کیا۔ جنازہ حسب وصیت لے جایا گیا۔ شہر کے ہزاروں لوگ جنازہ میں شریک تھے۔

موصوف کی اولاد میں دو بیٹے میر محمد غلام غوث اور میر وزیر صاحب اور تین بیٹیاں ہیں۔ غلام غوث عرف میر صاحب نے بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے۔ وزیر صاحب کی شادی حیدر آباد میں ہوئی ہے اور انھوں نے حیدر آباد میں مستقل اقامت اختیار کرلی ہے۔

بخشی خاندان

سید علی ہمدانی رح متوفی ۱۳۸۴ء/۷۸۶ھ نے امیر تیمور سے کسی بات پر ناراضگی کی وجہ سے ترک وطن کر کے کشمیر میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ آپ ۱۳۷۹ء/۷۸۱ھ میں کشمیر آئے

لہ وفات ہوچکی ہے

تھے اور تقریباً پانچ سال اشاعت اسلام کی خدمت انجام دے کر کشمیر میں آپ نے وفات پائی۔ اس خاندان کے ایک بزرگ برہانپور آئے تھے۔ ان بزرگ کی اولاد میں دو بھائی میر معین الدین عرف سید اچھن اور میر ضیاء الدین عرف سید مٹھن تھے۔ سید اچھن کی شادی نواب تیغ بیگ خان متوفی ۱۷۴۶ء/۱۱۵۹ھ کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ شادی کے بعد سید اچھن کو سورت میں مستقبل روشن نظر آیا کیونکہ نواب تیغ بیگ خان کے اولاد نرینہ نہیں تھی۔ تیغ بیگ خان کے بعد سورت کی سیاست میں سید اچھن نے حصہ لیا اور سیاسی توڑ جوڑ میں سید اچھن اور سید مٹھن نے آصف جاہ کی پشت پناہی کی اس طرح سید اچھن سورت کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھا کر نواب بن گئے۔ اس کے بعد سے سورت میں یہ روایت قائم ہوگئی کہ ایک بھائی نواب ہوئے اور دوسرے قلعدار و بخشی کا منصب پر فائز ہوئے۔ ۱۷۵۹ء میں قلعہ انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا اور منصب بخشی گری باقی رہا جو سید مٹھن کے بیٹے میر نجم الدین کو عنایت ہوا۔

میر نجم الدین کی شادی صفدر خاں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ صفدر خان تیغ بیگ خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ بخشی میر نجم الدین نے اسّی سال کی پختہ عمر میں بہ سنہ ۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ وفات پائی۔ میر نجم الدین کے ایک بیٹے تاج الدین کی شادی حیدر آباد میں، سکندر جاہ فولاد جنگ کی بیٹی سے ہوئی تھی لہٰذا یہ وہاں چلے گئے تھے نجم الدین کے بڑے بیٹے میر صدر الدین والد کے بعد جانشین ہوئے اور ۱۸۲۶ء/۱۲۴۲ھ میں وفات پائی۔ میر صدر الدین کے بعد ان کے فرزند میر معین الدین جانشین ہوئے۔ ۱۸۵۹ء/۱۲۷۶ھ میں میر معین الدین کی وفات پر بخشی گری کا منصب فاطمہ بیگم بنت نجم الدین بخشی اول کو دیا گیا۔ فاطمہ بیگم کی شادی میر نجم الدین بخشی اول کے بھائی میر قمر الدین کے بیٹے میر شمس الدین سے ہوئی تھی۔ فاطمہ بیگم نے ۱۸۸۲ء/۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا۔ فاطمہ بیگم کے بعد منصب بخشی گری میر نجم الدین اول بخشی کے بھائی میر قمر الدین بن سید مٹھن کے خاندان میں منتقل ہوگیا۔ میر قمر الدین بن میر شمس الدین بن میر قمر الدین بن سید مٹھن کے چار بیٹے۔ میر کمال الدین میر ضیاء الدین، میر زین الدین اور میر عظیم الدین تھے۔ فاطمہ بیگم کے بعد میر کمال الدین کے فرزند میر امین الدین رفاعی منصب کے حقدار تھے مگر میر امین الدین کی طبیعت فقر و درویشی کی طرف مائل تھی اس لئے ان کے چچا میر عظیم الدین ۱۸۷۴ء/۱۲۹۱ھ میں جانشین ہوئے۔ بخشی عظیم الدین کے بھائی ضیاء الدین کی اولاد میں دو بیٹے میر

نجم الدین اور میر افضل الدین تھے۔ افضل الدین کے فرزند میر معین الدین شوکت شاعر گذرے ہیں۔ افضل الدین کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ ان میں ایک شادی حکیم سید قمر الدین قادری (راقم کے نانا صاحب) کی بہن قادری بیگم سے ہوئی تھی۔ شوکت نے ۱۹۱۵ء/۱۳۳۵ھ میں انتقال کیا۔ عظیم الدین کے دوسرے بھائی زین الدین نے لاولد وفات پائی۔ بخشی میر عظیم الدین کے جشن جانشینی کے موقع پر منشی لطف اللہ ذکا (نبوا ڑھنگ) جیا صاحب وغیرہ نے تہنیتی قصیدے پڑھے تھے۔ میر عظیم الدین نے ۱۸۹۶ء/۱۳۱۴ھ میں انتقال کیا ان کی اولاد میں چار بیٹے میر صدر الدین میر زین الدین شیدا، میر شمس الدین عرف نواب صاحب اور میر خیر الدین عرف بالا صاحب تھے۔ شمس الدین کے بیٹے افضل الدین مرحوم کے اولاد نرینہ نہیں ہے۔ خیر الدین کے بیٹے صدر الدین سورت میں ہیں۔ میر صدر الدین والد کے جانشین ہوئے۔ میر صدر الدین بڑے خوبیوں کے مالک تھے۔ دل میں خدمت الناس کا بھی جذبہ رکھتے تھے۔ یہ اتنے طاقتور تھے کہ نواب میر جعفر علی کی طرح گدھے کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا لیتے تھے۔ ان کی خدمات کے پیش نظر حکومت نے انہیں خان بہادر کا خطاب بھی عنایت کیا تھا۔ میر صدر الدین نے ۱۹۲۰ء میں وفات پائی۔ صدر الدین سید امین الدین کے داماد تھے۔ ایک دفعہ امین الدین صاحب نے اپنے چچا عظیم الدین صاحب سے شکایت کی ہوگی کہ صدر الدین اپنی اہلیہ پر ظلم کرتا ہے اسے سمجھائے۔ عظیم الدین نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا اس بات پر امین الدین صاحب کو غصہ آگیا اور اساس البیت اٹھا کر دریا محل کے مقابل روپا محل سے دور چلے گئے۔ اس طرح ان کے نواسے میر تیغ برخان کی پرورش نانا کے زیر سایہ ہوئی۔ میر صدر الدین کے انتقال پر منصب کے لئے دوسرے دعویدار بھائی کھڑے ہوگئے مگر حکومت نے تیغ برخاں کو حقدار مان لیا اور جانشین مقرر کیا۔ تیغ برخان کی شادی ۱۹۲۳ء میں حکیم میر یاور حسین کی بیٹی کریم النساء سے ہوئی تھی۔ میر تیغ برخان نے ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔ مرحوم کے جانشین ان کے فرزند اکبر میر وحید الدین بقید حیات ہیں میر وحید الدین کے ایک بھائی میر فرید الدین ہیں جو وکالت کا پیشہ کرتے ہیں۔ فرید الدین کی شادی حکیم میر فراز حسین بن یاور حسین کی بیٹی سے ہوئی ہے۔ میر تیغ برخان کے تیسرے فرزند حفیظ الدین اکسائز انسپکٹر ہیں۔ میر وحید الدین کی شادی بھر دیا کے انعام دار خاندان میں ہوئی ہے۔ ان کی اولاد میں چار بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔

مومن آباد سچین کا نواب خاندان

بمبئی کے جنوب میں تقریباً سو میل کے فاصلہ پر قلابہ ضلع میں ایک جزیرہ ہے جو عرف عام میں جنجیرہ کے نام سے مشہور ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر سے تاریخ میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ یہ جزیرہ نظام شاہی حکومت میں تھا۔ جب نظام شاہی کے زوال کے بعد عادل شاہیوں کے زیر نگیں یہ حصہ آگیا تو ۱۶۳۶ء میں ملک عنبر اس جزیرہ کا افسر اعلیٰ مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۶۴۲ء میں ملک عنبر کی وفات کے بعد سیدی یوسف کو یہ منصب دیا گیا مگر فتح خاں نے سیدی یوسف کو ۱۶۴۸ء میں منصب سے ہٹا دیا۔ فتح خاں کے بعد شاہ نواز خاں جزیرہ کا کل مختار افسر اعلیٰ رہا۔ ۱۶۷۰ء میں شیواجی نے جزیرہ کو سر کرنا چاہا۔ محاصرہ کی تاب نہ لاکر شاہ نواز خان جزیرہ شیواجی کے حوالے کر دینا چاہتا تھا لیکن اس کے فوجی سردار سیدی سنبل اور دو بھائی سیدی یاقوت خاں اور سید خیریت خاں نے شاہ نواز کو قید کر دیا اور مرہٹوں کا مقابلہ کیا۔ مرہٹوں نے آخر مایوس ہو کر محاصرہ اٹھا لیا۔ اس کے بعد سیدی یاقوت اور سیدی خیریت نے سیدی سنبل کو جانشین انتخاب کیا۔ سیدی سنبل کو ۱۶۷۱ء میں مغلوں کی جانب سے امیر البحر مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۶۷۶ء میں اس کو ہلاک کر دیا گیا۔ سیدی سنبل کے بعد سیدی خیریت جانشین مقرر ہوا۔ خیریت خاں نے ۱۶۹۶ء میں انتقال کیا۔ سیدی خیریت خاں کے بعد سیدی بلال قاسم جانشین ہوا۔ قاسم خاں سیدی یاقوت کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ یاقوت خاں اول نے ۱۷۰۶ء ۱۱۱۸ھ میں وفات پائی۔ یاقوت خاں کے بعد اس کا ایک نہایت لائق افسر سیدی سرور جانشین منتخب کیا گیا۔ سیدی سرور خاں جزیرہ کا پہلا خود مختار حاکم تسلیم کیا گیا۔ اسی سے نواب جنجیرہ اور نواب سچین کے خاندانوں کا سلسلہ چلا ہے۔ سیدی سرور نے ۱۷۳۴ء/۱۱۴۷ھ میں وفات پائی۔ سیدی سرور کے بارہ فرزند تھے۔ ان میں خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان فرزندوں میں سے ایک سیدی عبدالرحیم یاقوت خاں متوفی ۱۷۸۴ء/۱۱۹۸ھ تھے۔

جنجیرہ میں نواب سیدی عبدالرحیم خاں کے انتقال پر نواب سیدی عبدالکریم جانشین ہوئے مگر ان کے والد کا مدار المہام سیدی جوہر نواب موصوف کو پریشان کر کے ریاست سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ نواب عبدالکریم نے چارۂ کار نہ پا کر پیشوا سے بمقام پونہ ملاقات کی اور حالات

سے آگاہ کیا۔ پیشوا ان لوگوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا اور مستقبل میں ان سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے اس طرح مصالحت کرادی کہ پیشوا نے گجرات میں اپنے مقبوضات میں سے سترہ گاؤں نواب عبدالکریم کو دے کر جنجیرہ پر سے اپنا حق اٹھا دینے کو کہا۔ نواب سیدی عبدالکریم خاں نے یہ منظور کیا اور ۱۷۹۱ء/۱۲۰۶ھ میں نواب صاحب پونہ سے سورت آئے اور سال مذکور میں گجرات میں ایک نئی ریاست وجود میں آئی اس طرح سیدی عبدالکریم یاقوت خاں عرف نواب بالو خلف نواب سیدی عبدالرحیم یاقوت خاں بن سیدی سرور یاقوت خاں۔ ریاست مومن آباد سچین (گجرات) کے پہلے نواب قرار پائے۔ شاہ عالم بادشاہ غازی کی طرف سے انہیں خطاب مبارز الدولہ نصرت جنگ عطا ہوا تھا۔

نواب سیدی عبدالکریم خاں عرف نواب بالو نے ۱۸۰۲ء/۱۲۱۶ھ میں انتقال کیا۔ موصوف کے سات بیٹے تھے۔ (۱) ابراہیم خاں (۲) اسماعیل خاں ۱۲۴۶ھ (۳) نھو میاں ۱۲۲۵ھ (۴) محمد خاں (۵) عبدالقادر خاں (۶) یوسف خاں ۱۲۰۵ھ (۷) عبداللہ خاں ۱۲۴۲ھ موصوف کو شعر و سخن سے شغف تھا۔ کریم تخلص کرتے تھے۔ نواب بالو کے بعد ان کے فرزند سیدی ابراہیم یاقوت خاں والد کے جانشین ہوئے۔ نواب صاحب بھی اپنے والد کی طرح علم دوست نواب گذرے ہیں۔ موصوف بڑے فیاض نواب تھے ان کی جود و سخا مشہور تھی۔ انھوں نے حج بیت کے لیے ایک جہاز بنوایا تھا جس میں ضرورت مند حاجیوں کو مفت بھیجا جاتا تھا بلکہ خور و نوش کا بھی انتظام نواب صاحب کی طرف سے ہوتا تھا۔ اس جہاز کے ناخدا سورت کے جہاز خاندان کے ایک شخص تھے۔ موصوف کو بھی شعر و سخن سے شغف تھا۔ محب تخلص کرتے تھے۔ تقریباً سو سال کی طویل عمر میں بتاریخ ۱۴ جمادی الثانی بسنہ ۱۸۵۲ء/ ۱۲۶۹ھ انتقال کیا۔ موصوف کثیر الاولاد تھے۔ پچیس بیٹے اور کچھ کم بیٹیاں تھیں۔

نواب ابراہیم خاں محب کے بعد ان کے فرزند اکبر نواب سیدی عبدالکریم خاں دوم جانشین ہوئے۔ ۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ میں موصوف نے انتقال کیا۔ نواب صاحب کے پانچ بیٹے سیدی اسماعیل خاں (ابراہیم خاں) سیدی عبدالرحیم، سیدی عبدالغنی، سیدی محمد خاں اور سیدی بالو میاں تھے۔ نواب سیدی عبدالکریم خاں دوم کے بیٹے سیدی ابراہیم خاں دوم والد کے بعد جانشین ہوئے۔ نواب عبدالرحیم عرف سیدو میاں بھی شاعر گذرے ہیں اخلاص تخلص کرتے

تھے اور نواب ابراہیم خاں دوم کے ایک بھائی عبدالغنی بھی شاعر تھے غنی تخلص کرتے تھے غنی نے بمبئی میں مستقل اقامت اختیار کرلی تھی اور ۱۸۸۴ء/۱۳۰۲ھ میں وہیں انتقال کیا۔ نواب ابراہیم خاں نے ۱۸۷۳ء/۱۲۹۰ھ میں انتقال کیا۔ ان کے بعد ان کے خلف الرشید نواب سیدی عبدالقادر جانشین ہوئے۔ نواب صاحب کے ایک بھائی نواب نصراللہ خاں صاحب بارایٹ لا تھے۔ بمبئی میں کچھ مدت بیرسٹری کی مگر موصوف آمدنی سے زیادہ خرچ کرتے تھے۔ سنا ہے کہ روزانہ سو پچاس روپیہ کی دفتر میں چائے ہوجاتی تھی۔ ان کی شادی بمبئی کے شاہ سوداگر ناخدا روگھے کی بیٹی سے ہوئی تھی سورت میں آخری زمانہ میں محلہ ترکی واڑہ میں محمدی محل میں قیام پذیر تھے۔ موصوف کی لائبریری قابل سیر تھی۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ نواب سیدی عبدالقادر کے بعد ان کے فرزند نواب سیدی ابراہیم خاں سوم جانشین ہوئے۔ موصوف نے پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ کی جانب سے حصہ لیا تھا اور دوسرے طریقوں سے بھی برطانیہ کی مدد کی تھی۔ موصوف کے بعد ان کے فرزند اکبر نواب سیدی حیدر یاقوت جانشین ہوئے۔ موصوف نے ۱۹۴۸ء/۱۳۶۸ھ کے بعد سے بمبئی میں مستقل اقامت اختیار کرلی تھی۔ نواب صاحب کا کتب خانہ نادر کتب خانہ ہے۔ نواب صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ چیمبر آف پرنسس میں موصوف کی رائے بہت وقیع بھی جاتی تھی۔ موصوف کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ ان کے بھائی نواب زادہ سرور اور سلیم بقید حیات ہیں نواب سیدی حیدر نے ۱۹۷۱ء یا ۱۹۷۲ء میں انتقال کیا

ملّا خاندان

عبدالغفور بن ابوبکر بن محمد صدیقی نہروالا پٹن گجرات کے باشندے تھے۔ تلاش معاش میں سورت آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ابتدا میں شہر کے کسی مکتب یا مسجد بچوں کو پڑھاتے تھے اس لئے ملّا صاحب کے نام سے مشہور ہوگئے تھے۔ ملا صاحب کو بیوپار کا بڑا شوق تھا۔ اپنے فرصت کے اوقات میں خرید و فروخت کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح اہل اللہ کی خدمت کو وہ اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ انہیں کسی مجذوب سے نیاز حاصل ہوا۔ ملا صاحب مجذوب کو اپنی قیام گاہ پر لائے۔ ایک روز مجذوب اٹھے اور اپنا راستہ لیا ملا صاحب بھی ان کے پیچھے ہولئے، کہتے ہیں کہ مجذوب دریائے تاپتی کے

کنارے پر پہنچے اور ملا صاحب سے کہا کہ اپنا دامن کشادہ کرو ملا صاحب نے ایسا ہی کیا مجذوب نے اپنے کشکول سے ساحل کی ریت بھر بھر کر ڈالنا شروع کیا جب مجذوب انہیں کشتیاں ڈال چکے تو ملا صاحب نے دامن کے پھٹ جانے کا اندیشہ ظاہر کیا۔ مجذوب نے ہاتھ کھینچ لیا اور آگے بڑھ گئے اور ملا صاحب نے ریت وہیں پھینک دی اور گھر لوٹ گئے۔

چند روز یا چند سال کے بعد ایک عرب تاجر کے کھجور کے بتے ایک مشہور سوداگر زاہد بیگ کے جہاز میں سورت آرہے تھے۔ راستہ میں کھجور کے مالک کا انتقال ہوگیا۔ چنگی وصول لینے کے لئے کسٹم افسروں نے مال نیلام کردیا۔ یہ مال ملا صاحب نے خرید لیا۔ جب کھجور کے بستے ملا صاحب اپنے گھر لے گئے اور کھولے تو بستوں میں جواہرات دستیاب ہوئے۔ ملا صاحب نے بڑی دانشمندی سے جواہرات فروخت کرکے اس دولت سے بڑے پیمانے پر تجارت کا آغاز کیا۔ گزیٹر کا بیان ہے کہ ۱۶۹۲ء/۱۱۰۴ھ میں ملا صاحب سورت کے بڑے تاجروں میں اونچا درجہ رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں وہ انیس جہازوں کے مالک تھے۔ ملا صاحب جب کبھی نیا جہاز بنواتے تو ایک جہاز غرق ہو جاتا اس طرح وہ انیس جہاز ہی کے مالک رہے مجذوب کی پیشین گوئی بھی سچ ہوئی۔ ۱۷۰۳ء/۱۱۱۵ھ میں مغلیہ حکومت کی جانب سے انہیں خطاب عمدۃ التجار، خلعت فاخرہ اور ایک لاکھ روپیہ محصول کی معافی کے پروانہ عطا ہوا تھا۔

ملا عبدالغفور نے ۱۷۱۵ء/۱۱۲۸ھ میں انتقال کیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ملا عبدالغفور کے فرزند عبدالحیؒ اپنے والد کی عین حیات میں انتقال کر گئے تھے لہذا عبدالغفور کے بعد ان کے پوتے محمد علی بن عبدالحیؒ وارث قرار پائے۔ اس وقت کے متصدی حیدر قلی خاں نے ملا محمد علی کی نقد و جائداد وغیرہ اس بہانہ سے ضبط کرلی کہ عبدالغفور کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ نقدی میں پچاسی ہزار روپیہ ملا صاحب کے گھر میں دستیاب ہوا تھا اسی وجہ سے آج تک ان کا خاندان ملا کے علاوہ پنچاسی اور پنچاسی والوں کے نام سے مشہور ہے (پچاسی کو گجراتی میں پنچاسی کہتے ہیں) محمد علی نے دہلی میں اثر و رسوخ سے کام لے کر اپنا حق ثابت کیا اور جائداد واپس حاصل کی۔ ضبط کردہ رقم حیدر قلی نے نہیں لوٹائی اور جب اس کا چرچا ہونے لگا تو حیدر قلی نے اعلان کیا کہ مذکورہ رقم ملا صاحب سے شہر پناہ کی تعمیر کے لئے حاصل کی گئی تھی۔

سورت کے متصدی سہراب خاں بن رستم علی خاں سے محصولات کی وصولی پر ملا صاحب سے خفیف سی رنجش ہوگئی تھی۔ ملا صاحب نے گجرات کی ایک بندرگاہ گھوگھا کے قریب پیرام نامی

ایک جزیرہ خریدا اور وہاں قلعہ اور بندرگاہ کی تعمیر کا کام شروع کرایا لیکن جزیرہ پر سانپ اور بچھو کی کثرت کی وجہ سے مزدوروں کی جانیں تلف ہوئیں اس لئے تعمیر کا خیال چھوڑ دیا اور سورت کے قریب اٹھوا گاؤں میں تاپی ندی کے کنارے پر قلعہ بندرگاہ تعمیر کرانا شروع کیا۔ سہراب خاں ملا صاحب کے اس ارادہ کے مانع ہوا۔ ملا صاحب نے اس بنا پر قلعہ دار بیلگر خاں کو رشوت دے کر ساز باز کی تاکہ سہراب خاں کا کانٹا نکل جائے۔ وقت مقررہ پر قلعہ پر سے سامنے سہراب خاں کی حویلی پر گولہ باری کا آغاز کیا اور ادھر سے ملا صاحب لائحہ عمل کے مطابق امن کا فرشتہ بنکر مصالحت کرانے میدان میں آئے۔ سہراب خاں دب گیا اور یہ طے پایا کہ دہلی سے تازہ سند متصدی گری آنے تک بیلگر خاں کے بھائی تیغ بیگ خاں (مرزا گل) شہر کے انتظامی امور کی نگرانی کریں اور اس وقت تک سہراب خاں ملا صاحب کے ایک باغ میں قیام کریں۔ اس کے بعد ملا صاحب نے دوبارہ قلعہ کوٹھی وغیرہ کی تعمیر شروع کرادی۔ بیلگر خاں اور تیغ بیگ خاں نے اس کو اپنے لئے خطرہ سمجھ کر ملا صاحب سے کہلا بھیجا کہ بادشاہ کی اجازت کے بغیر قلعہ کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ ملا صاحب نے یہ صورت حال دیکھ کر دوبارہ سہراب خاں سے ساز باز کی اور کثیر رقم خرچ کر کے اپنے اثر رسوخ سے سہراب خاں کے نام سند منگوادی لہٰذا تیغ بیگ خاں کو دست بردار ہونا پڑا۔ اس کے بعد ملا صاحب نے قلعہ، کسٹم ہاؤس وغیرہ تعمیر کرائے اور اس کو رسول آباد نام دیا گیا۔ آنے والے جہازوں کا مال اسی بندرگاہ میں اترجاتا اس طرح سورت کی رونق اور محصول کو نقصان پہنچا لہٰذا سہراب خاں نے ملا صاحب کو اپنی آبائی کوٹھی میں قیام کرنے کو کہلا بھیجا۔ ملا صاحب کو یہ ناگوار گذرا اور انھوں نے خانقاہ عیدروسیہ میں اس وقت کے اکابر کو جمع کر کے محضر لکھوایا کہ ملا محمد علی غربا کی روزی کا وسیلہ ہیں اور ایسے تاجر کو متصدی سہراب خاں نقصان پہنچا رہے ہیں لہٰذا انہیں ہٹا دیا جائے۔ ادھر ملا صاحب نے دارو گولہ ہتھیار وغیرہ ندی کے راستہ سے قلعہ میں بیلگر خاں کو پہنچائے اور دوسری طرف سید علی واعظ نے سہراب خاں کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا غرض معاملہ اتنا نازک ہو گیا کہ سہراب خاں کو اپنے عہدہ سے دست بردار ہونا پڑا اور ان کی جگہ تیغ بیگ خاں نے پھر زمام حکومت سنبھال لی۔ ملا صاحب نے تیغ بیگ خاں کے نام سند منگوا دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن خیال بدل گیا اور انھوں نے تیغ بیگ خاں کی سفارش کرنے کی بجائے اپنے بیٹے فخرالدین کے نام سند منگوانے کا ارادہ کیا لہٰذا دہلی اس مضمون کا خط بھیجا کہ سہ ہزاری

منصب خطاب فخرالدولہ سند متصدی گری وغیرہ ملا صاحب کو بھیجے جائیں اور وہ جس کو چاہیں اس کو متصدی مقرر کریں۔ بدقسمتی سے قاصد بھروچ کے قریب تیغ بیگ خاں کے آدمیوں کے ہاتھ پکڑا گیا۔ مذکورہ خط تیغ بیگ خاں کے سامنے جب پیش کیا گیا تو اس نے سوچا کہ جب تک ملا صاحب زندہ ہیں نواب بنے رہنا مشکل ہے۔ تیغ بیگ خاں نے ملا صاحب کو میلاد النبی کے موقع پر دعوت دی۔ ملا صاحب کے بہی خواہ خطرے سے آگاہ تھے انہیں جانے سے روکا گیا مگر ملا صاحب نہ مانے۔ طعام سے فارغ ہونے کے بعد تیغ بیگ خاں نے کہا کہ ملا صاحب! ہم نے ایک نایاب قرآن پاک ہدیتاً لیا ہے۔ اس قرآن پاک میں مذکورہ خط رکھ دیا گیا تھا۔ ملا صاحب نے جب وہ خط دیکھا تو خائف ہوئے۔ اسی مجلس میں مانڈوی کے بھیل راجا کو ملا صاحب کے پہلو میں بٹھلایا گیا تھا۔ جس نے ملا صاحب کی کمر سے خنجر نکال لیا۔ لوگوں نے ملا صاحب کو حلقہ میں گھیر لیا اور اس طرح قید کر کے انہیں قلعہ میں بھیج دیا گیا۔ ملا صاحب نے قید خانہ میں پہرہ دار کو زر کثیر کا لالچ دے کر کاغذ قلم وغیرہ منگوایا اور وہیں سے آصف جاہ کے نام ایک خط لکھا۔ آصف جاہ نے تیغ بیگ خاں کے نام خط لکھا کہ ملا صاحب کو فوراً باعزت طریقہ پر رہا کر دیا جائے ورنہ نتیجہ برا ہوگا۔ تیغ بیگ خاں پر حکم کی تعمیل لازمی تھی لہٰذا جاہ و حشم کے ساتھ رہا تو کیا مگر قلعہ سے روانگی کے وقت انہیں زہر دے دیا گیا۔ جب ملا صاحب کی پالکی ان کی حویلی پر پہنچی تو ان کی لاش ہی پالکی سے اتار کر اندر لے جائی گئی۔ تاریخ وفات ہے۔

شہید از زہر مردان مکار　دوسری تاریخ ہے : علی مظلوم ہے آج

۱۱۴۶　　　　۱۱۴۶

ملا صاحب کے بعد تیغ بیگ خاں نے رسول آباد کو ویران کر دیا۔ ملا صاحب کی کئی حویلیاں، باغات وغیرہ تھے۔ انھوں نے بمقام مغل سرائے حویلی کے قریب ایک مسجد تعمیر کرائی تھی۔ اس کی تاریخ ہے؛

دامن اصحاب بگیر و بگو　جامعہ معمور محمد علی ست

۱۱۳۷ھ

مذکورہ مسجد مغلوں سے قبل کی اسلامی تہذیب کا ایک نمونہ ہے۔ خصوصاً اس کا بیرونی دروازہ سمرقند و بخارا کی مساجد کی یاد تازہ کر دیتا تھا۔ افسوس کہ ابھی ابھی نئی تعمیر کے پیش نظر توڑ دیا گیا۔ ملا محمد علی اسی مسجد میں سپرد خاک کیے گئے ہیں۔ خاندان کے بیشتر افراد کی قبریں اس مسجد میں ہیں۔

پروفیسر داس گپتا نے سورت کے گورنر کے ایک خط کے حوالے سے لکھا ہے کہ ملا صاحب کو ان کے آبائی قبرستان بمقام بریادی دروازہ دفن کیا گیا ہے یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ان کی یادگار مسجد میں دفن نہیں کیا گیا ان میں سے ایک قبر کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ملا صاحب کی قبر ہے۔

ملا محمد علی کی وفات کے بعد ان کے بیٹے محمد حسین نے جدہ سے آکر کاروبار سنبھال لیا مگر ۱۱۴۷ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ دوسرے بیٹے ملا فخر الدین تیغ بیگ خاں سے پرخاش کی بنا پر آصف جاہ کے پاس حیدرآباد دکن چلے گئے تھے۔ تیسرے بیٹے امین الدین تجارت کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ میں فخر الدین سورت آئے لیکن نواب سید اچھن سے ان بن ہوگئی۔ نواب نے انہیں قید کردیا۔ ان کے ایک دوست مسٹر لام (LAMB) کوٹھی دار انہیں رہا کرالایا اور بمبئی بھیج دیا۔ چودہ سال بمبئی میں قیام کرنے کے بعد ملا صاحب پھر ۱۷۵۹ء/ ۱۱۷۳ھ میں سورت آئے۔ انھوں نے شہر کے باہر بمقام بھٹار حویلی تعمیر کرائی تھی۔ موصوف نے ۱۷۸۷ء/ ۱۲۰۲ھ میں بمقام پونا انتقال کیا۔ فخر الدین کو شعر و سخن سے شغف تھا۔ مضطر تخلص کرتے تھے۔ ان کا دیوان پیر محمد شاہ کتب خانہ میں محفوظ ہے فخر الدین کے سورت آنے پر آصف جاہ راضی نہ تھے۔ جب سورت میں نواب سید اچھن سے ان بن ہونے پر فخر الدین نے آصف جاہ کو شکایت لکھ بھیجی۔ آصف جاہ نے جواب میں لکھا۔

نہ تو نے گل کیا بلبل نہ تو نے باغباں اپنا   چمن میں کس بھروسہ باندھتی ہو آشیاں اپنا

ملا فخر الدین نے جواب میں طنز کیا کہ

بلبل بے کس کی گنجائش چمن میں کیونکہ ہو   ایک تو صیاد تھا اور باغبان دشمن ہوا

فخر الدین کی اولاد میں ولی الدین حسن، مجید الدین ابوالفتح، خدیجہ، کلثوم بی بی اور افضل النسا تھے۔ ابوالفتح نے ۱۸۱۱ء میں وفات پائی۔ ابوالفتح بڑے عیش پسند تھے۔ خاندان کی دولت بے دریغ لٹائی۔ یہ عموماً بھٹار کی کوٹھی میں رہتے تھے۔ ابوالفتح کے بیٹے ملا قطب الدین تھے۔ قطب الدین بڑے علم دوست اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کے دربار سے کئی شاعر منسلک تھے۔ انھوں نے بھی اپنے والد کی نقش قدم پر چلکر بچی کچی دولت ٹھکانے لگادی قطب الدین نے عین شباب میں ۱۸۴۰ء/۱۲۵۶ھ میں انتقال کیا۔ انھوں نے کئی شادیاں کی تھیں۔ ان سے ایک بیٹا مُلا امیر الدین اور دو بیٹیاں بدر النسا اور سکینہ بی بی تھیں۔ ملا امیر الدین کے خالو نواب بالو نواب

صاحب سچین کے ہاں امیرالدین نے پرورش پائی۔ امیرالدین کے اولاد نرینہ نہیں تھی۔ ان کے ایک ایک داماد قطب الدین بھی شاعر گذرے ہیں۔

ملا فخرالدین کی ایک بیٹی خدیجہ کی شادی، اسی خاندان کے ملا عبدالحی متوفی ۱۸۱۵ء بن ملا عبدالغفور بن عبدالقادر بن جمال الدین بن عبدالوہاب سے ہوئی تھی۔ عبدالوھاب ملا ابوبکر کے بیٹے اور ملا عبدالغفور عرف التجار (اولین تخلص) کے بھائی تھے۔ خدیجہ بنت فخرالدین کے بطن سے ملا محمد علی بن عبدالحیٰ ثانی پیدا ہوئے۔ محمد علی عالم تھے ایک مدت تک سورت میں منصب افتا میں بطور مفتی خدمت انجام دیں۔ مفتی محمد علی نے ۱۸۳۶ء میں وفات پائی۔ مفتی صاحب کے تین بیٹے عبدالوھاب متوفی ۱۸۹۴ء/ ۱۳۱۱ھ عبدالقادر اور عبدالحیٰ ثالث، متوفی ۱۹۱۲ء/ ۱۳۳۰ھ تھے اور ایک بیٹی خدیجہ تھیں۔

عبدالوھاب کے ایک بیٹے محمد علی تھے۔ جوانی میں انھوں نے وفات پائی۔ عبدالوھاب کی شادی عاشورہ بیگ کی پوتی حسینی خانم بنت مرزا مغل سے ہوئی تھی عبدالوھاب کی دو بیٹیاں نجم النسا اور خیرالنسا تھیں۔ نجم النسا کی شادی منشی فضل الدین منشی لطف اللہ سے ہوئی تھی اور خیرالنسا کی شادی حکیم سید قمرالدین قادری سید نظام الدین سے ہوئی تھی۔ خیرالنسا راقم الحروف کی نانی صاحبہ تھیں۔

ملا عبدالحیٰ متوفی ۱۹۱۲ء کے اولاد نرینہ نہیں تھی ان کی دو بیٹیاں نجیب النسا اور رحیم النسا تھیں۔ نجیب النسا کی شادی شہر قاضی قاضی سید اخی سے ہوئی تھی۔ قاضی سید اخی نواب میر غلام بابا کے بھائی تھے۔ ملا عبدالقادر کے اکلوتے بیٹے محمد حسین تھے۔ محمد حسین کاٹھیاواڑ کے راجکمار کالج میں فارسی معلم تھے وہاں سے وڑیا کے رئیس انہیں لے گئے جہاں انھوں نے آخر دم تک بطور دیوان خدمت انجام دی۔ محمد حسین نے ۱۹۲۵ء میں وفات پائی۔ محمد حسین کے اکلوتے بیٹے ملا عبدالغفور عرف ابوالخیر بی اے ہیں۔ ابوالخیر بمبئی کے سی کسٹم میں اپریزر تھے۔ موصوف نے بمبئی میں مستقل اقامت اختیار کر لی تھی۔ ملا ابوالخیر کے اکلوتے فرزند ملا ابوالکلام بی اے۔ ایم۔ بی۔ اے (نیویارک) بمبئی میں اعلیٰ عہدہ پر فائز رہے۔ فی الحال کناڈا میں ملا ابوالخیر کی چار بیٹیاں ہیں۔ زبیدہ بیگم کی شادی کراچی کے چیف انجنیر پورٹ ٹرسٹ سید محی الدین بن ڈاکٹر جلال الدین قادری بن حکیم سید قمرالدین قادری سے ہوئی ہے۔ دوسری بیٹی فاطمہ بیگم کی شادی پاکستان میں کرنل افضل شاہ سے ہوئی ہے۔ تیسری بیٹی نفیسہ بیگم کی شادی ڈاکٹر وقار الہمدانی ایم۔ اے پی ایچ ڈی نمائندہ پاکستان بہ یونو امریکہ ہوئی ہے۔ چوتھی بیٹی طاہرہ بیگم بمبئی میں ہیں۔

شیخ محمد فاضل شہید (عمدة التجار)

شیخ خاندان کے پہلے بزرگ شیخ عبداللطیف عبیدی الحجازی البدوی قاضی بغداد ۱۳۱۷/۷۳۶ھ میں گجرات آئے۔ عبداللطیف نے نہروالا پٹن میں انتقال کیا۔ موصوف کے فرزند حسن محمد نے تجارت شروع کی اور ترقی کرکے شاہی دربار میں اپنی ایسی ساکھ قائم کرلی کہ سلطان احمد شاہ بانی احمد آباد نے خاندان کے لوگوں سے شہر احمد آباد میں سکونت اختیار کرنے کو کہا۔ حسن محمد کے پڑپوتے شیخ احمد اور شیخ عثمان ۱۵۵۵/۹۶۲ھ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ شیخ عثمان کے فرزند صفی الملقب سیف خاں عہد جہانگیری میں گجرات کے ناظم مقرر کئے گئے تھے۔ ۱۶۱۳ء میں سیف خاں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو شہنشاہ سے پروانہ حاصل کرنے اور سورت میں کوٹھی قائم کرنے میں بڑی اعانت کی تھی۔ ان کے فرزند شیخ محمد امین شاہجہاں کے عہد میں دو مرتبہ سورت کے متصدی مقرر کئے گئے تھے۔ شیخ احمد کے پوتے شیخ حامد بن عبدالمجید نے الہ آباد سے سورت آکر مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ انہیں ۱۶۴۰/۱۰۵۰ھ میں خطاب عمدة التجار خلعت فاخرہ اور ایک لاکھ روپیہ کا محصول کی معافی کا پروانہ عنایت ہوا تھا۔ شیخ حامد نے ۱۷۰۲/۱۱۱۳ھ میں انتقال کیا۔ شیخ حامد کے بعد ان کے فرزند شیخ محمد فاضل جانشین ہوئے۔ عہد اورنگ زیب میں یہ صاحب اقتدار شخصیتوں میں سے تھے۔

دولت مندی کے ساتھ ساتھ علمی ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے تیس لاکھ روپیہ کی لاگت سے تقریباً چالیس ہزار کتابیں (مخطوطے) جمع کئے تھے۔ شیخ حامد نے بھی ہزاروں کتابیں جمع کی تھیں۔ جہازوں کے مالک تھے اس لئے ان کے کاتب دنیا کے دور دراز ملکوں میں جاتے اور کتابوں کی نقلیں لاتے۔ شیخ فاضل سالانہ ساٹھ ہزار روپیہ بطور زکاۃ ادا کرتے تھے۔ شیخ فاضل شاعر بھی تھے فاضل تخلص کرتے تھے۔ اردو فارسی گجراتی تین زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ۱۷۱۷/۱۱۲۹ھ میں حج بیت اللہ کے لئے گئے تھے وہاں انہیں بشارت دی گئی کہ تمہارے لئے خلعت مقرر کیا گیا ہے جو گجرات میں عطا کیا جائے گا۔ حج واپسی کے بعد اسی سال اپنے بیٹوں شیخ سلیمان اور شیخ محمد صدیق کی شادی کے لئے برات لے کر سورت سے احمد آباد جارہے تھے۔ ان کے ہمراہ سپاہیوں کا رسالہ خدمت گار، زر و جواہر وغیرہ تھے۔ بڑودہ کے قریب حیدر قلی خاں متصدی کے ایما

پر کولیوں نے برات پر حملہ کر دیا اور شیخ فاضل شہید کر دیئے گئے۔ حیدر قلی خان شیعہ تھا اور ان سے مذہبی مسائل میں کچھ اختلاف ہو گیا تھا نعش کو بڑودہ میں کفنایا اور بمقام احمد آباد ان کے دادا کے پہلو میں بی بی جی کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر پینتالیس سال کی تھی۔ اس واقعہ کے بعد شیخ سلیمان مکہ معظمہ ہجرت کر گئے جہاں ترکستان کے سلطان سلیم کی ان پر نظر عنایت تھی۔ شیخ محمد صدیق تجارت کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انھوں نے ۱۷۲۳ء/ ۱۱۳۶ھ میں وفات پائی۔ ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی شیخ محمود نے کاروبار سنبھال لیا تھا شیخ محمود نے خاندانی تہذیبی روایات کو قائم رکھا تھا۔ انھوں نے چالیس ہزار روپیہ کی لاگت سے ۱۷۳۴ء/۱۱۴۷ھ میں آئینہ محل کے نام سے عالی شان عمارت تعمیر کرائی تھی۔ وہاں نواب تیغ بیگ خان کی شایان شان دعوت کی تھی اور نذرانہ میں فیل پیش کیا تھا۔ ۱۷۷۰ء/۱۱۸۴ھ میں شیخ محمود نے انتقال کیا۔ شیخ محمود کے بیٹے شیخ حافظ بہادر والد کے انتقال کے وقت صغیر تھے اس لئے صالح چلپی کو ان کا وصی مقرر کیا گیا تھا۔ صالح چلپی نے حافظ بہادر کی دولت جہاز وغیرہ اپنے قبضہ میں لے لئے تھے۔ صالح چلپی نے ۱۷۹۳ء/۱۲۰۸ھ میں بمرض فالج انتقال کیا اور شیخ بہادر کو ان کی دولت واپس نہ مل سکی۔ شیخ بہادر نے ۲۷ سال کی عمر میں ۱۸۲۹ء/۱۲۴۵ھ میں وفات پائی۔ شیخ بہادر کے بیٹے شیخ حامد ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے سورت میں بہ عہدہ امینی مقرر کئے گئے تھے۔ موصوف نے تیرہ سال خدمت انجام دینے کے بعد ۱۸۴۰ء/۱۲۵۶ھ میں مذکورہ اسامی اپنے بیٹے شیخ رضی الدین عرف بخشو میاں کو دلوادی اور ۱۸۴۰ء/۱۲۵۵ھ میں انتقال کر گئے۔ بخشو میاں پینتالیس سال کی عمر میں ۱۸۴۹ء/۱۲۶۵ھ میں انتقال کر گئے۔ موصوف عالم و فاضل تھے موصوف نے تاریخ عالم اور تاریخ ہند پر فارسی میں حدیقۃ الہند اور حدیقہ احمدی کے نام سے دو ضخیم کتابیں مرتب کی ہیں۔ معلوم نہ ہو سکا کہ تحقیقی و تنقیدی نقطہ نظر سے مذکورہ کتب کی کیا اہمیت ہے کیونکہ دریا تحقیق کے شناوروں نے اس وقت سے اب تک ہزاروں موتی نکال لئے ہیں اس کے برعکس مالکان مخطوطہ کی ناسمجھی کی وجہ سے اب تک یہ مخطوطے شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکے۔ شیخ حامد کے دوسرے بیٹے شیخ محمد فاضل عرف ڈوسو میاں بیس سال برٹش حکومت میں بہ عہدہ منصف خدمت انجام دے کر ۱۸۷۹ء/۱۲۹۶ھ میں انتقال کر گئے۔ موصوف کو حکومت کی طرف سے خان بہادر کا خطاب عنایت ہوا تھا۔ شیخ رضی الدین بخشو میاں کے تین بیٹے شیخ بہادر عرف

بخو میاں، شیخ عبداللہ عرف نہنو میاں اور شیخ عبدالمجید تھے۔ شیخ بہادر نے سندھ میں مختار کار کے عہدہ پر خدمت انجام دینے کے بعد ریاست گائکواڑ میں سترہ سال بعہدۂ صوبہ خدمت انجام دی۔ شیخ بہادر کے تین بیٹے شیخ محمود، شیخ احمد اور شیخ امین تھے اور تین بیٹیاں امیر النسا، خیر النسا اور قمر النسا تھیں۔ پہلی دو بیٹیوں کی شادی یکے بعد دیگرے منشی محسن الدین اسٹیشن ماسٹر سے ہوئی تھی اور تیسری بیٹی کی شادی شیخ عبداللہ شیخ سراج الدین حافظ بہادر والوں سے ہوئی تھی۔ منشی محسن الدین کے دو بیٹے ظہیر الدین اور ناصر الدین ہیں۔ ظہیر الدین پاکستان اور ناصر الدین ہندوستان میں اکسائز کلکٹر ہیں۔ شیخ بہادر نے ۱۹۱۱ء میں وفات پائی۔ یہ شاعر بھی تھے۔ شیخ عبداللہ متوفی ۱۸۹۷ء میں شکارپور سندھ میں میونسپل سکریٹری تھے۔ سورت آنے کے بعد موصوف سچین ریاست میں تھوڑے دنوں کے لئے بطور دیوان رہے اور ۱۸۷۷ء میں سورت میونسپلٹی کے سکریٹری مقرر کئے گئے تھے۔ موصوف نے اپنی دیانت وصلاحیت کی بنا پر میونسپلٹی میں کئی اصلاحیں کر کے نظام درست کیا۔ یہ بڑے مقبول تھے۔ انہیں عوام میں نہنو میاں سکریٹری کہا جاتا تھا۔ ان کا ایک بیٹا شیخ نصیر الدین متوفی ۱۸۸۶ء/۱۳۰۴ھ تھا۔ شیخ احمد عرف بخشو میاں کے تیسرے بیٹے عبدالمجید محکمہ پولیس میں فوجدار تھے۔ شیخ محمود متوفی ۱۹۱۲ء/۱۳۳۵ھ میں شیخ بہادر عرف شیخو میاں کی اولاد میں شیخ محمد بی اے اور شیخ صفی بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ شیخ محمد سورت کے اولین مسلم گریجویٹ میں سے تھے۔ شیخ صفی کی اولاد میں شیخ عبدالواحد اور بیٹی افضل النسا بقید حیات ہیں۔

شیخ احمد سندھ میں بعہدۂ منصف تھے۔ چھتیس سال کی عمر میں بمقام سندھ ۱۹۱۴ء/۱۳۳۴ھ میں انتقال کیا۔ ان کی اولاد میں شیخ عبداللہ، شیخ عبداللطیف، شیخ بہادر اور شیخ محمد بیٹے اور رحمت النسا اور فرحت النسا بیٹیاں ہیں۔ شیخ عبداللہ سندھیا جہاز کمپنی میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ اس وقت سورت میں ہیں۔ ان کے ایک فرزند نے جرمنی سے طبی ڈگری حاصل کی ہے ایک بیٹے کی شادی بڑودہ کے نواب فخر الدین کی بیٹی سے ہوئی ہے۔ عبداللطیف مجرد ہیں محکمہ پولیس بمبئی سے ریٹائر ہو کر سورت آ گئے ہیں۔ شیخ بہادر نے عین جوانی میں ۱۹۳۰ء میں انتقال کیا۔ شیخ محمد ایم اے۔ ال۔ ال۔ بی پاکستان میں اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں۔ شیخ امین بن شیخ بہادر متوفی ۱۹۵۹ء آبکاری میں انسپکٹر تھے۔ ان کے ایک فرزند شیخ محمد صالح بمبئی کے فائر بریگیڈ میں افسر تھے۔ دوسرے فرزند شیخ فاضل جوان

انتقال کر گئے۔

چلبی خاندان (زبدۃ التجار)

حاجی صالح بن درویش چلبی عالمگیر کے عہد میں ہندوستان آئے اور تجارت شروع کی۔ قلیل مدت میں حاجی صالح کی تجارت کو اتنا فروغ حاصل ہوا کہ عالمگیر کی جانب سے انہیں زبدۃ التجار کا خطاب عنایت کیا گیا تھا۔ حاجی صالح نے اپنی حیات میں اپنا مقبرہ تعمیر کرالیا تھا جہاں انہیں سپرد خاک کیا گیا ہے۔

حاجی صالح کے بعد ان کے بیٹے احمد چلبی نے کاروبار سنبھالا۔ احمد چلبی تیغ بیگ خاں کے ہم عصر تھے اور اس عہد کی سیاست میں احمد چلبی نے بھی حصہ لیا ہے۔ تیغ بیگ خاں سے ان کے اچھے تعلقات تھے مگر ۱۷۳۲ء میں ان بن ہوگئی۔ احمد چلبی نے انگریزوں اور تیغ بیگ خاں کے درمیان سیاسی وجوہات کی بنا پر خلیج قائم کر دی تھی۔ تیغ بیگ خاں بڑے تاجروں سے خائف تھا اس نے ملا محمد علی کو زہر دیکر مارا اسی طرح جب اس کو احمد چلبی کی چالوں کا پتہ چلا تو اس نے ایک روز کولیوں کو بھیج کر احمد چلبی کو اس کی حویلی میں قتل کرادیا۔ (بہ حوالہ گزیٹیر) احمد چلبی کی حویلی دریائے تاپی کے کنارے تھی۔ فی الحال اس جگہ سورت کے سشنز جج کا بنگلہ ہے۔ احمد چلبی دو ہزار عرب اور رومی سپاہیوں کا دستہ رکھتے تھے انہیں بھی دولت نے مغرور بنادیا تھا۔

احمد چلبی کے چار بیٹے قادر چلبی، کریم چلبی، صالح چلبی (دوم) اور ابراہیم چلبی تھے۔ قادر چلبی نے ۱۷۶۳ء میں وفات پائی۔ ان کی پوتی بنت محمود چلبی کی شادی ملا خاندان میں ملا مجید الدین ابوالفتح سے ہوئی تھی۔ صالح چلبی (دوم) نے ۱۷۷۴ء/۱۱۸۸ھ میں وفات پائی۔

اس خاندان میں اب کوئی موجود نہیں ہے۔ ان کی یادگار ایک مسجد بہ محلہ سوداگرواڑ موجود ہے۔ اس کا سنہ ۱۱۹۱ھ ہے۔ اس مسجد کے سامنے ان کا قبرستان تھا اور دوسری طرف سامنے ان کی حویلی تھی جس پر آج انگلو اردو ہائی اسکول کی عمارت اور کھیل کا میدان ہے۔

مرزا عاشورہ بیگ کا خاندان

عہد عالمگیر میں دہلی میں عافیت نہ دیکھ کر تین امرا، کچھ آگے پیچھے حج بیت اللہ کے لئے گئے اور واپسی پر ان لوگوں نے سورت میں مستقل اقامت اختیار کرلی۔ وہ تین امیر مرزا عاشور بیگ، حافظ مرزا بقا بیگ اور بڑے خاں تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے سورت میں محلہ بسایا اور مسجدیں تعمیر کرائیں جو اب تک ان امیروں کی یاد تازہ کرتی رہتی ہیں۔

حافظ مرزا بقا بیگ خواجہ عبدالحکیم کشمیری کے فرزند تھے۔ شاہی ملازمت ترک کرکے مرزا بقا بیگ زیارت حرمین کے لئے گئے اور واپسی پر سورت میں مستقل اقامت اختیار کرلی۔ انھوں نے سورت کے قلعہ کے مقابل حویلی اور ایک مسجد ۱۷۱۳/۱۱۲۵ھ میں تعمیر کرائی تھی۔ ان کے نام سے محلہ اور مسجد اب تک مشہور ہیں۔ مرزا موصوف نے ۱۷۲۶/۱۱۳۹ھ کی ۱۹ شعبان کو وفات پائی۔

بڑے خاں دوسرے امیر تھے جنھوں نے سورت کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ بڑے خاں کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ ان کے نام سے ایک محلہ ہے جس کو بڑے خاں کا چکلہ کہا جاتا ہے۔ سنا ہے کہ بڑے خاں کے چکلے میں علما رہتے تھے اور علما کی بادن پالکیاں اس محلہ سے نکلتی تھیں۔ اسی محلہ میں سورت کی مشہور شخصیت منشی لطف اللہ فریدی کی بھی حویلی ہے۔ حویلی اچھی حالت میں اب تک موجود ہے۔

مرزا عاشورہ بیگ بھی عالمگیر کے امرا میں سے تھے۔ یہ بھی فریضہ حج ادا کرنے کے بعد سورت آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ انھوں نے بھی قلعہ کے قریب حویلی تعمیر کرائی تھی اور اب تک یہ علاقہ عاشور بیگ کے چکلہ کے نام سے مشہور ہے۔ عاشور بیگ کا مرزا مغل نامی ایک بیٹا تھا۔ مرزا مغل نے تین شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیگم بارہ قلعہ دار کی بیٹی تھیں۔ ان کے بطن سے ایک لڑکی حسینی خانم تھیں۔ حسینی خانم کی شادی ملا خاندان میں ملا عبدالوہاب بن مفتی ملا محمد علی سے ہوئی تھی۔ عبدالوہاب کی اولاد میں دو بیٹیاں نجم النسا، قمر النسا اور ایک بیٹا محمد علی تھے۔ محمد علی نے عین جوانی میں انتقال کیا۔ نجم النسا کی شادی منشی فضل اللہ بن منشی لطف اللہ فریدی اسسٹنٹ کلکٹر ڈسٹرکٹ سے ہوئی تھی اور قمر النسا کی شادی حکیم سید قمر الدین قادری (راقم کے نانا صاحب) سے ہوئی تھی۔ مرزا مغل کی دوسری بیگم سے تین بیٹیاں نولاسی خانم، امراؤ خانم اور حاجی خانم تھیں۔ نولاسی خانم اور حاجی خانم کی شادی بھروچ کے نواب صاحب کے بیٹوں نواب مرزا قلندر خاں اور نواب مرزا جہانگیر خاں سے ہوئی تھی۔ تیسری بیگم

سے مرزا مغل کے ایک بیٹا مرزا جلال بیگ عرف مرزا جانی تھے۔ ان کے اولاد نہیں تھی۔ مرزا مغل کی پہلی بیگم کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ موصوفہ منشی فضل اللہ کی نانی ساس تھیں اکثر کہا کرتی تھیں کہ ہم قلعہ میں رہتے تھے اور جب یہ پیدا ہوئیں تو قلعہ دار کی بیٹی ہونے کی وجہ سے گیارہ یا اکیس توپیں سر کی گئی تھیں۔ انھوں نے بہت طویل عمر پائی تھی۔ کہتی تھیں کہ پیدا ہوئی اس وقت تو توپیں خوشی میں سر کی گئی تھیں۔ مرنے کے وقت نہ جانے کیا ہوگا۔ منشی فضل اللہ صاحب ریاست رادھنپور میں دیوان تھے کہ اتفاق سے بیمار ہو گئے۔ بیماری تشویشناک تھی لہٰذا سورت سے قریبی عزیز رادھنپور گئے۔ ان میں فضل اللہ صاحب کی نانی صاحبہ بنت قلعہ دار بھی گئیں۔ جب سورتی قافلہ رات کو رادھنپور دیوان کی کوٹھی پر پہنچا تو سب سے پہلے نانی ساس نے اپنے نواسی داماد کی بلائیں لیں اور کچھ دیر بعد اٹھ کر حمام میں جانے کے لئے ایک دروازہ کھولا اور اندر قدم رکھا ہی تھا کہ باہر نیچے گر پڑیں۔ دراصل وہ دروازہ باہر کی طرف گلی میں پڑتا تھا۔ ضعیفہ کو اٹھالائے اور ہر چند ڈاکٹروں نے کوشش کی مگر جانبر نہ ہوئیں۔ چونکہ وہ دیوان صاحب کی نانی ساس تھیں اس لئے جنازہ اٹھنے کے وقت گیارہ توپیں سر کی گئیں۔ عزت و ذلت کا دینے والا اللہ ہے۔ برار کے قلعہ دار کے ایک بیٹے حسام الدین تھے۔ ان سے ملا عبدالوھاب کی بہن بیاہی گئی تھیں۔ حسام الدین کی اولاد میں حبیب الدین صدر محاسب حیدرآباد اور ان کے بھائی نعیم الدین تھے۔ نعیم الدین کی تعلیم و تربیت بڑے بھائی حبیب الدین صاحب کے زیر سائی ہوئی۔ نعیم الدین کو نعیم یار جنگ کا خطاب عنایت ہوا تھا اور یہ تعلقدار کے اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ ایک زمانہ میں برار کے گورنر کی حیثیت سے بھی یہ نامزد کئے گئے تھے۔ ان کی اولاد میں یوسف پاشا اور ایک بیٹی پاشا جانی ہیں۔ صرف پاشا جانی بقید حیات ہیں۔ مرزا مغل کی ایک بیٹی امراؤ خانم سے ایک بیٹی خانم بی بی کے نام سے تھیں ان کی شادی راجپور کے قاضی و مشائخ خاندان میں سید نظام الدین سے ہوئی تھی۔ ان کی اولاد بقید حیات ہے۔ خانم بی بی کی ایک بیٹی کی شادی حمید الدین سورتی جمعدار کے منجھلے بیٹے سید بدر الدین سے ہوئی ہے۔ (راقم کے منجھلے بھائی) اور دوسری بیٹی کی شادی حکیم سید قمر الدین قادری کے پوتے ڈاکٹر سید سعید الدین بن سید جلال الدین قادری سے ہوئی ہے۔

باعکظہ خاندان

اس خاندان کے بزرگ عبدالاحد عربستان کے باعکظ قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ عبدالاحد شاہ عبداللہ تجمد متوفی ۱۲۰۰ھ کے شاگردوں میں سے تھے۔ موصوف بھروچ میں عہدۂ قضاۃ پر فائز تھے۔ ۱۸۱۰ء/ ۱۲۲۵ھ میں بمقام سورت ان کا انتقال ہوا۔ شیخ عبدالاحد کے چار فرزند شیخ عبدالقادر، شیخ عبدالرحمٰن عرف میٹھا صاحب، شیخ ابومیاں اور شیخ محمد ابراہیم عرف معلم صاحب تھے۔ شیخ ابومیاں نے ۱۸۲۶ء ۱۲۴۲ھ میں انتقال کیا۔ شیخ عبدالرحمٰن نے حیدرآباد میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ان سے دو فرزند شیخ حسن اور شیخ محمد تھے۔ شیخ کی اولاد میں تین بیٹے تھے جنھوں نے حیدرآباد میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ شیخ عبدالقادر اجداد کی طرح علوم عقلی و نقلی میں دسترس رکھتے تھے خصوصاً فقہ شافعی میں طولیٰ رکھتے تھے۔ عبدالقادر کے فرزند شیخ محمود بھی سورت کے علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ موصوف کا انتقال ۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ میں ہوا۔ ان کے پس ماندوں میں تین بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ ایک فرزند شیخ احمد عالم فاضل تھے۔ شیخ احمد کے دو بیٹے شیخ محمود اور شیخ عبدالقادر تھے۔ ان میں سے شیخ عبدالقادر کے چار فرزند شیخ علی، شیخ حسن، شیخ ابراہیم اور شیخ عبدالرحمٰن تھے۔ شیخ علی مدت دراز تک سلطان مکہ کے ایجنٹ کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے۔ شیخ علی نے سورت کی سماجی مذہبی اور اصلاحی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ حکومت برطانیہ میں بھی ان کی عزت تھی۔ انھیں خان بہادر کا خطاب بھی عنایت ہوا تھا۔ موصوف نے بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔

ان کے دو فرزند ہیں۔ عبدالواحد پاکستان میں سٹیٹ بنک میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں اور دوسرے بیٹے عبدالماجد بمبئی میں تجارت کرتے تھے۔ شیخ علی کے بھائی شیخ حسن سورت میں کاشتکاری کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۷۱ء میں وفات پائی۔ موصوف کے دو بیٹے بقید حیات ہیں۔ ان کی دو بیٹیوں کی شادی سورت کے عبدالصمد گولنداز کے بیٹوں محمد حفیظ بی۔ اے اور عبدالقادر بی۔ اے سے ہوئی ہیں۔ عبدالرحمٰن مغل لائن (جہاز کمپنی) میں تھے اور منیجر کی حیثیت سے خدمت انجام دینے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں بمبئی میں انتقال کیا۔ موصوف بہت ہی ملنسار، خلیق اور یار باش شخص تھے۔ وفات سے ایک سال قبل فریضہ حج بھی ادا کیا تھا۔ موصوف کثیر الاولاد تھے۔ ان کے بیٹے سعودی عرب، کویت، بحرین، پاکستان وغیرہ میں بہ سلسلہ ملازمت

سکونت کرتے ہیں۔

مولوی محمد ابراہیم عرف معلم صاحب بن عبدالاحد صاحب اپنے زمانہ کے جید علماء میں شمار کئے جاتے تھے۔ موصوف نے بمبئی کی جامع مسجد کے خطیب اور مدرسہ محمدیہ کے صدر معلم کی حیثیت سے خدمت انجام دی ہے۔ ان کے کئی شاگردوں نے علم و فضل میں بلند درجہ حاصل کیا تھا۔ فقہ شافعی میں تحفۃ الاخوان اور نعم الانتباہ ان کی تصانیف ہیں۔ ۲۷ رجب المرجب کو ۱۸۹۹ء/ ۱۲۸۴ھ میں بمقام سورت انتقال کیا۔ سید علی عید روس (چھوٹا عید روس) کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا ہے۔ مولوی ابراہیم صاحب کے چار بیٹے شیخ علی متوفی ۱۸۵۲ء/ ۱۲۶۹ھ، شیخ عبدالحمید متوفی ۱۸۹۱ء/ ۱۳۰۸ھ، شیخ عبدالعزیز اور شیخ عبدالمنعم متوفی تھے۔ شیخ علی کے فرزند شیخ صالح سرکاری مدرسہ میں مدرس تھے۔ انہیں خوش نویسی میں مہارت حاصل تھی۔ عبدالحمید اپنے والد کے بعد جامع مسجد بمبئی کے خطیب اور مدرسہ محمدیہ کے معلم مقرر کئے گئے تھے۔ ان کے فرزند عبدالحافظ تھے۔ عبدالحافظ کے دو بیٹے عبدالمجید اور عبدالعزیز بقید حیات ہیں۔ عبدالعزیز بن مولوی ابراہیم بھی عبدالحمید کے بعد جامع مسجد کے خطیب مقرر کئے گئے تھے۔ موصوف طب میں مہارت رکھتے تھے۔ مطب بھی کرتے تھے۔ شیخ محمد عرف عبدالمنعم نے بھی عرصۂ دراز تک جامع مسجد بمبئی میں بطور خطیب خدمت انجام دی تھی۔ شیخ بہادر نے اپنی تالیف حقیقت السورت انہیں کے ایما سے تیار کی تھی۔ عبدالمنعم صاحب کے ایک صاحبزادہ عبدالمعید عرف معلم صاحب سندھیا جہاز کمپنی میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے موصوف ریٹائر ہونے کے بعد پاکستان چلے گئے۔ منعم صاحب کے دوسرے صاحبزادہ عبدالرشید بمبئی کے کامیاب وکلا میں سے تھے۔ جوانی میں انتقال کیا۔

حکیم میر علیسٰی کا خاندان

حکیم میر علیسٰی کے بزرگوں نے عہد مغلیہ میں شاہی اطبا کی حیثیت سے خدمت انجام دی تھی۔ اس خاندان کے ایک بزرگ خواجہ بدر نواب حفیظ الدین یا نواب نظام الدین کے عہد میں دہلی سے سورت آئے۔ نواب کے دربار میں باریابی کے بعد انہیں سورت سے متصل کتارگاؤں میں پیاس یا پچاس کی باڑی میں رہائش کے لیے جگہ دی گئی تھی۔ خواجہ بدر کے بعد ان کے بیٹے میر علیسٰی شاہی طبیب مقرر ہوئے تھے۔ میر علیسٰی حاذق طبیبوں میں سے تھے۔

میر عیسٰی کی تصانیف اجازات عیسوی (سات جلدوں میں) اختراعات براکلوس کا فارسی ترجمہ اور منہاج العلاج ان کے خاندانی کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ میر عیسٰی کی شادی نواب نظام الدین کے بھائی نواب نصیر الدین متوفی ۱۸۲۱ء/ ۱۲۳۶ھ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ میر عیسٰی نے ۱۸۶۸ء/ ۱۲۸۵ھ میں وفات پائی۔ میر عیسٰی کے بیٹے میر بدرالدین بھی طبیب تھے۔ موصوف نواب میر جعفر علی خاں کے طبیب خاص تھے۔

۱۸۴۴ء/ ۱۲۶۰ھ میں میر جعفر کے ہمراہ بطور طبی مشیر لندن گئے تھے۔ حکیم بدرالدین نے ۱۸۸۵ء/ ۱۳۰۳ھ میں وفات پائی ان کے بعد ان کے فرزند حکیم میر یاور حسین نے مطب سنبھالا۔ یہ بھی حاذق طبیب تھے۔ موصوف نے چھیالیس سال کی عمر میں ۱۹۱۴ء/ ۱۳۳۲ھ میں انتقال کیا۔ انتقال کے وقت ان کے دونوں بیٹے میر سرفراز حسین اور میر مظہر حسین صغیر تھے۔ حکیم صاحب کی بیٹیاں پانچ تھیں۔ بڑے کنبے کی پرورش غور طلب مسئلہ تھا لہذا موصوف کی اہلیہ نے جو فن طب میں دخل رکھتی تھیں مطب کرنا شروع کیا اور بڑی کامیابی کے ساتھ تا آخر دم ایک طرف خدمت الناس انجام دی اور دوسری طرف کنبہ پروری کی۔ میر سرفراز حسین دہلی سے طب میں سند لے کر آئے اور ۲۱-۱۹۲۰ء میں بزرگوں کی مسند پر بیٹھ گئے۔ میر مظہر حسین ڈاکٹری کے لئے بھیجے گئے تھے۔ ۱۹۳۲ء/ ۱۳۵۱ھ میں ایم بی بی ایس کی سند حاصل کرکے سورت میں مطب کرتے تھے۔

میر یاور حسین کی ایک بیٹی حفیظہ بیگم کی شادی سید فیاض الدین بن سید امین الدین رفاعی سے ہوئی تھی۔ دوسری بیٹی خدیجہ بیگم بڑودہ کے رفاعی خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔ تیسری بیٹی مرزا آفتاب بیگ کے فرزند سے بیاہی گئی تھیں، چوتھی کریم النسا کی شادی میر تیغ بر خان سے ہوئی تھی۔ پانچویں بیٹی حسینی بیگم کی شادی بمبئی کے حکیم عبدالاحد سے ہوئی تھی۔ سرفراز حسین اور مظہر حسین کی شادی سید نثار حسین شیعی (منشی فضل اللہ کے داماد) کی بیٹیوں سکندر بیگم اور فریدہ بیگم سے ہوئی تھی۔ مظہر حسین نے ۱۹۳۵ء/ ۱۳۵۴ھ میں وفات پائی۔ مرحوم کے چار بیٹے میر خالد حسین، میر دلاور حسین، میر نیاز حسین اور میر بدرالدین اور تین بیٹیاں ہیں۔ خالد حسین طب میں سند حاصل کرکے اپنے بزرگوں کی مسند پر بیٹھ گئے ہیں۔ دوسرے بھائی بہن پاکستان ہجرت کر گئے۔ میر سرفراز حسین نے پچاس سال کی عمر میں ۱۹۴۶ء/ ۱۳۶۶ھ میں وفات پائی۔ موصوف نہایت اونچا علمی ادبی ذوق رکھتے تھے۔

انہیں اپنے فن میں بھی بلند درجہ حاصل تھا۔ ۳۲-۱۹۳۱ء میں سید حمید الدین سورتی جمعدار نے قومی خدمت کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ موصوف مسلم لیگ کے بڑے وفادار کارکن تھے۔ انجمن ترقی اردو کے بھی صدر کی حیثیت سے رہنمائی کرتے رہے۔ میونسپلٹی میں کاؤنسلر بھی تھے۔ موصوف کو شفاالملک کا خطاب بھی عنایت ہوا تھا۔ ان کی اولاد میں ایک بیٹا یاور حسین اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ بیٹا گیارہ سال کی عمر میں اللہ کو پیارا ہوگیا۔ بیٹیاں پاکستان میں ہیں۔ دوسری بیوی سے ایک بیٹی سورت میں طبی سند حاصل کرکے مطب کرتی ہے۔

حکیم شیخ محمد میاں

شیخ محمد میاں صاحب خلف میاں احمد سورت کی پٹنی جماعت کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ موصوف ۱۸۵۰ء/۱۲۶۷ھ میں بمقام سورت پیدا ہوئے۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد سورت میں حکیم عبدالرزاق صاحب رامپوری سے طب سیکھی اور ۱۸۷۵ء/ ۱۲۹۲ میں ذاتی مطب کھولا اور تقریباً ۲۵ سال خدمت الناس انجام دیکر ۱۹۱۱ء/۱۳۲۹ھ میں انتقال۔ شیخ صاحب سورت کے حاذق طبیبوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ حکیم صاحب کی آواز بہت باریک تھی اس لئے شہر میں عام طور پر ان پڑھ طبقہ میں حکیم چی چی کے نام سے مشہور ہوگئے تھے۔ یہ نام اتنا مقبول ہوکہ آج تک ان کا خاندان اور خاندان کا کاروبار چی چی کے نام کر پہچانا جاتا ہے۔ حکیم عبدالرزاق کے توسط سے شیخ محمد میاں کے منشی میاں داد خاں سیاح سے بھی دوستانہ مراسم قائم ہوگئے تھے۔ یہ تعلق اتنا پُرخلوص اور مضبوط تھا کہ سیاح پر برے وقت پڑا تو شیخ محمد میاں نے بہت خوش اسلوبی سے حق رفاقت ادا کیا۔ موصوف نے سیاح کو رہائش کے لئے اپنے ہی مکانوں میں سے ایک مکان بمقام رانی تلاؤ دیا تھا اور ہر ممکن طریقہ پر منشی صاحب کا خیال رکھتے تھے۔ محمد میاں صاحب کے چار بیٹے الحاج حکیم محمد قاسم۔ محمد حسین۔ حافظ غلام محمد اور محمد اعظم ہیں۔

حکیم محمد قاسم صاحب کا سنہ ولادت ۱۸۹۳ء/۱۳۱۱ھ ہے۔ سورت میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی طبیہ کالج سے سند حاصل کی۔ مسیح الملک اجمل خاں صاحب کے شاگردوں میں سے تھے۔ موصوف سورت میں آبائی مطب میں بیٹھے اور تقریباً تیس سال

بڑی خوش اسلوبی سے خدمت الناس انجام دینے کے بعد ۱۹۴۳/۱۳۵۹ھ کے بعد سے عرصۂ دراز تک بطور کنسلٹنٹ خدمت انجام دیتے رہے۔ اللہ نے ہاتھ میں شفا اور زبان میں مٹھاس دی تھی لہذا افریقہ، برما، لندن وغیرہ دور دراز ملکوں کے لوگ بھی ان سے فیضیاب ہوتے رہے ہیں حکیم صاحب نے سورت میں ایک فارسی دواخانہ قائم کی ہے جو جی جی فارسی کے نام سے اپنی ساکھ قائم کر چکی ہے۔ حکیم صاحب کو طب میں تلاش و تحقیق سے خاص لگاؤ تھا۔ روزانہ کئی گھنٹے اپنی تجربہ گاہ میں صرف کرتے مفردات میں ید طولیٰ رکھتے تھے حکیم صاحب نے اس فن شریف کی علمی عملی خدمات انجام دیکر ۱۹۶۶ء/۱۳۸۶ھ میں بعمر ۶۳ سال انتقال کیا۔

شیخ محمد میاں کے تیسرے بیٹے حافظ غلام محمد کو میاں داد خان سیاح کی اہلیہ عارفی بی نے متبنیٰ لیا تھا۔ اس وقت حافظ صاحب فارسی کے انتظامی امور کی نگرانی کرتے ہیں۔ موصوف کو بڑے بڑے لوگوں کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے۔ عہد جوانی میں ہیں کہ موسیقی کا شوق تھا عرصہ ہوا تائب ہو گئے ہیں اور حتی الامکان دینی و قومی خدمات انجام دیتے رہتے ہیں چوتھے بیٹے جناب محمد اعظم بھی فارسی کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کرتے ہیں دوسرے بھائی محمد حسین صاحب کے صاحبزادہ محمد صدیق ایم۔ ڈی ہیں جنھوں نے خاندان کی طبی خدمت کی روایت کو قائم رکھا ہے اور مطب کرتے ہیں۔ اس وقت ان بھائیوں کی اولاد اور اولاد کی اولاد فارسی سنبھالے ہوئے ہے۔

منشی لطف اللہ کا خاندان

لطف اللہ بن محمد اکرم فاروقی دھارانگر کے مشائخ سے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب پندرہ واسطوں سے شیخ فریدالدین گنج شکر اور بارہ واسطوں سے شاہ کمال الدین مالوی تک پہنچتا ہے۔ شاہ کمال الدین سلطان محمد خلجی کے استاد اور مرشد تھے۔ شاہ کمال الدین کے انتقال کے بعد سلطان نے اپنے استاد و مرشد کا مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ مقبرہ کے ساتھ خانقاہ بھی تعمیر کرائی گئی تھی۔ اور ان کی اولاد کے لئے کئی گاؤں بطور وظیفہ وقف کر دیئے تھے۔ لیکن ۱۷۰۶ء میں مرہٹہ گردی کی وجہ سے تمام وظیفے تلف ہو گئے۔

منشی لطف اللہ بتاریخ ۷ رجب ۱۲۱۷ھ مطابق ۴ نومبر ۱۸۰۲ء میں بمقام دھار (مالوہ) پیدا ہوئے۔ ابھی چار سال کی عمر تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ لطف اللہ اور سب دو گی

خانقاہ کے حقدار تھے مگران کے چھوٹے چچا لطف اللہ کے سن شعور کو پہنچنے تک خانقاہ اور دوسرے امور کی نگرانی کرتے تھے۔ لطف اللہ کے چچازاد بھائی ان سے از روئے حسد اکثر ضرر پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے چچازاد بھائی انہیں نہانے کے بہانے سے تالاب پر لے گئے اور انہیں پانی میں غرق کر دینے کی کوشش کی یہ تماشا ایک برہمن دیکھ رہا تھا اس نے بروقت لطف اللہ کو ڈوبنے سے بچالیا اور اپنے ساتھ لطف اللہ کے گھر لے جاکر تمام واقعہ بیان کر دیا۔ ان کی والدہ نے بچہ کی جان ہمیشہ خطرہ میں پاکر اپنے بھائی کے ہاں سکونت اختیار کرلی۔

قریب چھ سال کی عمر میں انہیں مکتب میں بٹھلایا گیا۔ آٹھ سال کی عمر میں تو قرآن پاک حفظ کرلیا تھا اور تین سال کی مدت میں بعض دینی علوم بھی پڑھ لئے تھے۔ ان کی والدہ کا نکاح ثانی کسی صوبیدار سے ہوا تھا لہذا دھار سے اجین چلے گئے تھے اور گوالیار میں بھی قیام رہا۔ لطف اللہ کے سوتیلے باپ صوبیدار کا سلوک ان سے کچھ اچھا نہیں تھا۔ اس بات نے انہیں گھر سے بھاگ نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایسے ابتدا ہی سے لطف اللہ بڑے من چلے اور دھن کے پکے تھے ایک دفعہ کوئی مہمان ان کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ لطف اللہ نے نہ جانے کیوں ان کی داڑھی جلادی تھی۔ جب مکتب میں ان کے استاد کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اپنی داڑھی کی خیر منانے کا خیال سے لطف اللہ کو بہت مارا پیٹا۔ ایک روز استاد کی شامت آئی کہ ان سے قہوہ منگوایا۔ لطف اللہ نے موقع کو غنیمت جان کر انتقام اس طرح لیا کہ قہوہ میں جمال گوٹہ ملا دیا جس کو پینے کے بعد استاد کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی۔ ایسے اساتذہ کی یہی سزا ہوتی ہے جو بچہ کی نفسیات سے واقف نہیں ہوتے اور مار پیٹ کی سزا کو راہ راست پر لانے کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ایک دفعہ اجین میں افغانوں کا ایک قافلہ نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ لطف اللہ سمجھے کہ یہ افغان تاجر ہیں۔ انھوں نے دکن جانے کی لالچ میں ان کے سردار سے ملکر ساز باز کی اور ان کے ساتھ ہو لئے آگے چل کر انہیں معلوم ہوا کہ وہ ڈاکوؤں کا گروہ تھا اور پہاڑوں کے چھپے مقامات پر رہتے ہیں لطف اللہ بھی ان کے ساتھ کئی مہینے پہاڑوں میں رہے۔ لطف اللہ اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ وہ روزانہ ایک کنویں پر جاتے وضو کرتے نماز ادا کرتے اور اللہ سے نجات کی دعا مانگتے۔ آخر ایک روز افغانوں نے بھیل ڈاکوؤں کو دعوت طعام دی جہاں دونوں

گروہوں میں جنگ ہونے لگی۔ اس افراتفری میں لطف اللہ وہاں سے بھاگ نکلے اور اپنے گھر آ گئے۔ اسی طرح ایک دفعہ کسی شہر سے دور کسی ویران مسجد میں رات بسیرا تھا کہ وہاں اس زمانہ کا مشہور جمعہ ڈاکو آ گیا تھا۔ رات کو اس نے انہیں اٹھایا اور اپنے پاس سے برتن اور غلہ وغیرہ دیکر کھانا پکانے کو کہا۔ لطف اللہ نے یہ خدمت انجام دی اور اپنی انگلی پر چاقو سے شگاف بھی دیدیا تاکہ انہیں نیند نہ آئے۔ جمعہ ٹھگ کھانا کھا کر سو گیا لطف اللہ صبح سویرے وہاں سے بھاگ نکلے اور قریب کے شہر یا قصبہ میں جا کر اطلاع کر دی اور سپاہیوں نے آ کر اسے قید کر لیا اس سلسلہ میں انہیں انعام بھی ملا تھا۔ اس طرح کئی بار لطف اللہ فکر معاش میں گھر چھوڑ کر گئے اور واپس آئے۔ آگرہ میں ایک طبیب کے سایۂ عاطفت میں پانچ سال مدرسے میں تعلیم حاصل کی اور فن طب میں بھی مہارت حاصل کر لی آگرہ سے ۱۸۱۷ء میں گوالیار اور گوالیار سے اندور پہنچے جہاں ان کی والدہ کو بیمار پایا۔ والدہ کو لطف اللہ دھار لے گئے جہاں ان کا انتقال ہو گیا۔ والد کے انتقال کے بعد انہیں آزادی مل گئی تھی۔ دھار میں ان کے ایک دوست نجف علی خاں نے انہیں پندرہ روپیہ تنخواہ پر پوسٹ آفس میں کلرک کی اسامی دلوادی تھی اس جگہ انہیں انگریزوں سے ربط و تعلق کے موقعے مل گئے۔ انگریز فوجی افسروں کو یہ ہندوستانی فارسی وغیرہ پڑھاتے تھے اور ان سے انگریزی سیکھتے تھے فوجی دستوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی سندھ، کچھ، مانڈوی وغیرہ مقامات کا سفر کیا ایسے ہی گھومتے پھرتے ۱۸۲۱ء میں لطف اللہ گھوگا سے سورت آئے اور موجودہ گاندھی باغ کے قریب ایک مسجد میں رات بسیرا کیا۔ صبح انھوں نے دف کی آواز سنی اور علم وغیرہ جاتے ہوئے دیکھے تو وجہ دریافت کی۔ ان سے کہا گیا کہ آج سورت کے نواب نصیر الدین کا انتقال ہو گیا ہے۔ کچھ دن قیام کر کے یہ پھر بڑودہ ہوتے ہوئے دھار لوٹ گئے مگر پاؤں میں چکر تھا۔ ۱۸۲۳ء میں دوبارہ سورت آئے سورت سے بمبئی بمبئی سے پونا ستارا گئے۔ ستارا میں پانچ چھ سال رہے اور فوجی افسروں کو ہندوستانی سکھلانے کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ستارا میں ۱۸۲۴ء میں انھوں نے ایک میمن عورت سے نکاح کر لیا تھا۔ ستارا سے ۱۸۲۸ء میں لطف اللہ سورت آئے۔ سورت میں لطف اللہ نے جب یہ دیکھا کہ شہر سورت میں علم و ادب کا اچھا خاصہ چرچا ہے اور ایک سے ایک بلند درجہ عالم شہر میں موجود ہے۔ لطف اللہ عربی سے اس وقت تک نابلد تھے اور علما کی صحبتوں سے مستفید ہونا ان کے لیے مشکل تھا لہذا ایک عالم

شیخ تاج الدین سے قلیل مدت میں عربی سیکھ لی اور اسی اثنا میں حکیم میر علی سے علم طب بھی حاصل کرتے رہے۔ اتفاق سے انہیں انگریز فوجی رجمنٹوں کے ساتھ جانا پڑا اور یہ شولا پور، اجمیر وغیرہ مقامات کا سفر کرتے ہوئے ۱۸۳۲ء میں سورت لوٹے۔

۱۸۳۵ء میں نواب میر افضل الدین خان کی سرکار میں بطور سکریٹری منسلک ہوئے لیکن یہ سلسلہ سات آٹھ ماہ سے زیادہ قائم نہ رہا۔ ۱۸۳۸ء میں لطف اللہ نے پھر رخت سفر باندھا اور کاٹھیاواڑ کے چند شہروں کی سیر کرتے ہوئے سندھ پہنچے جہاں انہیں سندھ کے امیروں کے ہاں باریابی حاصل ہو گئی اور ۱۸۳۹ء میں سورت واپس آ گئے۔ سورت میں بڑودہ کے میر سرفراز علی کے فرزند کے اتالیق مقرر ہوئے۔ ۱۸۴۴ء میں نواب جعفر علی کا وظیفہ کمپنی کی طرف سے موقوف کر دیا گیا لہٰذا نواب صاحب اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لئے لندن گئے۔ نواب کے ساتھ لطف اللہ بطور مشیر اور حکیم بدر الدین بطور طبیب گئے تھے۔ لطف اللہ نے اس سفر کا حال اپنی سوانح حیات میں بہت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ قاہرہ کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک جگہ گدھوں پر سواری کا موقع آیا۔ نواب میر جعفر بہت لحیم شحیم شخص تھے انھوں نے خیال کیا کہ گدھا ان کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔ میر جعفر علی نے دونوں ہاتھوں سے گدھے کو اٹھا لیا اور کہا کہ بتاؤ یہ گدھا میرا بوجھ کیسے اٹھائے گا۔ آخر کسی جگہ سے ان کے لئے خچر لایا گیا۔ قاہرہ میں محمد علی پاشا سے بھی انہیں شرف ملاقات حاصل ہوا تھا۔ لندن میں مقدمہ پیش ہو جانے کے بعد دسمبر ۱۸۴۴ء میں سورتی قافلہ سورت لوٹ آیا۔ ۱۸۴۷ء میں لطف اللہ کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا اس کے چھ ماہ بعد انھوں نے نکاح ثانی ولایتی خانم سے کیا۔ میر اکبر علی کی بیگم نجیب النساء نے ایک منگلانی بچی کو متبنیٰ لیا تھا اور اس کا نام ولایتی خانم رکھا تھا۔ یہ نکاح قران السعدین ثابت نہ ہوا۔ لطف اللہ کی اولاد میں تین بیٹے اور بیٹیاں تھیں۔ دو بیٹے قدرت اللہ اور ولی اللہ چھوٹی عمر میں انتقال کر گئے۔ تیسرے بیٹے فضل اللہ سے انہیں بے حد محبت تھی۔ اور ان کی تعلیم و تربیت میں لطف اللہ نے بطور خاص دلچسپی لی تھی لطف اللہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے علوم فنون، سیاست وغیرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ راقم کو ان کی تصویر دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ یہ بڑے وجیہہ شخص تھے۔ باہر ان کی بڑی عزت و توقیر تھی مگر ازدواجی زندگی دکھوں سے بھرپور گذری۔

لطف اللہ کو عربی، فارسی، گجراتی، مرہٹی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ سندھی میں

سندھی بھی سیکھ لی تھی اور مالوہ وطن ہونے کی وجہ سے ہندی، راجستھانی وغیرہ بھی جانتے تھے۔ یہ خوش نویسی فن سے بھی خوب آگاہ تھے۔ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یٰسین راقم کے پاس محفوظ ہے۔ اُردو میں ان کے دو رسالے ملتے ہیں۔ ایک کا نام فوائدُ العجائب ہے۔ یہ مسٹر کاکس کے رسالہ کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس میں موصوف نے اضافے بھی کئے ہیں۔ دوسرا مرض ہیضہ سے تعلق رکھتا ہے[1] موصوف انگریزی زبان پر بہت قدرت رکھتے تھے۔ انگریز افسران کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے لطف اللہ تمہارے باپ یا ماں کوئی ضرور انگریز ہوں گے اسی لئے اتنی شستہ و بامحاورہ زبان بولتے ہو۔ انگریزی میں انھوں نے اپنی سوانح عمری لکھی ہے۔ ان کے ایک شاگرد کپتان ایسٹ وِک نے ۱۸۵۸ء میں یہ بیاگرافی لندن سے شائع کی ہے مگر اس میں بعض حصے حذف کر دیئے گئے ہیں۔ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی سوانح عمری محفوظ ہے۔ اس پر جان شکسپیر نے دستخط کئے ہیں۔ شکسپیر سے لندن میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ منشی لطف اللہ کا سال وفات معلوم نہ ہو سکا۔ موصوف ۱۸۷۴ء میں بقیدِ حیات تھے۔ ان کے فرزند فضل اللہ صاحب بھی بہت قابل و لائق شخص تھے۔ انہیں خان بہادر کا خطاب بھی ملا تھا۔ یہ دھرم پور رادھنپور ریاستوں میں بطور دیوان خدمات انجام دے چکے تھے اور اسسٹنٹ کلکٹر کسٹم کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ فضل اللہ صاحب نے مرآت سکندری کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ بمبئی گزیٹر کے مرتب کرنے میں بھی ان کا بیشتر حصہ ہے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے مسلم گجرات کے نام سے ایک تصنیف یادگار چھوڑی ہے۔ وہ بہت حلیم الطبع تھے اور ایسی انسانی خوبیوں کے مالک تھے کہ انہیں فرشتہ کہا جاتا تھا۔ ہمیشہ اپنے والد کی طرح نماز روزہ کے پابند رہے۔ ۱۹۰۴ء میں بمقام بمبئی انتقال کیا۔

فضل اللہ صاحب کی شادی نجم النسا بنت ملا عبدالوہاب راقم کی والدہ کی خالہ سے ہوئی تھی۔ ان کے اولاد نرینہ نہیں تھی۔ تین بیٹیاں شمس النسا رضیہ سلطانہ اور ثریا بیگم تھیں شمس النسا کی شادی خان بہادر سید نثار حسین شعیبی بہاری سے ہوئی تھی۔ ان سے چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ پورا خاندان پاکستان میں ہے۔ رضیہ سلطانہ کی شادی بڑودہ کے مرزا آصف علی بیگ (ملتانی والے) سے ہوئی تھی۔ ان سے ایک بیٹا مرزا اسد اللہ بیگ اور دو بیٹیاں شمیم سلطانہ اور قیصر سلطانہ ہیں۔ اسد اللہ کی شادی قدسیہ بیگم بنت

[1] یہ اطلاع قاضی عبدالودود بار ایٹ لا پٹنہ سے حاصل ہوئی ہے

نثار حسین سے ہوئی ہے۔ شمیم سلطانہ کی شادی سید معروف بن نثار حسین سے ہوئی ہے۔ ان کے دو بیٹے پاکستان میں فوج میں ملازم ہیں۔ قیصر سلطانہ کی شادی بھوپال میں ہوئی تھی۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی بیٹیاں پاکستان میں ہیں۔

سید نثار حسین شعیبی لسندنی

سید نثار حسین صاحب کا اصل وطن صوبہ بہار میں ضلع مونگیر کا موضع اہرہ تھا۔ ان کے والد کا نام سید احمد حسین عرف غلام شعیب بن خدا بخش بن سید اکبر علی تھا۔ سید احمد حسین کے ایک بھائی سید محمد شفیع تھے۔ احمد حسین کی اولاد میں سید نثار حسین، سید نور الحسن، سید محمد یسین، مسماۃ زاہدہ، مسماۃ حمید النسا اور مسماۃ کنیز فاطمہ تھیں۔ مسماۃ کنیز فاطمہ کی شادی سید محمد شفیع کے فرزند سید محمد یحیٰی سے ہوئی تھی۔ سید یحیٰی کے فرزند سید حسن پٹنہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔

سید احمد حسین عرف غلام شعیب مختاری کا پیشہ کرتے تھے اور اس سلسلہ میں وہ بھاگلپور میں مقیم تھے بھاگلپور میں غلام شعیب نے دوسری شادی کر لی تھی اس وجہ سے سید نثار حسین صاحب اور ان کے بھائی بہنوں نے ایک مدت تک اپنے ماموں سید خورشید علی داروغہ (محکمۂ پولس) کے زیر سایہ پرورش پائی۔ نثار حسین صاحب نے پٹنہ میں انٹرنس تک تعلیم حاصل کی اور یکایک طبیعت میں پلٹا آیا لہٰذا انگریزی تعلیم ترک کر کے عربی فارسی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کے ماموں نے ہر چند انہیں سمجھایا مگر یہ نہ مانے۔ اس سلسلہ میں ماموں بھانجے کے جو بحث مباحثہ ہوا نثار حسین صاحب نے قلم بند کر لیا تھا مذکورہ مباحثہ پروفیسر سید حسن صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ نثار حسین صاحب کے ماموں سید خورشید علی صاحب کو یہ بات ناگوار گذری لہٰذا بچوں کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ان حالات میں جب گذر اوقات مشکل ہو گئی تو نثار حسین نے پرائیویٹ ٹیوشن کو روزی کا ذریعہ بنا لیا اس کے باوجود وطن میں ماحول ناسازگار پایا تو موصوف تلاش معاش میں بمبئی آ گئے۔

نثار حسین صاحب کو اپنی ازلی فطرت کے جوہر اور صلاحیت و لیاقت کے اظہار کا بمبئی میں موقع مل گیا موصوف ۱۸۹۵ء سے کچھ پہلے بمبئی آئے اور کالج کے طلبا کے لئے

فارسی کا کلاس کھول دیا۔ اس کلاس سے انہیں کافی آمدنی ہو جاتی تھی۔ نثار حسین صاحب کے قیام بمبئی کے دوران بہار کے ایک امیرزادہ (حسن امام یا کچھ ایسا ہی نام تھا) بہ سلسلۂ تعلیم لندن جا رہے تھے۔ بمبئی میں نثار حسین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ برسبیل تذکرہ نثار حسین صاحب لندن جانے کی اپنی آرزو کا ذکر کیا۔ امیرزادہ نے تمکنت سے سادہ لوحی سے جواب دیا کہ نثار لندن میں تم کیسے رہ سکتے ہو وہاں تو دولت مند گذر بسر کر سکتے ہیں۔ نثار حسین صاحب کو یہ بات چاٹ گئی جوان کی عین فطرت کے مطابق تھی اتفاق دیکھئے کہ اس واقعہ کے بعد لکھنؤ کی بیگمات سے اپنے مقدمہ کے سلسلے میں کسی انگریزی داں کو بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔ یہ موقع نثار حسین صاحب کو مل گیا۔ راقم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ بیگم صاحبہ اپنے ہاتھ کی ایک پہنچی دیدی اور کہا کہ زادِ راہ کے لئے میرے پاس صرف یہ ہے۔ نثار حسین صاحب نے اس پہنچی کو فروخت کیا اور مقدمہ کی پیشی کے لئے لندن گئے۔ لندن جا کر سب سے پہلے مذکورہ امیرزادہ کو سلام کیا اور کہا کہ جناب! لیجئے میں آ گیا اور اب درس و تدریس کی خدمت انجام دے کر جب تک چاہوں گا لندن میں قیام کر سکوں گا اس کے برخلاف آپ کے پاس پیسہ ختم ہوگا اور آپ کو چلے جانا ہوگا۔ غرض یہ لندن گئے اور وہاں سے سال چھ مہینہ میں واپسی پر دوبارہ فارسی کلاس کھول دیا۔ اس سفر لندن کی وجہ سے بمبئی میں نثار حسین صاحب لندنی کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔

۱۸۹۸۔۹۹ء کا زمانہ تھا۔ سیاسی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ نثار حسین صاحب نے موقع کو غنیمت جان کر انگریزی اخباروں میں حکومت کی بعض پالیسیوں پر اعتراضات کرنا شروع کیا۔ ایسے مضامین کسٹم کلکٹر مسٹر کیمپبل کی نظر سے گذرے۔ مسٹر کیمپبل اس عہد کی گرامی شخصیتوں میں سے تھے۔ بمبئی صوبہ کے گزیٹر کا ایک حصہ بھی انہیں مسٹر کیمپبل کی نگرانی میں مرتب کیا گیا تھا۔ اس عہد کے انگریز حکومت کے خلاف ہر چھوٹی بڑی بات پر نظر رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں منشی فضل اللہ بن لطف اللہ فریدی اسی محکمہ کسٹم میں اسسٹنٹ کلکٹر تھے اور کیمپبل ان سے بڑی محبت سے پیش آتا تھا۔ فضل اللہ صاحب نے اسی کے ساتھ گزیٹر کا ایک حصہ مرتب کیا تھا۔ مسٹر کیمپبل نے فضل اللہ صاحب سے دریافت کیا: "فضل! یہ کون شخص ہے جو ایسے خطرناک مضامین لکھتا ہے؟" فضل اللہ صاحب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ لہٰذا پولیس سے سرکاری طور پر نثار حسین صاحب کا پتہ حاصل کیا گیا اور کیمپبل نے خط و کتابت

سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب نثار حسین صاحب کیمبل سے ملے تو اس نے نثار حسین صاحب سوال کیا کہ حکومت کے خلاف کیوں ایسے مضامین لکھتے ہو۔ نثار حسین صاحب نے جواب دیا "ہم اپنے حقوق طلب کرتے ہیں اس میں کون سی برائی ہے"۔ ملاقات کے بعد نثار حسین صاحب چلے گئے۔ کیمبل نے فضل اللہ صاحب سے کہا کہ یہ شخص خطرناک معلوم ہوتا ہے اسے اپنے محکمہ میں ملازمت دیدی جائے تو بہتر ہے۔ فضل اللہ صاحب نے اس خیال کی تائید کی اور چند روز بعد انہیں بلا کر محکمہ میں آبکاری انسپکٹر کی جگہ پیش کی گئی نثار حسین صاحب نے اس پیش کش کو منظور کر لیا اس طرح انہیں مستقل ذریعہ معاش ہاتھ لگ گیا۔

فضل اللہ صاحب کو نثار حسین صاحب نے اپنی علمی ادبی لیاقت اور اپنی فراست سے بہت متاثر کیا۔ دونوں کے تعلقات اتنے شیر و شکر ہو گئے کہ کچھ عرصہ کے بعد نثار حسین صاحب نے فضل اللہ صاحب کی کوٹھی پر مستقل قیام اختیار کر لیا۔ نثار حسین صاحب نے کسی کے ذریعہ فضل اللہ صاحب کی بڑی بیٹی شمس النسا کے لئے سلسلہ جنبانی کی۔ مشیت الٰہی دیکھئے کہ شمس النسا کے لئے سچین کے نواب ابراہیم خاں کے ایک بھائی نواب نصر اللہ خاں بار۔ایٹ۔لا کا پیغام آچکا تھا مگر فضل اللہ صاحب نے اپنی بیٹی کی شادی نثار حسین صاحب سے کر دی۔ شادی میں پٹنہ سے کوئی عزیز شریک نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے اس کی اطلاع ہی نہیں دی تھی۔ دو تین سال کے بعد کوئی قریبی عزیز حج بیت اللہ کے قصد سے ممبئی آئے۔ ممبئی میں نثار حسین صاحب کے ساتھ قیام کیا۔ اس عزیز سے فضل اللہ صاحب نے خاندان کے متعلق تفصیلی گفتگو کی تب کہیں نثار حسین صاحب کے متعلق تفصیلات معلوم ہوئیں۔ فضل اللہ صاحب نے اس کے بعد اپنی بیوی اور بیٹی کو شادی کی مبارکباد دی اور کہا کہ آج تک میں سوچتا رہا کہ کس کسی سے بیٹی بیاہ دی ہے مگر اب اطمینان ہوا کہ میں نے اپنی بیٹی اچھے گھر میں دی ہے۔

نثار حسین صاحب کو اپنی ملازمت میں شجاعت و دلیری کے جوہر دکھلانے کا بڑا موقع ملا۔ دوران ملازمت میں یہ عجیب عجیب خطرناک حادثوں سے دوچار ہوئے مگر ہمیشہ کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ انہیں فرائض منصبی کی ادائیگی کے صلہ میں خان بہادر کا خطاب عنایت کیا گیا اور ترقی کرتے ہوئے انھوں نے اسسٹنٹ کلکٹر کا عہدہ حاصل

کر دیا تھا۔ ۲۱۔۱۹۲۰ء میں موصوف اسسٹنٹ کلکٹر کی حیثیت سے بھروچ ضلع میں تھے۔ ایک روز صبح گھوڑے پر سوار ہو کر بغرض تفریح گئے ہوئے تھے کہ راستہ میں فالج کا دورہ پڑا جس نے انہیں اپاہج کر دیا آخر ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر کے مع اہل و عیال سورت آگئے اور منشی فضل اللہ صاحب کی حویلی میں قیام کیا۔ مرض میں افاقہ ہو گیا تھا لکڑی کے سہارے چل پھر سکتے تھے۔ اسی حالت میں تقریباً دو تین سال گذرے آخر ۱۹۲۵ء میں مرض سے ہمیشہ کے لئے نجات پالی۔

نثار حسین صاحب فارسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مولانا روم کی مثنوی کے گویا حافظ تھے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی چند تصانیف ملتی ہیں۔ اخلاق شیبی کے نام سے ایک مختصر سا رسالہ ہے، قسطنطنیہ میں رمضان ایک اور رسالہ ہے۔ ایک جاسوسی ناول کا مخطوطہ راقم کے پاس ہے۔ شاید تجارتی نقطۂ نظر سے یہ لکھا گیا تھا ورنہ موضوع و زبان کے اعتبار سے رسالہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ نثار حسین جسمانی طور پر بھی بڑی جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے۔ پورے چھ فٹ کے قد آور شخص تھے۔ جسم کا باندھا بہت ہی ورزشی اور سڈول تھا۔ آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئی تھیں اور آواز رعب دار تھی۔ تمام عمر گجرات میں کٹی مگر لب و لہجہ اور انداز گفتگو بہاری ہی رہا۔

نثار حسین صاحب کی اولاد میں چار بیٹے سید معروف، سید عبدالرحمٰن، سید بشیرالدین، سید حفیظ الدین اور تین بیٹیاں قدسیہ بیگم، سکندر بیگم اور فریدہ بیگم ہیں۔ قدسیہ بیگم کی شادی خالہ زاد بھائی مرزا اسد اللہ بن مرزا آصف علی بیگ سے ہوئی ہے سکندر بیگم اور فریدہ بیگم شفاالملک حکیم میر سرفراز حسین اور منظہر حسین سے بیاہی گئیں۔ تمام بھائی بہن پاکستان میں ہیں۔ ثریا بیگم کی شادی سید فخرالدین عرف ابوبکر بن محمد حسین عیدروس سے ہوئی تھی۔ سید فخرالدین صاحب کی اولاد میں سید عبدالقادر، سید بدیع الدین پاکستان میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ ان کی بیٹیوں میں سے اکرم النسا کلثوم کلکٹر کراچی سلیم صاحب کی اہلیہ ہیں اور دوسری بیٹی عید روسیہ بیگم کی شادی عبدالرحمٰن بن نثار حسین سے ہوئی تھی ان کا انتقال ہو گیا۔

سورتی جمعدار کا خاندان

راقم الحروف سید ظہیر الدین مدنی اس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ سادات قادریہ کا یہ خاندان دکن سے گجرات آیا۔ اس خاندان کے بزرگ سلاطین بیجاپور اور پیشوا سرکار کی فوجوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے ۱۷۱۹ء/۱۱۲۲ھ میں مرہٹوں نے خاندیس میں سون گڈھ کو صدر مقام بنا کر گجرات اور خاندیس پر حملوں کا آغاز کیا تھا حملوں کا سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا اور اسی عرصہ میں ریاست گائیکواڑ کا قیام بھی عمل میں آیا ان مرہٹہ فوجوں کے ہمرکاب سورتی جمعدار خاندان کے ایک بزرگ سید ولی گجرات آئے تھے۔ سید ولی نے سورت سے قریب کامریج میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس خاندان کو فوجی خدمات کے سلسلہ میں نواگاؤں میں جاگیر بھی دی گئی تھی۔ مذکورہ جاگیر نواب بڑودہ سید نور الدین حسین خاں کی جاگیر کے متصل تھی۔ سید ولی نے طویل عمر میں ۱۷۵۰ء کے لگ بھگ وفات پائی۔ سید ولی کے بیٹے سید جعفر بھی مرہٹوں کی فوجوں میں ملازم تھے۔ سید جعفر کی اولاد میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ سید محمد بن سید جعفر کی شادی بڑودہ کے سلحدار سید عبدالقادر مدنی کی بیٹی بی بی جان سے ہوئی تھی۔

سید عبدالقادر جمعدار علامہ وجیہ الدین گجراتی کے خاندان سے نسبی تعلق رکھتے تھے۔ ان کا نسب نامہ یہ ہے:

سید عبدالقادر جمعدار بن سید نے غلام علی عرف سید ابو بن سید عبدالقادر بن سید ابو بن سید شاہ محمد بن شاہ وجیہ الدین گجراتی۔

۱۷۹۳ء میں سید عبدالقادر گوندراؤ گائیکواڑ کے ہمرکاب پونا سے بڑودہ بعہدۂ سلحدار سردار آئے تھے۔ ان کی کمان میں عرب بیڑہ تھا۔ انہیں پائیگاہ کے خرچ کے لیے امریلی پرانت میں آنکھول گاؤں دیا گیا تھا۔ ان کی اولاد میں ایک فرزند سید ولی الدین اور ایک بیٹی بی بی جان تھیں۔ ۱۷۹۹ء میں احمد آباد مرہٹوں کے قبضہ میں تھا۔ احمد آباد میں آپسی معاہدہ کے مطابق پیشوا اور گائیکواڑ دونوں کا ایک ایک نمائندہ رہتا تھا۔ ۱۷۹۹ء میں پیشوا کے نمائندے ابا شلوکر نے گائیکواڑ کی حویلی پر گولہ باری کر کے جنگ چھیڑ دی۔ بڑودہ سے جو کمک بھیجی گئی اس میں نواب نصیر الدین خاں اور سید ولی الدین اپنے اپنے فوجی دستوں کے

کے ساتھ گئے۔ نواب نصیر الدین اور سید ولی الدین اس جنگ میں شہید ہو گئے۔ دونوں کے مزار گائیکواڑ حویلی کے قریب واقع ہیں۔ سید ولی الدین کی شہادت کے بعد ان کی گھوڑی نے احمد آباد سے بڑودہ تقریباً چالیس میل کا فاصلہ سرپٹ طے کر کے بڑودہ میں جمعدار عبدالقادر کی حویلی کے سامنے بمقام راؤ پورہ پہنچ کر دم توڑ دیا۔ عبدالقادر صاحب نے حویلی کی اوپری منزل سے دیکھا اور سمجھ گئے کہ بیٹا شہید ہو چکا ہے۔ عبدالقادر جمعدار اپنے والد سید ابو کے بعد سورت میں شیخ احمد مدنی کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے لہٰذا عبدالقادر نے سورت میں ۱۷۵۰-۴۸ء سے مستقل اقامت اختیار کر لی تھی اور بڑودہ دربار کے موقع یا ضرورت کی وجہ سے جاتے رہتے تھے۔ اسی لئے وہ سورتی جمعدار کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ بعد میں خاندان اسی نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ عبدالقادر جمعدار نے بزرگوں کے سلسلۂ بیعت و خلافت قائم رکھا تھا اس لئے وہ مدنی بھی کہلاتے تھے۔ عبدالقادر جمعدار نے طویل عمر کے بعد ۱۸۱۲ء/۱۲۲۸ھ میں وفات پائی۔

سید عبدالقادر جمعدار کے اکلوتے بیٹے ولی الدین کی شہادت کے بعد موصوف نے اپنے نواسے سید فخر الدین بن سید محمد کے نام فوجی اسامی، پایگا اور بڑودہ سورت میں واقع تمام جائداد بڑودہ کے نواب کمال الدین کے روبرو ہبہ کر دی۔ سید محمد داماد جمعدار صاحب بھی گائیکواڑ فوج میں سلحہ دار سردار تھے لیکن انھوں نے بڑودہ ریاست کے خلاف ایک شورش میں حصہ لیا تھا لہٰذا یہ معطوب تھے۔ سید فخر الدین کی تین بیویاں اور کئی حرمیں تھیں۔ ان کی اولاد میں سید کمال الدین، سید نصیر الدین، امیر بیگم، نولاسی بیگم اور فقیرہ بیگم تھیں۔ فخر الدین نے ۱۸۵۸ء/۱۲۷۵ھ میں وفات پائی۔

سید فخر الدین کی وفات کے بعد سلحہ داری پٹ، پایگا وظیفہ وغیرہ کو سرکار گائیکواڑ کی جانب سے دونوں بھائیوں کمال الدین اور نصیر الدین میں تقسیم کر دیا گیا۔ پانچ چھ سال کے بعد کمال الدین نے اپنا منصب ترک کر دیا لہٰذا ان کا حصہ ان کے بھائی نصیر الدین کے نام کر دیا گیا۔ کمال الدین نے لاکھوں روپیہ رنگ رلیوں میں صرف کیا یکایک زندگی میں ایک پلٹا آیا اور فقر اختیار کر لیا۔ تقریباً پینتالیس سال کی عمر میں ۱۸۶۶ء/۱۲۸۳ھ کے بعد یہ حیدرآباد دکن چلے گئے۔ حیدرآباد میں افضل الدولہ نظام خامس ان کے بہت معتقد تھے۔ اپنے مرشد کے اہل و عیال کی [illegible]ش کے لئے حویلی عنایت کی تھی اور امور خانہ کی نگرانی اور انتظام

کے لئے ایک منتظم بھی مقرر کر دیا تھا حضور نظام بڑی عزت واحترام سے پیش آتے تھے۔ ہر ہفتہ مرشد کے بچوں کو ہاتھی کی سواری بھیج کر بچوں کو طلب کرتے اور طلائی سکوں سے بھری طشتریاں اپنے ہاتھ سے بچوں کو عنایت کرتے۔ کمال الدین نے تقریباً بانسٹھ سال کی عمر میں بمقام حیدرآباد بہ سنہ ۱۸۸۲ء/ ۱۳۰۰ھ وفات پائی۔

کمال الدین کی تین بیویاں تھیں۔ ایک بیوی سے سید نور الدین اور بیٹی امت اللہ بیگم تھیں۔ دوسری شادی راندیر کے ایک معلم خاندان میں ہوئی تھی۔ ان سے ایک بیٹا سید ولی الدین تھا۔ یہ صوفی منش تھے۔ ستار نوازی میں مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے عہد جوانی میں وفات پائی۔ تیسری سے ایک بیٹا سید امین تھے۔ ان کی اولاد سورت میں موجود ہے۔ نور الدین کی شادی نصیر الدین کی بیٹی بدر النسا سے اور امت اللہ بیگم کی نصیر الدین کے بیٹے عزیز الدین سے ہوئی تھی۔ نور الدین کے بیٹے اور پوتے پوتیاں حیات ہیں۔ عزیز الدین کی اولاد دو بیٹے اور دو بیٹیاں لاولد فوت ہوئیں۔

سید نصیر الدین اپنے بڑے بھائی کمال الدین سے فطری طور پر بالکل مختلف تھے۔ یہ اپنی دانش وبینش، وضع داری رکھ رکھاؤ اور حقیقت پسندی کے لئے مشہور تھے۔ جاگیر و جائداد کا تمام انتظام ان کے سپرد تھا۔ انہیں گھوڑوں کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ گھوڑوں کا سوداگر سورت آیا ہوا تھا۔ انہیں ایک گھوڑا پسند آیا تو سودا کر لیا اور اسی پر سوار ہو کر گھر آئے۔ جیسے ہی ان کے والد نے انہیں دیکھا تو کہا کہ اگر خرید کر لائے ہو تو فوراً لوٹا دو۔ نصیر الدین نے فوراً والد کے حکم کی تعمیل کی۔ اللہ نے انہیں انسانی ہمدردی کا جذبہ بدرجۂ اتم ودیعت کیا تھا۔ سرسید اور ان کے رفقاء کار کے پُرخلوص نعروں نے ان کی حقیقت پسندی کو جلا دیدی تھی۔ مذہب، معاشرت، سیاست ہر شعبۂ زندگی میں ان کا زاویۂ نظر عملی تھا۔ حکومت برطانیہ سے ان کی پہلی جھڑپ آرمس ایکٹ کے سلسلہ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے تمام ہتھیاروں کو ضائع کر دیا لیکن نہ پروانہ حاصل کیا نہ استثنا چاہا۔ ان کا خیال تھا کہ ایک سپاہی کو ہتھیاروں کے لئے کسی قسم کے پروانوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انہیں ہمیشہ حکومت برطانیہ سے کدرہی وہ اسے آزادی نما غلامی کہتے تھے۔ پیری مریدی کا سلسلہ بھی منقطع کر دیا اور معتقدین سے یہ کہہ دیا کہ میں خود ایک گنہ گار بندہ ہوں۔ مجھے خود اپنی نجات کی فکر ہے۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ تم لوگ خود صوم وصلوٰۃ کے پابند ہو اللہ سے براہ راست نجات کے طالب ہو جاؤ۔ نصیر الدین کو بچوں کی تعلیم سے

خاص دلچسپی تھی وہ طالبان علم کی ہر ممکن طریقہ پر مدد کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک رئیس نے کہا کہ ایسے ونسیوں کے بچے تعلیم حاصل کرلیں گے تو ہمارے بچے کہاں جائیں گے۔ نصیر الدین نے جواب دیا کہ ہمارے بچے پڑھ چکے۔ یہ تو باپ دادا کی ہڈیوں پر گذر کریں گے اور تباہ ہونگے زمانہ بدل چکا ہے۔ تعلیم کے معاملہ میں فرق مراتب کو بالائے طاق رکھئے۔

۱۸۸۵ء/۱۳۰۳ھ میں پہلی بار مجموعی حیثیت سے منظم طریقہ پر قومی و ملی فلاح و بہبود کا تصور سورت کی انجمن اسلام کے قیام کی سورت میں ظاہر ہوا۔ اس کے اساسی اراکین میں نصیر الدین اور سید زین العیدروس خصوصیت رکھتے ہیں یہ انجمن اب تک قائم ہے۔ پہلے رواج تھا کہ عوام اپنے ہر قسم کے جھگڑے جھمیلے کسی بھی صاحب اقتدار و تدبر کے سامنے پیش کرتے جو بڑی خوش اسلوبی سے فیصل کر دیتے تھے۔ سورت میں سید زین عیدروس، سید نصیر الدین سورتی جمعدار، ملا عبدالحی بنجاسی اور عبدالرحمن لکڑے والے ایسے چار شخص تھے جن کے فیصلوں کو لوگ قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان لوگوں نے شہر کو چار حصوں میں تقسیم کر لیا تھا اور ہر حصہ ایک شخص کے ذمہ تھا۔ ان حضرات کی اس خدمت کی وجہ سے لوگوں کو عدالت نہیں جانا پڑتا تھا۔ زمانہ بدل چکا تھا۔ امراء حکومت کے وفادار غلام بن گئے۔ بعض اصحاب جاہ و ثروت نے وضعداری کی آڑ میں عوام سے اونچا رہنا پسند کیا لیکن نصیر الدین سورتی جمعدار نے نیچے اُتر کر عوام کے ساتھ رہنا مناسب سمجھا۔ حکومت برطانیہ اور انگریز قوم سے انہیں نفرت تھی۔ یہ جذبہ خاندانی روایت بن گیا تھا۔ نصیر الدین نے ۱۹۱۱ء میں فریضۂ حج ادا کیا۔ ان کی اہلیہ نے مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ ۱۹۱۳ء میں نصیر الدین نے پچاسی یا اٹھاسی سال کی عمر میں بمقام سورت انتقال کیا۔ مزار مدنی خانقاہ میں ہے۔

نصیر الدین کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑے بیٹے عزیز الدین کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں اور جو لاولد فوت ہوئیں۔ سید حمید الدین عرف پیارے جان منجھلے بیٹے تھے۔ ان کی شادی حکیم سید قمر الدین بن سید نظام الدین واعظ کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ ان کی اولاد میں تین بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ بڑے فرزند سید عبدالقادر بی۔ اے، ال ال بی نے علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ عمر کا بیشتر حصہ کاٹھیاواڑہ کی ریاستوں میں بطور دیوان خدمت انجام دینے کے بعد ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے۔ ان کی اولاد میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ اس وقت ان کی عمر چھہتر سال ہے (پیدائش ۱۹۰۱ء) دوسرے بیٹے سید بدر الدین

نے پچپن سال کی عمر میں ۱۹۷۲ء میں انتقال کیا۔ ان کی اولاد میں تین بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ تیسرا بیٹا راقم الحروف ظہیرالدین مدنی ہے۔ اولاد میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ حمیدالدین کی بیٹی سیدہ بتول بیگم نے شادی نہیں کی اس وقت ان کی عمر پچھتر سال ہے۔

نصیرالدین کے چھوٹے بیٹے کمال الدین نے پینتالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کی شادی حکیم قمرالدین کی بیٹی سے ہوئی تھی اولاد میں پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ شہاب الدین، عظیم الدین، حسن، رضی الدین اور افتخار احمد بیٹے اور عارفہ بیگم اور محمدی بیگم بیٹیاں ہیں۔ عظیم الدین، حسن، رضی الدین وفات پاگئے۔ عظیم الدین اور رضی الدین کی اولاد بقید حیات ہے۔ عارفہ بیگم کی شادی نواب مانگرول کے بھانجے شیخ احمد میاں نورالدین سے ہوئی تھی۔ یہ لاولد ہیں۔ چھوٹی بیٹی کا انتقال گیارہ سال کی عمر میں ہوگیا تھا۔ نصیرالدین کی ایک بیٹی بدرالنساء کی شادی نورالدین بن کمال جمعدار سے ہوئی تھی۔ دوسری بیٹی حبیب النساء کی شادی حکیم قمرالدین کے بیٹے ڈاکٹر سید جلال الدین قادری سے ہوئی تھی۔

سید نصیرالدین سورتی جمعدار کے منجھلے بیٹے حمیدالدین کا سنہ ولادت ۲۳ ستمبر ۱۸۹۷ء ہے۔ چھ سال کی عمر میں انہیں پرائمری اسکول میں داخل کیا گیا۔ پرائمری کے چار سال ختم ہونے پر سکنڈری اسکول میں نہ بھیجتے ہوئے عربی فارسی کی تعلیم کے لیے سورت کے ایک مشہور عالم مولوی محمود صاحب کے سپرد کیا گیا۔ وہ ایک سال نہایت بے دلی سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ان کے والد نے ان کی بے دلی کے پیش نظر انہیں شہر کے ایک حاذق طبیب حکیم عبدالرزاق رامپوری کی نگرانی میں علم طب نیز عربی فارسی کی تعلیم کے لیے بھیجا لیکن اس فن شریف کی طرف بھی ان کی طبیعت مائل نہیں ہوئی اور یہ سلسلہ چھ سات ماہ کے بعد منقطع ہوگیا۔ آخر حمیدالدین صاحب کا رجحان طبع اور جذبۂ بغاوت اس طرح رونما ہوا کہ ۱۸۰۸ء یا ۱۸۱۱ء میں انھوں نے اپنے والد کو اطلاع دئے بغیر شہر کے گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لے لیا وہاں وہ ایک سال گذارنے کے بعد سورت کے قدیم ترین اسکول آئی۔ پی مشن ہائی اسکول میں چلے گئے جہاں میٹرکیولیشن کی منزل تک تعلیم حاصل کی۔

ثانوی تعلیم کے دوران جمعدار صاحب کا ایک واقعہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس سے ان کی فطری خصوصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ چھٹی کے گھنٹے میں اپنے ایک ہم جماعت کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے ہم جماعت داؤ لے چکا تھا اور گھنٹی بج گئی ہم جماعت ساتھی کو چھوڑ

کر جانے لگا۔ جمعدار صاحب نے اسے پکڑ لیا اور کہا میں اپنا داؤ کھیلے بغیر جانے نہ دوں گا زدوکوب تک نوبت پہنچی مگر انھوں نے داؤ کھیلے بغیر اس کو جانے نہیں دیا۔ جماعت میں جانے کے بعد باز پرس ہوئی۔ اسی طرح آخر عمر تک انھوں نے اپنے یا قوم کے جائز حقوق مانگنے اور طلب پر ڈٹ جانے میں کبھی گریز نہیں کیا۔

۸۹-۱۸۸۸ء تک دوبارہ میٹرکولیشن کے امتحان میں شریک ہوئے لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ زندگی کے ایک بدلتے ہوئے دور نے انہیں تعلیم کی طرف سے دل برداشتہ کر دیا تھا۔ جمعدار صاحب کی نظروں کے سامنے عیش و عشرت کے بجھتے ہوئے چراغ اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ احباب کی سن گن اور امرا کی توبہ شکن صحبتوں نے ان کی زندگی میں بھونچال ڈال دیا۔ یہ رنگین محفلوں کے طلسم میں پھنس گئے مگر ان کے لئے رنگ رلیوں کا زمانہ نو دس سال سے زیادہ نہ رہا۔ بدلتے ہوئے حالات نے اس طلسم کو بہت جلد پاش پاش کر دیا۔ کوچۂ یارانِ شوریدہ سر میں ان کے قدم جمنے بھی نہ پائے تھے کہ اکھڑ گئے۔ خوش باشوں کی صحبتیں درہم برہم ہونے لگیں بعض تائب ہو گئے۔ امرا کی مخدوش حالت دیکھ کر بعض طوائفوں نے کسی نہ کسی کے دامن میں پناہ لے لی۔ ان بدنام کنندۂ نیکونام ارباب نشاط کی جتنی تعریف و توصیف کی کی جائے کم ہے۔ جنھوں نے کوٹھے چھوڑے اور گھر کے گوشے پکڑے پھر بزم رقص و سرود میں شرکت سے بھی حذر کیا۔ گرہستی زندگی میں انہیں مالی مشکلات سے دوچار بھی ہونا پڑا لیکن اُف نہ کی۔ اللہ ان کی قبروں کو ٹھنڈا رکھے۔ اسی زمانہ میں جمعدار صاحب کو ایک صدمۂ عظیم سے دوچار ہونا پڑا۔ ۱۸۹۸ء میں ان کے محب خاص نواب محمود عالم خان عرف بیلہ نے عین شباب میں انتقال کیا۔ دونوں ایک جان دو قالب تھے دوست کی آنکھیں بند ہوتے ہی جمعدار صاحب کی آنکھیں کھل گئیں۔

یہ زمانہ جمعدار صاحب کے لئے عجیب ذہنی کش مکش کا تھا۔ ایک طرف رنگین محفلیں درہم برہم ہو رہی تھیں اور دوسری طرف سر سید احمد اور دیگر دانشوروں نے ہر شعبۂ حیات میں اصلاح کا نعرہ بلند کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے اپنے دل کے اندرونی گوشوں کو ٹٹولنے کے بعد جادۂ مستقیم پر چلنے کا ارادہ کر لیا۔ ۱۸۹۶ء یا ۱۸۹۷ء میں ان کی نسبت (منگنی) ہو چکی تھی لیکن شادی کے لئے رضامند نہ ہوئے تھے مگر ۱۸۹۹ء میں خود انھوں نے شادی کے لئے رضامندی ظاہر کر دی۔ اس وقت ان کی عمر کی تیس بہاریں گذر چکی تھیں۔

اگرچہ طلسم سے باہر آنے کی اور ذہنی کش مکش سے نجات پانے کی یہ کامیاب کوشش تھی تاہم حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی پورے طور پر رسیاں ٹوٹی نہیں تھیں۔ ان کی اہلیہ نے شادی کے بعد ایک سال تک بہت صبر و تحمل کے ساتھ ازدواجی زندگی کی تلخیوں کو برداشت کیا۔ ان کی دعائے نیم شبی مستجاب ہوئی۔ ۱۹۰۱ء میں فرزند کی ولادت مبارک و مسعود ثابت ہوئی۔ جمعدار صاحب یہ کہہ کر تائب ہوگئے کہ "میں نہیں چاہتا کہ میرے فعل و عمل سے میری اولاد متاثر ہو۔" اتفاق سے اس دوران میں ان کے والد نے سرزنش کی اور جاگیر جائداد کی نگرانی کا جوا ان کی گردن پر ڈالنا چاہا۔ یہ سرزنش ایک اور تازیانہ ثابت ہوئی۔ اب جمعدار صاحب قطعی فیصلہ پر پہنچ کر میدان عمل کی طرف چل پڑے۔

حلال روزی پیدا کرنے کے جذبہ نے جمعدار صاحب کو تلاش معاش میں سرگرداں کردیا۔ ضلع سورت میں ایک جگہ احمد آباد کے ایک معزز حضرت سید شمس الدین قادری اسسٹنٹ کلکٹر تھے۔ جمعدار صاحب نے ان سے بر سبیل ملاقات ملازمت کے لئے درخواست کی۔ قادری صاحب کئی منٹ تک جمعدار صاحب کی وضع قطع کو دیکھتے رہے اور کہا میاں! نوکری کروگے یا نوابی؟ اور تحریری درخواست لے لی۔ جمعدار صاحب کا دل بدلا تھا لیکن وضع قطع نہیں بدلی تھی۔ سر پر بڑ وروی طرز کی پگڑی بدن پر انگرکھا، پہنا ہوا پجامہ، کمر کسی ہوئی ان کا لباس تھا۔ قادری صاحب سے امید نظر نہیں آئی تو ریاست سچین کے دیوان صاحب سے ملے۔ دیوان ایک ہندو شخص تھے۔ دیوان صاحب نے جمعدار صاحب سے زبانی گذارش احوال سن لیا اور بہت مشفقانہ انداز میں نصیحت کی کہ تم نے جو لباس پہن رکھا ہے اس کو ترک کردو اور سیدھا سادہ لباس اختیار کرلو۔ جمعدار صاحب نے دیوان صاحب کی نصیحت کو مناسب سمجھا اور اس کے بعد سے شیروانی اور ترکی ٹوپی لباس اختیار کرلیا۔ عیدین اور تقاریب کے موقعوں پر صافہ باندھتے تھے۔

اس زمانہ میں ریلوے میں ملازمت آسانی سے مل جاتی تھی لہذا جمعدار صاحب نے بمبئی کے لئے رخت سفر باندھا۔ بمبئی میں درخواست لے کر ٹرافک سپرنٹنڈنٹ کے دفتر بمقام چرچ گیٹ پہنچے۔ باریابی ذرا مشکل تھی کیونکہ چپراسی جمعدار صاحب کے لگائے بے تواسے کر ٹالتا رہا۔ دو روز ایسے ہی گذر گئے آخر تیسرے روز جمعدار صاحب ٹی۔ ایس کے آفس کے پاس پہنچے اور جیسے ہی ٹی۔ ایس آفس میں داخل ہوا یہ بھی اس کے پیچھے ہولئے چپراسی

دیکھتا ہی رہ گیا۔ ڈی۔ ایس بھی چند لمحوں کے لئے حیران رہا اور اس نے دریافت کیا "کون ہو، کیوں آئے ہو، کیا کام ہے وغیرہ جمعدار صاحب نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہدیا اور درخواست میز پر رکھ دی۔ ڈی۔ ایس نے درخواست پر نظر ڈالی اور کہا "تم کو ڈاک سے جواب بھیجا جائے گا" چند روز کے بعد کلرکی کی اسامی کے لئے تقرری خط ملا۔ انھوں نے فوراً منظوری کا خط لکھ بھیجا۔ اس کے بعد ہی قادری صاحب کی طرف سے تقرری کا خط ملا لیکن نفی میں جواب لکھ بھیجا۔ تقرر بمبئی کے کسی دفتر میں ہوا تھا لہٰذا جانے سے پہلے انھوں نے اپنی کوشش کی روئداد سنا کر والد سے اجازت چاہی۔ ان کے والد نے انہیں جانے سے ہر چند روکا لیکن یہ نہ مانے اور عرض کیا کہ خوشی سے اجازت دیجئے تاکہ مجھے اپنی حلال روزی پر شاکر رہنے کا موقع میسر آئے۔

۱۹۰۱ سے دور ملازمت شروع ہوا اور تقریباً ۲۰ سال رہا۔ تصورات حیات میں تبدیلی آئی، وضع قطع بدلی، طرز زندگی بھی بدل گیا۔ فطری رجحان اور ذوق و شوق بدلے تو نہیں لیکن دب کر رہ گئے یا شکلیں بدل گئیں۔ شعر و سخن سے انہیں لگاؤ تھا۔ حشمت تخلص کرتے تھے اور منشی میاں داد خاں سیاح شاگرد غالب سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ چند غزلوں کا مجموعہ راقم کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ کلام بالکل رسمی ہے۔ اس میں حقیقی شاعر کے دل کی دھڑکنیں نہیں ہیں۔ شاید شعر گوئی کا شوق عہد جوانی کے ماحول اور صحبتوں کا نتیجہ تھا۔ البتہ شعر فہمی ان کا حقیقی ذوق تھا۔ مطالعہ کتب ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ جو آخر عمر تک قائم رہا۔ کتب تواریخ سے زیادہ شغف تھا۔ عالمگیر کے مداح تھے۔ ادب میں بھی بہت ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ آتش و ناسخ مومن و غالب کے اشعار ان سے سن کر تعجب نہیں ہوا لیکن جب احسان دانش کے اشعار ان سے سنے تو حیرت میں پڑ گیا۔ درحقیقت ہر چیز میں وہ جدت اور ترقی کے قائل تھے۔ انہیں موسیقی سے بے حد شغف تھا۔ ستار نوازی میں مہارت حاصل کی تھی۔ پہلوانی اور کشتی کا بھی انہیں شوق تھا۔ ان کے لئے حویلی کے قریب اکھاڑہ بنوا دیا گیا تھا اور استاد پہلوان تنخواہ پر مقرر تھے۔ غرض جب تک کردار کی تربیت کے لئے ضرورت رہی وہاں تک شوق و ذوق رہا اور مقصد پورا ہوتے ہی یہ غائب ہو گیا۔ مذہبی رجحان شاید دبا ہوا تھا وہ ابھر کر سامنے آیا۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو گئے اور ۱۹۱۱ء میں اپنے والدین کے ساتھ فریضہ حج بھی ادا کر دیا۔

جمعدار صاحب کو ملازمت کے زمانہ میں انسان کی عظمت اور عبرت کے واقعات

وحادثات کے مشاہدہ کے وافر موقعے ملے۔ تعلیمی میدان میں دوسری قوموں کی دوڑ دھوپ سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اس زمانہ میں لڑکیوں کی تعلیم کو مسلمان عموماً غیر ضروری سمجھتے تھے اور مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی خاطر خواہ انتظام بھی نہیں تھا۔ مغربی تعلیم کو مذہب کے منافی خیال کیا جاتا تھا۔ ایسے زمانہ میں جمعدار صاحب اپنے خاندان بلکہ اہل سورت میں پہلے شخص تھے جنھوں نے اپنی بیٹی کو کانوینٹ اسکول میں داخل کیا اور قدامت پسندوں کے اعتراضات کا چنداں خیال نہیں کیا۔

۱۹۱۲ء میں جمعدار صاحب کے والد کا انتقال ہوگیا۔ تمام ذمہ داریاں ان کے سر آگئیں۔ یہ ترک ملازمت کا سوچ ہی رہے تھے کہ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی لہذا سبک دوشی کا معاملہ التوا میں پڑ گیا۔ جنگ کے بند ہونے پر ۱۹۲۰ء میں ترک ملازمت کے بعد تحریک ترک موالات میں شریک ہو گئے۔

جمعدار صاحب سیاسی جماعت کے اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ کھدر پوشی اختیار کرلی تھی۔ سرکاری دعوتوں میں شرکت سے حذر کرتے تھے۔ اپنی نجی پریشانیوں کی وجہ سے سیاست میں عملی طور پر حصہ لینا چھوڑ دیا تھا لیکن سماجی اصلاح کے کاموں میں برابر دلچسپی لیتے رہے۔ اس زمانہ میں شہر میں جب کبھی اصلاحی اُمور میں رہبری کی ضرورت پڑتی تو شہر کے اکابر سر جوڑ کر بیٹھ جاتے اور مشکلات کا حل تلاش کر لیتے۔ اقتصادی حالات کے پیش نظر یہ طے کیا گیا تھا کہ شادی بیاہ میں غیر ضروری رسم ورواج کو ترک کرنے کی جدوجہد کی جائے۔ ۱۹۲۵ء میں جمعدار صاحب کے گھر میں ان کی بھتیجی کی شادی کی تقریب کا موقع آیا تو جمعدار صاحب نے اپنے اصلاحی جذبہ کا عملی ثبوت دیدیا۔ شادی بیاہ کے علاوہ تہواروں پر ہونے والی بدعتوں کو بھی گھر سے نکال پھینکا اور گھر میں راگ رنگ کی محفلوں پر بھی پابندی لگادی گئی۔

۱۹۲۵ء میں جمعدار صاحب سورت میونسپلٹی میں بطور کونسلر گئے۔ عوام کے ایک نمائندے کی حیثیت سے انھوں نے بہت خوش اسلوبی سے اپنی ذمہ داریوں کو انجام دیا۔ ۱۹۲۷ء میں یہ انجمن اسلام کے اعزازی سکریٹری منتخب کئے گئے۔ اس وقت تک انجمن کے قیام کو چھتیس سال ہو چکے تھے۔ اس زمانہ میں سماجی تعلیمی، امدادی کاموں کے لیے یہ واحد ادارہ تھا۔ ایک مردہ ادارہ جمعدار صاحب کے سپرد کیا گیا تھا۔ انجمن کی کل پونجی چار پانچ ہزار روپئے تھی چار پانچ ممبر تھے، دو تین بیواؤں کو دو دو روپے اور دو طالب علموں کو چار چار روپے ماہانہ امداد

دی جاتی تھی۔ جمعدار صاحب نے بڑی تن دہی سے کام کیا اور اس میں روح پھونک کر انجمن کو باوقار بنایا۔ انھوں نے ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۳ء تک خدمت انجام دی۔ ۱۹۴۰ء میں اس انجمن کے ایک سو سے زائد ممبر تھے۔ طلبا کو سالانہ ایک ہزار روپیہ وظیفہ دیا جاتا تھا۔ بیسیوں بیواؤں کو ماہانہ وظیفے دئے جاتے۔ لاوارث اموات کے لئے رقم مخصوص کردی گئی تھی۔ انجمن کے لئے بہت جانفشانی سے پیسہ جمع کیا تھا لہٰذا اس کو خرچ کرنے میں بہت محتاط تھے۔ لاوارث کی تجہیز و تکفین کے لئے رقم دینے سے پہلے خود دیکھ کر اطمینان کرتے یا پھر یہ خدمت راقم کو انجام دینی ہوتی تھی۔ یہ ہدایت کی جاتی کہ چادر ہٹا کر دیکھ کر اطمینان کرلینا۔

شہر سورت میں ایک ادارہ محمڈن یونین کے نام سے عرصۂ دراز سے قائم تھا۔ اس کے فنڈ میں اچھی خاصی رقم بھی موجود تھی۔ یونین کے اغراض و مقاصد سے تو کسی کو سروکار نہ تھا، اس کی مبلغ رقم سے کئی لوگوں کو محبت تھی۔ ممبران میں تنازع ہونے کی وجہ سے معاملہ کلکٹر کے سپرد کیا گیا۔ کلکٹر مسٹر بولٹن نے اکابر شہر کا جلسہ منعقد کیا گیا اور اپنے اختیار سے ادارہ کی نظامت جمعدار صاحب کے سپرد کی۔ شہر کی ایک مسجد (منیار والی) کے ٹرسٹ میں بدنظمی کی وجہ سے معاملہ کلکٹر تک گیا۔ اس وقت کے کلکٹر ھارٹ شون نے اکابر شہر کے مشورہ سے اس کی نظامت جمعدار صاحب کے سپرد کی۔ جمعدار صاحب ذمہ داری لینا نہیں چاہتے تھے کیوں کہ متولیوں سے واجب الادا رقمیں وصولی کرنے میں رنجشوں کا اندیشہ تھا لیکن جب ذمہ لے لیا تو مخالفتوں کی پروا کئے بغیر عدالت کے ذریعہ تمام رقمیں وصول کیں اور مسجد کی املاک کی آمدنی میں اضافے کی صورتیں پیدا کردیں۔ اس آمدنی سے ایک دینی مدرسہ اور بعد میں پرائمری اسکول قائم کیا گیا۔ شہر کے بعض خانگی جائدادوں کے معاملات بھی ان کی نگرانی میں تھے۔ اللہ نے انہیں تازیست خلوص و امانت داری میں سرخرو رکھا۔

بچوں کی تعلیم و تربیت جمعدار صاحب کا نصب العین تھا۔ تعلیم سے دلچسپی کے کئی اسباب تھے۔ گھر میں والد کی تلقین، بمبئی میں ان کا مشاہدہ اور سرسید کی تحریکوں کا اثر وغیرہ کی وجہ سے ان کے دل پر یہ نقش بیٹھ گیا تھا کہ ہمارے تمام مصائب و آلام کا واحد علاج تعلیم اور صرف تعلیم ہے۔ گھر میں بچوں پر کڑی نگرانی کرتے رات کو پڑھائی ہوجانے کے بعد ہی میز پر کھانا لگایا جاتا۔ امتحان کے موقع پر کہا جاتا کہ اگر ناکام ہوئے تو پھر گھر میں تمہارے لئے جگہ نہ ہوگی۔ بڑے بیٹے عبدالقادر کو بھی علی گڑھ خطوط میں ایسا ہی لکھتے۔ اہل مغرب کی خوبیوں سے متاثر تھے لیکن

انتہائی مغرب زدگی کے مخالف تھے۔ انہیں اپنے مذہب، زبان اور تہذیب سے محبت تھی۔ وہ ماضی اور حال کی صحت مند روایات میں مصالحت اور امتزاج کے بڑے طرفدار تھے۔

۱۹۲۶ء میں راقم کو سورت کے مشن ہائی اسکول میں داخل کرایا گیا۔ یہ وہی اسکول تھا جہاں خود انھوں نے تعلیم پائی تھی۔ اسکول میں فارسی کے استاد بھی وہی تھے۔ جنھوں نے جمعدار صاحب کو پڑھایا تھا۔ اسکول میں بائبل (انجیل) کی تعلیم لازمی تھی۔ بائبل کے گھنٹے میں حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا کہنے میں مجھے تکلف ہوتا تھا۔ میں نے عیسیٰ کو پیغمبر کہا۔ اس پر ٹیچر نے خوب ڈانٹ پلائی۔ مجھے لڑکوں کے سامنے خفت ہوئی لہذا گھر جاکر والد سے کہا کہ ایسی چٹھی لکھ دیجئے کہ بائبل کے گھنٹہ میں مجھے غیر حاضری کی اجازت دی جائے۔ والد نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا کہ تم کو بائبل پڑھنی ہوگی۔ حجت کی ضرورت نہیں۔ اسکول کا یہ قانون ہے۔ ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

جمعدار صاحب کے لئے یہ واقعہ غور طلب ثابت ہوا۔ بچوں کی تعلیم کا تصور جو برسوں سے ان کے ذہن میں دبا ہوا تھا ابھر آگیا۔ عمیق غور و خوض نے ان کے ذہن میں ایک ایسے اسکول کا تصور قائم کر دیا جہاں قوم کے بچوں کو مذہبی تعلیم دی جاسکے اور اردو زبان اور اسلامی تہذیب سے بھی رشتہ برقرار رہ سکے۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد شروع کردی۔ سب سے پہلے جمعدار صاحب نے چند ہم خیال پیدا کر لئے اور لوگوں کے ذہنوں کو تیار کرنے کی کوشش کی۔ لوگوں کو فرداً فرداً سمجھاتے، صحبتوں اور جلسوں میں اپنے مافی الضمیر کو پیش کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ یہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے۔ اور ۱۹۳۴ء میں سورت میں سورت ڈسٹرکٹ مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ کا قیام عمل میں آگیا۔ پہلے پہل لوگ اس کی بات کی مجذوب کی بڑ سمجھتے تھے لیکن مخالفت بھی نہیں کرتے تھے۔ جمعدار صاحب کے ہمنواؤں میں سید عظیم الدین منادی ایڈیٹر مسلم گجرات، عبدالصمد گولنداز، عبدالحفیظ گولنداز، فیض اللہ بھائی ہمدانی، پرنسپل عبدالخلیق، قاضی ولی الدین، شیخ حسن باعکظ، حکیم حافظ غلام محمد چی چی والے، ڈاکٹر سید جلال الدین قادری، میاں محمد سلک والے وغیرہ تھے۔

سوسائٹی کے قیام کو چار سال گذر گئے۔ اس دوران میں تقریباً ہر ماہ میٹنگ ہوتی لیکن نشستن و گفتن و برخاستن سے زیادہ کچھ نہ ہوتا۔ یہی سمجھا جاتا کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔ فنڈ کے نہ ہونے کے علاوہ بے توجہی کا ایک سبب اور بھی تھا۔ مسلم لیگ

کے کارپردازوں کا یہ خیال تھا کہ ہر شعبۂ سماج میں صرف لیگ ہی خدمت انجام دینے کی اہل ہے اس تصور سے شہر کے ہر نوع کے اداروں کو نقصان پہنچا۔ یہ جمہوری نظام کی ستم ظریفی ہے کہ کسی کا اہل اور نااہل ہونا صرف سیاسی جماعت کے لیبل پر موقوف ہوتا ہے۔ شہر میں بعض نااہلوں کو لیگی لیبل کی وجہ سے اہمیت حاصل ہوگئی اور ایسے لوگوں نے اپنے انتقامی جذبے خوب خوب ٹھنڈے کیئے۔ ایک دفعہ ایک ذمہ دار لیگی کارکن راقم سے کہنے لگے۔ دیکھا! ہم نے صاحب والوں کا سلام بند کردیا۔ ان کا اشارہ اکابر شہر کی طرف تھا۔ راقم نے جواب دیا کہ اگر لیگ کے مقاصد میں سے یہ بھی ایک مقصد ہے تو پھر ہمارا بیڑا پار ہے۔ راقم لیگ کا ممبر تھا۔ جمعدار صاحب نے محض اس لیئے لیگ کی ممبر شپ اختیار نہیں کی تھی کہ ان کو ہر مکتب خیال کے لوگوں سے اسکول کے سلسلہ میں کام پڑتا تھا۔ ایسے ۱۹۳۵-۳۶ء میں مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں جمعدار صاحب سورت ڈسٹرکٹ پولیٹکل ایسوسی ایشن کے نائب صدر کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ ۴۶-۱۹۴۵ء میں اسمبلی الکشن کے موقع پر جمعدار صاحب نے ایسوسی ایشن کی میٹنگ میں سر علی محمد خاں دہلوی لیگ کے خلاف ایک آزاد نمائندہ کی حیثیت سے الکشن لڑ رہے تھے اس تجویز کی سختی سے مخالفت کی تھی۔

۱۹۳۹ء میں انجمن ترقی اُردو کی شاخ قائم کرنے کے موقع پر بھی لیگ کے بعض کارپردازوں نے ہر ممکن طریقہ پر رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ میں لیگی تھا۔ اُردو کی نشر و اشاعت کے لیئے لیگ کے پلیٹ فارم سے تقریروں کے ذریعہ بھی کو خدمت انجام دینی ہوتی تھی۔ ان کی مخالفت کے باوجود انجمن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اسی طرح اسکول کے اجرا کے وقت بھی بڑی شد و مد سے بعض لیگیوں نے مخالفت کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔

یہ تو تھا جملۂ معترضہ۔ آخرکار ۱۹۳۰ء میں جمعدار صاحب نے مجلس عامہ کا جلسہ منعقد کیا۔ جلسہ رات نو بجے شروع ہوا۔ تقریباً تمام اکابر نے شرکت کی۔ جلسہ میں بحث ہوتی رہی۔ ٹیپ کا مصرع یہ تھا کہ فنڈ کی عدم موجودگی میں اسکول قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس وقت سوسائٹی کے پاس صرف مبلغ پچھتر (۷۵) روپیہ تھا۔ دو ایک گھنٹے بحث ہونے کے بعد جمعدار صاحب نے کہا کہ آج جب تک اسکول کی تجویز منظور نہیں کی جائیگی تب تک جلسہ سے کسی کو جانے نہ دوں گا۔ لوگ چونکہ جمعدار صاحب کا بہت لحاظ کرتے تھے اس لئے یہ طے پایا کہ چائے کے وقفہ کے بعد غور کیا جائے گا۔ لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ تجویز منظور کرلی جائے۔ اسکول چند روز بعد ہی بند ہوجائے گا۔

۱۹۴۸ء جون سے ابتدائی چار جماعتوں سے اسکول کا اجرا کیا گیا۔ اس کا نام اینگلو اُردو رکھا گیا۔ جمعدار صاحب نے ایک سال کے اخراجات کی بھرپائی کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے۔ بعض اوقات ماہانہ چندے وصول ہونے میں دیر ہوئی تھی تو یہ اپنے پاس سے رقم دیدیتے۔ اس اصول پر کاربند تھے کہ ٹیچرز کو یکم کو تنخواہ مل جانی چاہیئے ورنہ وہ کام سے جی چرائیں گے۔ جمعدار صاحب کے ایک رفیق کار سید عظیم الدین صاحب منادی ایڈیٹر ہفتہ وار مسلم گجرات راقم سے کہتے تھے کہ اسکول کی بقا کے لئے کیا کیا جتن کرنا پڑا ہے اس میں سے بعض راز کی باتیں جمعدار صاحب اپنے ساتھ قبر میں لے گئے اور بعض میں لے جاؤں گا۔ غرض اسکول ۱۹۴۳ء تک میٹرک کی منزل تک پہنچ گیا۔ آج اس کی عمارت صرف پانچ چھ لاکھ روپیہ مالیت کی ہے۔

۱۹۴۴ء میں جمعدار صاحب کی عمر پچھتر سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ اعصاب میں کمزوری بڑھتی جا رہی تھی بینائی اور قوت سماعت پر بھی ضعف غالب آرہا تھا۔ جوانی کی ورزش کشتی پہلوانی کی وجہ سے صحت بنی رہی۔ اس عمر میں روزانہ دو ایک میل چل لیتے تھے لیکن آخر بڑھاپے نے پہلوان کو پچھاڑ دیا صحت کمزور ہو چکی تھی لیکن عزم و استقلال میں جوانی کی سی مضبوطی موجود تھی۔ ۱۹۴۴ء کے آس پاس سوسائٹی اسکول اور دوسرے تمام اداروں کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوگئے۔

جمعدار صاحب کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان میں بعض فطری کمزوریاں بھی موجود تھیں۔ ان کی خوش مزاجی میں متانت اور بزرگانہ شان تھی لیکن تند مزاج بھی تھے۔ تند مزاجی صرف خلوص کی بنا پر تھی۔ آخر دم تک آواز میں طنطنہ قائم تھا۔ بعض اوقات اس کو غلط بھی سمجھا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتے کہ "من سپاہی زادہ، گفتار من باید درشت" گھر میں سخت مزاجی کے کئے دن حادثے ہوتے رہتے تھے۔ ان کی اولاد اگرچہ صاحب اولاد ہو چکی تھی تاہم والد کی بات بغیر جواب دیئے خاموشی سے سن لیتی تھی۔

جمعدار صاحب دُھن کے پکے، نڈر اور صاف گو تھے۔ اگر ان میں یہ اوصاف نہ ہوتے تو شاید کسی بھی قسم کی خدمت نہیں کر پاتے اور نہ ہی کسی ارادہ میں کامیاب ہوتے۔ سورت میں ایک قومی فساد کے موقع پر جمعدار صاحب نے حکومت اور محکمۂ پولیس کے خلاف ایک مضمون شائع کر دیا تھا۔ کلکٹر صاحب نے عمائدین کا جلسہ طلب کیا۔ حکومت کے متعلق صفائی پیش کی اور جمعدار صاحب سے کہا گیا کہ وہ اپنا مضمون واپس لے لیں۔ جمعدار صاحب نے جواب دیا کہ میں

نے حقیقت بیان کی ہے۔ مضمون اپنی جگہ پر رہیگا۔ جلسہ میں نوابین، سجادہ نشین، بشمول ساہوکار سبھی تھے لیکن ایک شخص نے بھی جمعدار صاحب کی طرفداری میں ایک لفظ نہیں کہا کیوں کہ سب حکومت کے وفادار غلام تھے مگر جمعدار صاحب اپنی بات پر ڈٹے رہے۔

عمر کے آخری دو سال گھر سے باہر بہت کم جانے کا اتفاق ہوا۔ اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ ساتھ وقت گذارنے یا اور ادو وظائف میں مشغول رہتے۔ نماز فجر کے بعد حبس دم ان کے معمولات میں سے تھا ۱۹۵۱ء میں ابتدائی مہینوں میں طبیعت نرم گرم چلتی رہی اور آخر جون کی تین تاریخ کو بچاسی سال کی عمر میں میدان عمل کے اس سپاہی نے کوچ کیا۔ ان کے خاندانی قبرستان خانقاہ مدنی صاحب میں سپرد خاک کیا گیا ہے۔ اللہ ان کی قبر ٹھنڈی رکھے (آمین)

شیرازی خاندان

اس خاندان کے ایک بزرگ سید ابراہیم مدنی ۱۱۱ھ میں مدینہ منورہ سے شیراز چلے گئے تھے۔ ان کی اولاد سے ایک بزرگ سید محمود شیراز سے سندھ آئے اور سید محمود کی اولاد میں سے سید احمد شیرازی نے احمد آباد گجرات میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ سید احمد گجرات کے جید صوفی و عالم گزرے ہیں ان کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے امام نقی تک پہنچتا ہے ان کا مزار بمقام آستوریا دروازہ احمد آباد واقع ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ سید احمد حسین عرف سید و میاں دہلی میں شہزادوں کے اتالیق مقرر کئے گئے تھے ان کی علمی لیاقت کی بنا پر شاہ عالم ثانی نے ۱۱۷۷ھ میں ان کو بھروچ میں عہدۂ قضاۃ پر فائز کیا تھا۔ بھروچ میں نواب نیک نام خاں رفیع الدولہ والی بھروچ کی صاحبزادی سے ان کی شادی ہوئی تھی۔ اس زمانے سے تا حال بھروچ کی قضاۃ ان کے خاندان میں ہے قاضی سید محمد نور الدین حسین فائق مؤلف مخزن شعرا اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ فائق کے والد قاضی سید احمد حسین اپنے زمانہ کے علما میں شمار کئے جاتے تھے۔ فائق نے اپنے والد سے ہی اکتساب علم کیا تھا۔ فائق کو علم و ادب سے والہانہ شغف تھا۔ موصوف نے بیشتر نادر کتابوں کی نقلیں لے کر اپنے کتب خانہ میں محفوظ کرلی تھیں۔ موصوف نے تذکرہ سادات شیرازیہ بھی مرتب کیا ہے۔ اشعار اسلام خانی رمکتوبات بھی انھوں نے مرتب کی ہے۔ فائق کا اردو شعرا کا تذکرہ مخزن شعرا مشہور ہے۔ ان کے فارسی ذوق اور صلاحیت کا یہ ایک اچھا نمونہ ہے۔ مرزا غالب نے اس تذکرہ پر تقریظ لکھی ہے اور ان کی فارسی دانی پر صاد کیا ہے

فائق کا ایک غیر مطبوعہ کارنامہ طالع ہوم ہے ۔موصوف نے ۱۱۰۶ھ میں وفات پائی ۔

فائق نے دو شادیاں کی تھیں ۔پہلی بیوی احمد آباد کے قاضی صدر الحق کی صاحبزادی تھیں اس بیوی کے بطن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تو دوسری شادی بھڑوچ کے ایک معزز حکیم میر غلام علی کی صاحبزادی سے کی ۔ان سے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہوئیں ۔فرزند اکبر سید محمد صغر سنی میں وفات پا گئے ۔دوسرے فرزند سید احمد حسین تھے سید احمد حسین کے بیٹے سید نورالدین بھی بڑے علم دوست شخص تھے ۔سید نورالدین نے   میں وفات پائی ۔موصوف کی پہلی شادی بھڑوچ کے انعام دار خاندان میں ہوئی تھی اور دوسری شادی سورت نے سجادہ نشین سید علی العیدروس کی دختر سے ہوئی تھی ۔پہلی بیوی کے بطن سے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں ۔بیٹے سید زین العابدین سورت میں ٹریننگ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے خدمت انجام دے کر سبکدوش ہوئے ہیں اور دوسرے بیٹے محکمۂ مال میں عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں ۔

بھڑوچ کا نواب خاندان

۱۷۲۲ء سے قبل نظام الملک گجرات کے صوبدار تھے ۔اس وقت بھڑوچ ،جمبوسر، دھولکا وغیرہ ان کی جاگیری علاقے تھے ۔۱۷۳۶ء میں مرزا عبداللہ بیگ بھڑوچ کا فوجدار تھا اور اس وقت گجرات کا صوبیدار ابھے سنگھ تھا ۔۱۷۳۶ء میں نظام الملک نے گجرات سے گذرتے ہوئے مقام کا معائنہ کیا تھا ۔مرزا عبداللہ بیگ نے نظام الملک سے درخواست کی کہ وہ ابھے سنگھ کی ملازمت میں نہیں رہنا چاہتا ۔نظام الملک نے بھڑوچ جو ان کی ذاتی جاگیر قرار پا چکا تھا مرزا عبداللہ بیگ کے سپرد کیا اور نیک عالم خاں کا خطاب بھی دیا اس طرح بھڑوچ میں ۱۷۳۶ء سے خود مختار نوابی کا سلسلہ شروع ہوا ۔نیک عالم خاں عبداللہ بیگ نے ۱۷۴۸ء میں انتقال کیا ۔اس کے بعد ان کا بیٹا مرزا بیگ جانشین قرار پایا یہ نواب نیک عالم خاں دوم کہلاتے تھے ۔مرزا بیگ نے ۱۷۵۲ء میں انتقال کیا تو مرزا عبداللہ بیگ کا دوسرا بیٹا جانشین ہوا مگر تین ماہ کے عرصہ میں نواب نے وفات پائی تو مرزا عبداللہ بیگ کے پوتے مرزا احمد بیگ خلف مرزا محمد بیگ کو جانشین قرار دیا گیا ۔یہ نواب حامد بیگ کے نام سے مشہور تھے اور رفیع الدولہ خطاب تھا ۔نواب رفیع الدولہ نے چودہ سال حکومت کی اور ۱۷۶۷ء/۱۱۸۱ھ میں انتقال کیا ۔موصوف علم دوست نواب تھے ۔ان کا دربار علما اور شعرا سے بھرا رہتا تھا ۔نزدیک و دور سے ادیب و شاعر آتے اور کبھی اس دربار سے خالی

ہاتھ نہ جاتے۔ نواب کو شعر و سخن سے شغف تھا۔ صاحب تخلص کرتے تھے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے امتیاز الدولہ معز خان جانشین ہوئے۔ نواب سورت اور انگریزوں کو نواب موصوف سے کوئی رقم جو واجب الادا تھی وصول کرنی تھی۔ انگریز کمپنی نے نواب صاحب سے اس بارے میں خط و کتابت شروع کی مگر نواب صاحب نے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ اس کو بہانہ بنا کر کمپنی نے بھروچ کو اپنے قبضۂ اقتدار میں لینے کے خیال سے ۱۷۷۱ء میں جنگ چھیڑ دی۔ اس جنگ میں نواب صاحب کو شکست ہوئی۔ اس طرح انگریز بھروچ کے مالک بن گئے۔ نواب کے دربار کے شاعر غمگین نے اس واقعہ پر ایک رزمیہ مثنوی لکھی ہے جس کا نام جنگ غمگین ہے۔ اس مخطوط راقم کے پاس محفوظ ہے۔ انگریزوں نے بھروچ کو اپنے قبض و تصرف میں لینے کے بعد نواب خاندان کو بالکل نظر انداز کر دیا لہٰذا نواب معز خاں کے بیٹے مرزا احیدالدین (سرکاری کاغذات میں ان کا نام اوحدالدین دکھایا جاتا ہے) لندن گئے اور ڈائرکٹرز کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا۔ موصوف کو اس میں کامیابی ہوئی اور انہیں ان کے خاندان کے دوسرے قریبی حقدار اعزا کو وظیفے ملنے لگے۔ احیدالدین نے ۱۷۷۲ء کے بعد اپنے والد کے ساتھ بمبئی میں سکونت اختیار کر لی تھی اور اپنے والد کے انتقال کے بعد ۱۷۹۴ء میں احیدالدین لندن گئے تھے۔ مرزا احیدالدین نے ۱۸۳۲ء/۱۲۴۸ھ میں انتقال کیا۔ مرزا احیدالدین بھی علمی ادبی ذوق کے آدمی تھے۔ ضاحک تخلص کرتے تھے۔

اس خاندان میں سورت کے مرزا عاشور بیگ کی پوتیاں نواسی خانم اور حاجی خانم بنت مرزا مغل کی شادی مرزا قلندر خاں اور مرزا جہانگیر خاں سے ہوئی تھی۔

بڑودہ کا نواب خاندان

اس خاندان کے ایک بزرگ ۱۵۰۰ء/۹۰۶ھ میں عرب سے ہرات آئے اور ہرات سے ۱۶۰۰ء/۱۰۱۰ھ میں اس خاندان کے ایک فرد ہندوستان آئے اور مغل حکومت میں اعلیٰ منصب حاصل کیا۔ خاندان کے ایک چشم و چراغ نواب نورالدین حسین خاں ۱۷۸۰ء/۱۱۹۴ھ میں نواب غازی الدین کے ہمراہ حج بیت اللہ جاتے ہوئے سورت آئے۔ سورت میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے غازی الدین سے گذارش کر کے انہیں کمپنی کے لئے مانگ لیا اور اپنا وکیل بنا کر پیشوا کے دربار میں بھیجا۔ نواب موصوف کے سات بیٹے تھے۔ ایک بیٹے نواب فخرالدین پیشوا کے دربار میں پیشکا

تھے۔ دوسرے نظام الدین تھے۔ انہیں نظام علی خاں آصف جاہ کے عہد میں پنج ہزاری منصب، خطاب نظام نواز جنگ بہادر اور پربندا و نلدرک کی قلعہ داری حاصل تھی۔ یہ شاعر بھی تھے۔ موصوف نے بمقام نوساری (گجرات) انتقال کیا۔ تیسرے بیٹے نواب نصیر الدین سلطان نواز جنگ تھے۔ نصیر الدین کو گوविند راؤ گائکواڑ پونا سے بڑودہ لائے تھے۔ نصیر الدین احمد آباد میں اباتسلوکر نمائندۂ پیشوا کے مقابلہ میں گائکواڑ کی طرف سے احمد آباد بھیجے گئے تھے۔ جہاں ۱۷۹۹ء ۱۲۱۴ھ میں وہ جنگ میں شہید ہو گئے۔ چوتھے بیٹے نواب میر کمال الدین حسین خاں تھے یہ ناگپور میں بھونسلے کے دربار میں منصب دار تھے۔ نصیر الدین کے انتقال کے بعد مہاراجہ گائکواڑ نے میر کمال الدین کو بڑودہ بلا کر منصب و جاگیر دی۔ پانچویں بیٹے صدر الدین یاور الدولہ اورنگ آباد کے صوبیدار تھے چھٹے اور ساتویں میر شرف الدین اور میر جمال الدین حسین خاں تھے۔ اس خاندان کے افراد ریاست گائکواڑ کے بہت وفادار منصب دار تھے۔

کمال الدین بن نور الدین کے بعد ان کے بیٹے میر امین الدین جانشین ہوئے۔ یہ شاعر تھے نصیری تخلص کرتے تھے۔ میر امین الدین کے کئی اولادیں تھیں مگر زندہ نہ رہیں لہٰذا ان کے انتقال پر ۱۸۳۷ء/۱۲۵۳ھ میں ان کے بھائی حسام الدین جانشین ہوئے نواب حسام الدین کے بعد میر کمال الدین دوم جانشین ہوئے۔

اس خاندان میں اورنگ آباد کے صوبیدار یاور الدولہ کی شاخ میں سے نواب صدر الدین حسین اپنے دور میں اچھے شاعر گذرے ہیں۔ نواب موصوف صدر تخلص کرتے تھے اور حالی کے زیر اثر اصلاحی نظمیں کہتے تھے۔ قومی اصلاح کے سلسلہ میں تقریباً ایک سو چھوٹے چھوٹے رسالے ان سے یادگار ہیں۔ ان کی تصانیف بڑودہ کی جامع مسجد لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں نواب صاحب نے وفات پائی۔ ان کی اولاد میں امین الدین، معز الدین اور فخر الدین تین بیٹے تھے۔ تینوں وفات پا چکے ہیں صدر الدین ریونیو کلکٹر تھے، معز الدین مہاراجہ بڑودہ کے مصاحبوں میں تھے اور فخر الدین امریکہ سے میڈیکل میں ڈگری لے کر آئے تھے۔ فخر الدین نیشلسٹ تھے۔ صدر الدین کی ایک بیٹی کی شادی احمد آباد کے سید مصطفٰے احسن قادری (باوا میاں دیوان کے بیٹے) سے ہوئی تھی۔

نواب کمال الدین دوم کے بعد ان کے بیٹے حسین الدین جانشین ہوئے۔ ۱۹۲۰ء کے آس پاس ان کا انتقال ہوا ان کے بعد نور الدین جانشین ہوئے۔ نور الدین نے ۱۹۵۲ء

میں انتقال کیا۔ اس وقت نورالدین کے فرزند مظہرالدین اپنے والد کے جانشین بقید حیات ہیں۔

میر صاحب کا خاندان

میر سرفراز علی بن ممتاز علی بن ذوالفقار علی بن روشن علی سہوان ضلع بدایوں سے بڑودہ آئے تھے۔ میر صاحب سہوان کے مودودی چشتی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان کے چند بزرگ سید روشن علی، سید اکبر علی، سید ابوالغیث وغیرہ آخری شاہان مغلیہ کے زمانہ میں بہت بااثر شخصیتیں گذری ہیں۔ میر سرفراز علی نے اپنی سیاستدانی اور فوجی لیاقت کی وجہ سے سرکار گائکواڑ بڑودہ میں اسلحہ دار سردار کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھی معتمد اور خیر خواہ تھے گائکواڑ اور کمپنی کے درمیان سفارتی خدمات بھی انجام دیتے تھے۔ موصوف کی شادی بڑودہ کے نواب خاندان میں ہوئی تھی۔ میر صاحب کو سید عبدالقادر سورتی جمعدار نے اپنی حویلی کی زمین سے ایک قطعہ بعوض قیمت دیا تھا جس پر انھوں نے حویلی تعمیر کرائی تھی جو میر صاحب کے باڑہ کے نام سے بمقام راؤپورہ مشہور تھی۔

میر سرفراز علی کے تین بیٹے میر اکبر علی، میر جعفر علی اور میر باقر علی تھے۔ اکبر علی اپنے والد کے بعد اسلحہ دار سردار نامزد کئے گئے۔ میر جعفر علی سورت کے نواب افضل الدولہ کے داماد تھے جو نواب صاحب کے بعد ان کے جانشین مقرر کئے گئے۔ اکبر علی نے ۱۸۶۰ء میں انتقال کیا۔ ان کے بیٹے میر ابراہیم علی وفا جانشین ہوئے۔ وفا اپنے چچا میر جعفر علی کے زیر تربیت تھے لہٰذا سورت میں منشی لطف اللہ فریدی سے عربی فارسی اور انگریزی تعلیم پائی تھی۔ وفا نے ۱۸۸۵ء میں وفات پائی۔ وفا اور ان کے بھائی عالم علی غالب کے شاگردوں میں سے تھے۔ وفا بہت وضع دار اور خوش رو شخص تھے۔ ان کو لحن داودی ودیعت تھا۔ ہر مہینہ اپنے گھر پر مجلس میلاد منعقد کرتے اور خود قصیدے پڑھتے۔ ان کی قصیدہ خوانی کی شہرت لکھنؤ تک پہنچی تھی۔ وفا کی شادی بڑودہ کے ایک معزز خاندان میں ہوئی تھی۔ اولاد میں چار بیٹے میر احتشام علی جادو، میر ناصر علی، میر یوسف علی اور میر محمود علی تھے۔ جادو بھی اچھے شاعروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ جادو کے فرزند میر انتظام علی گائکواڑ کے سرداروں میں سے تھے۔ انتظام علی کے بیٹوں میں راشد علی، محبوب علی اور آصف علی بقید حیات ہیں۔

قطب عالم بخاری

حضرت سید برہان الدین ابو محمد عبداللہ سید جلال الدین مخدوم جہانیاں بخاری متوفی ۷۹۱ھ خلیفہ زکریا ملتانی کے پوتے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب امام علی نقی عسکریؒ تک پہنچتا ہے۔ آپ کا سنہ ولادت ۱۳۸۸ء/۷۹۰ھ ۱۳۹۹ء/ ۸۰۲ میں سندھ سے اپنی والدہ کے ہمراہ نہروالا پٹن آئے جہاں شیخ رکن کان شکر نبیرۂ فرید گنج شکر پہلے سے موجود تھے۔ گجرات کا سلطان مظفر مخدوم جہانیاں کے سلسلہ میں مرید تھا۔ اس لئے قطب عالم کا شایان شان استقبال کیا بعدہ سلطان احمد نے آپ کو احمد آباد میں سکونت کے لیے درخواست کی حضرت قطب عالم نے احمد آباد سے قریب بٹوہ مقام پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اسی جگہ آپ کی آخری آرامگاہ ہے۔

آپ کی کرامات مشہور ہیں۔ ایک دفعہ آپ رات میں استنجا کے لئے باہر گئے تو راستہ میں کوئی چیز پاؤں سے ٹکرائی آپ کا پاؤں بھی زخمی ہو گیا تھا اس وقت آپ کی زبان سے نکلا "کیا ہے لوہا ہے لکڑی ہے کہ پتھر ہے۔ صبح کو جب اس شے کو دیکھا گیا تو اس میں ایک طرف لوہے کا حصہ معلوم ہوا دوسری طرف لکڑی معلوم ہوئی تیسرا حصہ پتھر تھا اور اس شے کا ایک حصہ ایسا ہے جس کو نہ لکڑی کہہ سکتے ہیں نہ پتھر نہ لوہا۔ یہ ایک لکڑی کی گانٹھ جیسی شے ہے لوگ اس کی زیارت کو جاتے ہیں۔ راقم نے بھی اس کی زیارت کی ہے۔ حضرت قطب عالم نے اس کو ایک کنوئیں میں ڈلوا دیا تھا مگر بعد میں ایک سلطان نے اسے باہر نکلوایا۔ سندھ کے ایک امیر کی دو لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک کی نسبت گجرات کے ایک سلطان سے اور دوسری کی نسبت شاہ عالم سے ہوئی تھی سلطان نے کچھ ساز باز کر کے اس بیٹی کو اپنے شہزادہ سے منسوب کرا لی جو شاہ عالم سے منسوب تھی۔ شاہ عالم نے اپنے والد حضرت قطب عالم سے اس بات کی شکایت کی تو حضرت موصوف نے فرمایا "بابا تساں دو ہوں دیا" آخر میں ایسا ہی ہوا کہ سلطان کے انتقال کے بعد انکی بیٹی بہن شاہ عالم کے عقد میں آگئیں۔ یہی محمود بیگڑہ کی والدہ تھیں۔ حضرت قطب عالم نے ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء میں وفات پائی۔ آپ کی اولاد میں تین بیٹے اور دو دختریں تھیں۔ حضرت قطب عالم کے سلسلہ کے لوگ قطبی کہلاتے ہیں۔

قطب عالم

حضرت سراج الدین ابوالبرکات سید محمد بن قطب عالم عرف شاہ منجھن شاہ عالم کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ آپ کا سنہ ولادت ۱۴۰۴ء/ ۸۰۷ھ اور وفات ۱۴۷۵ء/ ۸۸۰ھ ہے۔ حضرت قطب عالم کے بعد آپ کے بڑے بیٹے جانشین ہوئے تھے اس لئے شاہ عالم کا سلسلہ قطبی سلسلہ سے الگ ہوگیا تھا اس لئے شاہ عالم کے خاندان اور سلسلہ کے لوگ شاہی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ حضرت شاہ عالم کی اولاد میں پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں ہر فرزند جید صوفی اور عالم گزرا ہے۔

حضرت شاہ عالم سے کشف وکرامات کی کئی باتیں ظہور میں آئی ہیں۔ سلطان محمود بیگڑا کے باپ کا انتقال ہوگیا تو بیگڑا کی والدہ اپنے چھوٹے بچہ کو لے کر شاہ عالم کے گھر آگئی تھیں اور اپنی بہن کے ساتھ رہتی تھیں۔ جب بہن کا انتقال ہوگیا تو شاہ عالم نے بیگڑا کی والدہ سے فرمایا کہ اب تم میرے ساتھ قیام نہیں کر سکتیں تو بیگڑا کی والدہ نے عقد کی درخواست کی اس طرح یہ بھی پیش گوئی کے مطابق آپ کو اللہ کی طرف سے دیدی گئیں۔ محمود بیگڑا ایک دفعہ حضرت سے درس لے رہا تھا اس موقع پر اس کے چچا کے فرستادہ سپاہی بیگڑا کو قید کرنے کے لئے آئے اس وقت حضرت شاہ عالم نے بیگڑا سے مخاطب ہوکر فرمایا "پڑھ رے ڈوکرے" یعنی اے بڈھے پڑھ۔ سپاہیوں نے دیکھا کہ حضرت ایک بڈھے کو درس دے رہے ہیں لہذا لوٹ گئے حضرت کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے اُردو کے کئی جملے پائے جاتے ہیں۔

قاضی محمود دریائی کا خاندان

تحفۃ القاری میں مرقوم ہے کہ اس خاندان کے ایک بزرگ شاہ علی سرمست مدینہ منورہ سے ہندوستان تشریف لائے اور گجرات کے پایۂ تخت نہروالا پٹن میں سکونت اختیار کی۔ ہندو شاہ صاحب کے قیام کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن وہاں کے راجہ کے ہاں شاہ صاحب کی دعا سے بیٹا پیدا ہوا جس کا نام سدھ راج جے سنگھ رکھا گیا۔ مذکورہ سدھ راج گجرات کا مشہور و معروف راجہ گذرا ہے جس کا دور ۱۰۹۴ء/ ۴۸۶ھ تا ۱۱۴۳ء/ ۵۳۸ھ تھا (یہی سدھ راج ہونا چاہئے) شاہ صاحب نے اس کے صلہ میں مسجد تعمیر کرانے کے لئے ایک قطعہ زمین طلب

اور اس کا نام مسجد کاٹ رکھا۔ کاٹ کے معنی زبان میں فتح ہیں۔

شاہ سرمست کے بعد ان کے خلف صدق شاہ سلیمان، قطب محمود، قاضی محمود وغیرہ نے رشد و ہدایت کی خدمت انجام دی۔ قطب محمود (قاضی محمود) مخدوم جہانیاں کے اور مخدوم جہانیاں قاضی محمود کے مرید ہوئے (اخوان اللہ) اس وقت مخدوم جہانیاں نے فرمایا تھا "ساگ لپٹا بھات ہے اور بھات لپٹا ساگ ہے" (بحوالہ علی گڑھ تاریخ ادب اردو)، پروفیسر ندوی صاحب نے خطیب محمود کو دادا لکھا ہے لیکن یہ پردادا تھے)

قاضی محمد پندرہ سال کی عمر میں پٹن سے احمد آباد تشریف لے آئے تھے۔ موصوف کی اولاد میں تین بیٹے اور ایک دختر تھیں۔ ان میں ہی شاہ حمید الدین تھے۔ قاضی حمید شاہ عالم کے مرید تھے۔ بیعت کرنے کے بعد جب قاضی لوٹنے لگے تو شاہ عالم نے فرمایا کہ وہ بٹوہ میں حضرت قطب عالم کو سلام کرتے ہوئے جائیں۔ جب قاضی حمید قطب عالم کے سامنے گئے تو ——————

قطب عالم نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا اور فرمایا "برادر اھوں چاولندھا چاولندھا" اس روز سے قاضی صاحب چاولندھا کے نام سے مشہور ہو گئے۔ قاضی حمید نے قصبہ زین آباد کے قاضی سمیع الدین عرف قاضی سادھن کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ قاضی سادھن کی چار بیٹیاں یکے بعد دیگرے آپ کے نکاح میں آئیں ان میں سے بی بی فتح ملک کے بطن سے تین بیٹے ہوئے۔ ان میں قاضی محمود محبوب اللہ منجھلے بیٹے تھے۔

قاضی دریائی

قاضی محمود ۸۶۸/۱۴۶۳ء ، ۸ھ میں بمقام بیرپور قریب ریاست بالاسینور پیدا ہوئے۔ قاضی محمود کے تین بیٹوں شاہ لاڑ محمد، شاہ ابو محمد، شاہ جمال کے نام ملتے ہیں۔ قاضی محمود کو اپنے والد شاہ چاولندہ سے خلافت و اجازت ملی تھی۔

شاہ عالم کی وفات کے بعد جب قاضی محمود ان کے سجادہ نشین کی خدمت میں گئے اور برسبیل تذکرہ آپ نے فرمایا کہ میاں منجھن جو تبرک میرے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ وہ مجھے دیا جائے۔ شاہ عالم کو میاں منجھن کے خطاب سے یاد کرنا سجادہ نشین کو برا معلوم ہوا۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ ہم سب مزار شریف پر جا کر سلام کرتے ہیں جس کو جواب مل جائے وہ صحیح۔ مرآۃ احمدی کا بیان ہے کہ حضرت شاہ عالم سینہ تک مزار سے اوپر تشریف لائے اور اپنے ہاتھ سے تبرکات قاضی محمود کو عنایت کئے۔ قاضی صاحب

نے ۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء میں بمقام چانپانیر وفات پائی۔ نعش مبارک کو بیرپور لاکر سپردِ خاک کیا گیا۔ موصوف اپنے آپ کو محمود غریب کہتے تھے اور لوگ خضر سمجھتے تھے اس لئے انہیں محمود دریائی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

قاضی صاحب کے صاحبزادے بھی تصوف میں اونچا درجہ رکھتے تھے۔ ان لوگوں کا بھی تھوڑا سا کلام قدیم زبان میں پایا جاتا ہے۔ (علی گڑھ تاریخ ادب اُردو) قاضی صاحب کے کلام کا مجموعہ احمدآباد کے ایک مشہدی خاندان میں محفوظ ہے۔ راقم نے اس مجموعہ سے استفادہ کیا ہے۔

علامہ شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی

علامہ کے ایک بزرگ سلطان محمود ثانی گجراتی کے دورِ حکومت میں عرب سے ہندوستان تشریف لائے اور چانپانیر عرف محمدآباد میں سکونت اختیار کی۔ شاہ وجیہ الدین قدس سرہٗ بہ ماہ محرم ۹۱۰ھ مطابق ۱۵۰۴ء میں بمقام چانپانیر پیدا ہوئے۔ لفظ "شیخ" سے سالِ ولادت برآمد ہوتا ہے۔ پانچ سال کی عمر سے تینتیس سال کی عمر تک شاہ صاحب نے کسبِ علوم ظاہری و باطنی کیا اور اس کے بعد سے آخر عمر تک درس و تدریس اور رشد و ہدایت کی خدمت انجام دیتے رہے۔ کئی تصانیف، شرحیں اور حواشی آپ سے یادگار ہیں۔ علامہ نے بعمر اٹھاسی سال ۹۹۸ھ مطابق ۱۵۹۰ء بمقام احمدآباد انتقال کیا۔ مزار محلہ خان پور میں ہے۔ اسی جگہ علامہ کے ایک معتقد صادق خاں نے مقبرہ، اقامت گاہ اور مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ علامہ کے بعد ان کے صاحبزادہ نے ایک مدت تک درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔

علامہ کی اولاد گجرات، خاندیس، برھانپور، دکن وغیرہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ علامہ کے حقیقی بھائی شاہ برھان الدین نے برھانپور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ حضرت برھان الدین کے فرزند شاہ ہاشم نے بیجاپور میں مستقل اقامت اختیار کر لی تھی۔

سید سراج الدین عرف باوا میاں قادری کا خاندان

اس خاندان کے ایک بزرگ سید تاج الدین کو ان جد بزرگوار حضرت غوث الاعظم نے بشارت دی کہ وہ بنگالہ جائیں۔ سید تاج الدین نے حکم کی تعمیل کی۔ بنگالہ میں سلطان حسین نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اپنی دختر کو آپ کے عقد میں دینا چاہا۔ شاہ صاحب نے اپنے بیٹے ابوالحیات کو بغداد سے طلب کیا اور ان سے سلطان کی دختر کا عقد کرا دیا اور ابوالحیات کو اپنا جانشین مقرر

کر کے خود بغداد لوٹ گئے۔ شاہ صاحب نے لوٹتے ہوئے پنجاب میں بمقام سادھوڑا ضلع انبالہ قیام کیا۔ وہاں لوگوں کو آپ سے عقیدت ہوگئی اور وہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے تھے لیکن شاہ صاحب نے فرمایا کہ ان کا پوتا سادھوڑا آئے گا اس کے ہاتھ پر وہ بیعت کریں۔

شاہ ابوالحیات کے تین بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک بیٹے شاہ قمیص کی شادی ان کے اپنے ماموں شاہ نصیب کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ شاہ قمیص بنگالہ سے حرمین شریفین گئے اور وہاں سے بغداد رکتے ہوئے ہندوستان میں سادھوڑا پہنچے۔ بادشاہ ہمایوں اور اکبر شاہ صاحب کے بہت معتقد تھے۔ حضرت قمیص نے ایک دفعہ بنگالہ کا سفر کیا اور وہاں سے بہار گئے جہاں آپ کا وصال ہوگیا۔ نعش مبارک کو سادھوڑا لاکر سپرد خاک کیا گیا۔

شاہ قمیص کے بعد اس خاندان کے ایک بزرگ شاہ محمد عارف بہ سلسلۂ رشد و ہدایت گجرات پہنچے اور احمد آباد کے قریب ویرم گاؤں میں مستقل اقامت اختیار کرلی۔ شاہ محمد عارف کی تیسری چوتھی پشت میں سید سراج الدین عرف باوامیاں قادری گذرے تھے۔ کنہوں نے ۱۹۱۱ء میں وفات پائی۔ کنہ کے اکلوتے بیٹے سید مصطفےٰ حسن کی عمر خدمت الناس میں گذری۔ موصوف بہت خوش مزاج تھے۔ ان کا حلقۂ احباب بھی وسیع تھا۔ مصطفےٰ احسن صاحب کا انتقال بمقام بمبئی یکم مارچ ۱۹۷۱ء میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۵ ، سال تھی۔ نعش احمد آباد لائی گئی اور ان کو بنگلہ کے باغیچہ میں ان کے والد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

مصطفےٰ میاں صاحب کی ایک شادی بڑودہ کے نواب صدرالدین صدر کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے تین بیٹے سراج الدین، ضیاالدین، ظہیرالدین ہیں۔ سراج الدین اور ضیاالدین نے امریکہ میں مستقل اقامت اختیار کرلی ہے۔ ظہیرالدین کرنٹ بک ہاؤس کے مالک ہیں۔ ظہیرالدین کی شادی سہسوان کے سید اظہر علی اظہر کی دختر سے ہوئی ہے۔ مصطفےٰ احسن صاحب نے بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی سالیر کے قلعہ دار خاندان کے سید محمد علی سالیری کی دختر سے کی۔ ان کے بطن سے تین بیٹے منیرالدین، افتخارالدین اور صلاح الدین ہیں۔ منیرالدین ڈاکٹر کی حیثیت سے برطانیہ میں خدمت انجام دیتے ہیں۔ افتخارالدین بمبئی کے مشہور و معروف آرکیٹکچروں میں شمار کئے جاتے ہیں اور صلاح الدین نے امریکہ میں سکونت اختیار کرلی ہے۔

کھمبایت کا نواب خاندان

کھمبایت گجرات کی قدیم ترین بندرگاہوں میں سے ہے۔ عہد قدیم میں سمندر پار کے تاجروں

کی زبان پر کھمبایت کا نام عام تھا۔ کھمبایت ایک تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے وہاں مختلف قوموں کے لوگ آتے اور بعض نے اسے اپنا وطن بھی بنالیا تھا۔ خصوصاً عرب اور ایرانی تاجروں کی آمد ورفت بہت زیادہ تھی۔ کھمبایت میں مسلمانوں کی فتح گجرات سے قبل کی کئی نشانیاں ملتی ہیں۔ بمبئی کے ابھرنے کے بعد انیسویں صدی سے اس بندرگاہ کی اہمیت ختم ہو چکی تھی مگر موجودہ دور میں تیل کی دریافت کے بعد سے پھر اس کا نام زبان زد خاص و عام ہو گیا ہے۔

مسلم عہد میں کھمبایت میں بھی متصدی کا تقرر کیا جاتا تھا اور یہ گجرات کے صوبہ کے ماتحت رہتا تھا۔ ۱۷۱۴ء میں مومن علی کھمبایت کا متصدی تھا۔ مگر سورت میں اس کا قیام رہتا تھا۔ نجم ثانی مرزا محمد جو پٹیلا د کا فوجدار تھا اس کو ۱۷۲۹ء میں مومن خاں کا خطاب دے کر کھمبایت کا دیوان مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۷۳۶ء میں مومن خاں کو گجرات کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ مومن خاں کو رتن سنگھ بھنڈاری کے خلاف لڑنا پڑا تھا۔ اس امر میں مومن خاں نے مرہٹوں سے کمک حاصل کی تھی اور شرط یہ تھی کہ گجرات کا نصف محصول مرہٹوں کو دیا جائے۔ ۱۷۴۳ء میں مومن خاں کا انتقال ہو گیا۔ مومن خاں پہلے سے نصف احمد آباد گائیکواڑ کو دے چکا تھا۔ اس وقت مومن خاں پہلے سے نصف احمد آباد گائیکواڑ کو دے چکا تھا۔ اس وقت مومن خاں کا بیٹا مفتخر خاں کھمبایت کا ناظم تھا۔ ۱۷۴۸ء میں دہلی سے اس کو مومن خاں دوم کا خطاب ملا تھا۔ اس نے احمد آباد کے مسلمانوں اور مرہٹوں کی بگڑی ہوئی سیاست میں پھر ایک بار گی ۱۷۵۶ء میں احمد آباد میں اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ لہٰذا ۱۷۵۸ء کھمبایت میں یہ خود مختار نواب بن گیا اور مرہٹوں سے ایک لاکھ وظیفہ قبول کر لیا۔

مومن خاں دوم پچیس سال کھمبایت کا نواب رہا اور ۱۷۸۳ء میں وفات پائی۔ مومن خاں دوم کے بعد مومن خاں کا داماد محمد قلی خاں جانشین مقرر ہوا۔ اس کا دور ۱۷۸۳ء تا ۱۷۸۹ء ہے۔ ۱۷۸۹ء میں فتح علی خاں نواب بنا۔ فتح علی کو دہلی سے نجم الدولہ ممتاز الملک کا خطاب اور چھ ہزاری منصب عنایت ہوا تھا۔ فتح علی نے ۱۸۲۳ء میں وفات پائی یہ لاولد تھے اس لئے ان کے بھائی یاور علی کو نامزد کیا گیا لیکن یاور علی نے اپنے بیٹے حسین یاور خاں کو مسند پر بٹھلایا۔ یاور حسین خاں نے ۱۸۸۰ء میں وفات پائی۔ ان کے عہد میں سورت کے استاد شاعر میاں بھو دربار کے شاعر اور وکیل تھے۔ یاور حسین خاں کے سات بیٹے تھے۔ ان میں سے فرزند اکبر جعفر علی کو مسند پر بٹھلایا گیا۔ موصوف کا دور نوابی ۱۸۸۰ء تا ۱۹۱۵ء تھا۔

جوناگڈھ کا نواب خاندان

جوناگڈھ کے نواب 'بابی' کہلاتے ہیں۔ بابیوں کا اصل وطن افغانستان ہے۔ ہمایوں کے عہد

حکومت میں اس خاندان کے بزرگ ہندوستان آئے تھے۔ اس لفظ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ دیّۂ جنیر پر جو فوج رہتی تھی۔ اس کے اعلیٰ فوجی افسر کو باب کی نسبت سے بابی کہا جاتا تھا۔ بابی خاندان کی تین ریاستیں جوناگڑھ، رادھنپور (رادھن پور) اور بالاسینور[1] قائم تھیں۔ ان ریاستوں کے علاوہ کاٹھیاواڑ میں بابیوں کی کئی ٹھکرائیاں اور زمینداریاں بھی قائم تھیں۔

گجرات میں سربلند خاں (۲۵ء۱۷) صوبیدار کے عہد سے گجرات کی سیاست میں بابیوں کے نام پائے جاتے ہیں۔ ۲۵ء۱۷ اور ۳۰ء۱۷ کے درمیان صفدر خاں (محمد مظفر) بابی بن شیر خاں بن بہادر خاں بن عثمان خاں بن عادل خاں کا ایک بیٹا جواں مرد خاں جو پٹیلاد کا فوجدار تھا وفات پا گیا۔ سربلند خان نے صفدر خاں کے دوسرے بیٹے صلابت خاں کو پرسہ دیا اور جواں مرد خاں مرحوم کے بیٹے کمال الدین خاں کو جواں مرد کا خطاب اور منصب عطا کئے۔ احمد آباد کی سیاسی توڑ جوڑ میں یہ جواں مرد خاں پیش پیش پایا جاتا ہے۔ یہ ۴۳ء۱۷ تا ۵۳ء۱۷ گجرات کے صوبیدار کے عہدہ پر بھی فائز رہا۔ جوان مرد خان نے مرہٹوں کا کئی بار مقابلہ کیا لیکن آخر کار جب مرہٹے ۴۳ء۱۷ میں احمد آباد پر غالب آ گئے تو جواں مرد خاں نے ایک لاکھ روپیہ وظیفہ اور رادھن پور کی خود مختار ریاست پر اکتفا کرتے ہوئے سیاسی میدان سے ہٹ گیا۔ اسی نواب سے ریاست کا قیام عمل آیا۔

صفدر خاں کا دوسرا بیٹا محمد صلابت خاں ویرم گاؤں کا منصدی تھا۔ اس نے کسی موقع پر جام نگر کے مہاراجہ جام صاحب کو مدد پہنچائی تھی۔ اس کے صلہ میں اس کو سورٹھ (کاٹھیاواڑ، سوراشٹر کا مخفف سورٹھ) تین گاؤں دئے گئے تھے۔ صلابت خان نے ۳۰ء۱۷ میں انتقال کیا تو اس کی جاگیر بالاسینور کے نواب کے بیٹے شیر خاں (محمد بہادر) کے نام منتقل کر دی گئی۔ شیر خاں کو ۲۹ء۱۷ میں [illegible] فوجدار مقرر کر کے بھیجا گیا تھا۔ شیر خاں نے بیس سال کی مدت میں اپنے قدم جما لئے اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس طرح جوناگڑھ کی ریاست کا پہلا نواب شیر خانجی بن صلابت خان قرار پایا۔ شیر خانجی نے ۲۹ ستمبر کو ۵۸ء۱۷ میں وفات پائی۔ اس کا مزار بمقام جوناگڑھ چیتا خان کی مسجد میں ہے۔ شیر خان کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا مہابت خانجی شیر خان کے بعد جانشین قرار دیا گیا۔ مہابت خان نے سولہ[2] سال حکومت کی اور ۱۶ دسمبر مطابق ۲۷ رمضان المبارک (۱۱۸۸ھ) ۱۷۷۴ء میں انتقال کیا۔ نواب مہابت خان کے بھائی سردار محمد خان کو بالاسینور[1] کی جاگیر دی گئی تھی۔

---

[1] بالاسینور احمد آباد کے قریب اندرونی علاقہ میں واقع ہے۔ اسی کے قریب بمقام بیرپور قاضی محمود دریائی کی آخری آرامگاہ واقع ہے۔

سردار محمد خاں نے ۱۷۶۰ء میں بالاسینور کو خود مختار ریاست کی شکل دیدی اس طرح سردار محمد خاں بالاسینور کا پہلا نواب قرار پایا۔

نواب مہابت خان کا جانشین ان کا فرزند اکبر محمد حامد (اوّل) ہوا۔ نواب حامد خانجی بینتیس۳ سال بر سر اقتدار رہے اور پینتالیس سال کی عمر میں ۱۸۱۱ء میں وفات پا گئے۔ نواب موصوف صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ نذر نیاز بھی بہت اہتمام سے کیا کرتے تھے۔ ریاست کے معاملات میں بڑی دانشمندی کے ثبوت دیئے ہیں۔ ایک بے ریا اور بے تعصب نواب تھے۔ محمد حامد خان کے بعد ان کے بیٹے محمد بہادر ثانی جانشین ہوئے۔ محمد بہادر نے ۲۹ سال حکومت کرنے کے بعد ۴۵ سال کی عمر میں بتاریخ ۲۷ مئی ۱۸۴۰ء میں انتقال کیا۔ موصوف بہادر، فیاض اور رحم دل نواب گذرے ہیں۔ نواب محمد بہادر خان ثانی کے تین بیٹے تھے۔ فرزند اکبر حامد خان ثانی ۱۸۴۰ء میں جانشین ہوئے اور گیارہ سال بر سر اقتدار رہنے کے بعد ۱۸۵۱ء میں انتقال کیا۔ حامد خان کو موسیقی، شطرنج، پتنگ بازی، نشانہ بازی سے بہت شغف تھا۔ یہ علمی ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ کہتے ہیں نواب بہت حسین و جمیل تھے۔ حامد خان ثانی کے بعد ان کے فرزند محمد مہابت خان ثانی چودہ سال کی عمر میں جانشین ہوئے۔ انھوں نے ۱۸۸۲ء میں انتقال کیا۔ نواب صاحب نے ریاست میں تعلیم و تربیت کی طرف بطور خاص توجہ دی۔ ۱۸۶۷ء میں ایک کتب خانہ بہادر خان جی لائبریری کے نام سے قائم کیا۔ ریاست سے گزٹ قسم کا ایک رسالہ 'دستور العمل' کا بھی اجرا کیا گیا تھا۔ ایک انگریزی ثانوی اسکول بھی قائم کیا گیا تھا۔ موصوف نے ۴۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کے بعد ۱۸۸۲ء میں محمد بہادر ثالث ساتویں نواب ہوئے۔ محمد بہادر نے ۳۶ سال کی عمر میں بہ سنہ ۱۸۹۲ء وفات پائی۔ محمد بہادر ثالث کے دو بیٹے عادل خان اور رسول خان تھے۔ بعض وجوہات کی بنا پر چھوٹے بیٹے رسول خانجی کو نواب قرار دیا گیا۔ اس عہد میں نواب کے ماموں بہاالدین وزیر تھے۔ بہاالدین بہت سیاستداں وزیر تھے۔ جوناگڈھ کا بہاالدین کالج ان کی یادگار ہے۔ نواب نے بعمر ۵۵ سال ۱۹۱۱ء میں انتقال کیا۔ ۱۹۱۱ء میں ولی عہد مہابت خاں کی عمر گیارہ سال تھی لہذا ۱۹۲۰ء میں اختیارات دے گئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد نواب صاحب پاکستان چلے گئے جہاں ان کا انتقال ہو گیا۔

مانگرول کا نواب خاندان

مانگرول کاٹھیاواڑ سوراشٹر میں گجرات کی ایک قدیم بندرگاہ ہے۔ مسلمانوں کی فتح گجرات

کے بعد یہ مسلم قلمرو میں شامل کیا گیا تھا۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں یہاں کے صوبیدار عزالدین آرام شاہ نے ۷۷۵/۱۳۷۲ء میں جامع مسجد تعمیر کرائی تھی جو اب تک موجود ہے۔ جید صوفی سید سکندر ترمذی اور مخدوم جہانیاں جہاں گشت جیسے صوفیوں کی آخری آرامگاہیں یہیں ہیں۔

ایک زمانہ میں مانگرول مرہٹہ پیشوا کے قبضہ میں تھا۔ ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء میں یہاں کے دو مسلم افسروں شہاب الدین اور فخر الدین نے مرہٹوں کو نکال باہر کیا اس طرح دوبارہ مسلم دور شروع ہوا۔ ایک قصہ مشہور ہے کہ مانگرول کا مرہٹہ سردار سال میں ایک دفعہ پوجا کے لئے کامناتھ کے مندر پر جایا کرتا تھا۔ شہاب الدین و فخر الدین مرہٹوں کے مسلم افسروں میں سے تھے۔ شہر پناہ کے دروازہ کے قریب ایک صوفی بھی رہتے تھے۔ ایک وقت انھوں نے ایک بڑا کیل لے کر زمین میں دفن کیا اور کہا کہ شیخ کی میخ گاڑی (دفن کی) اور مرہٹہ کی نکال پھینکی۔ اس کے بعد جب مرہٹہ سردار کامناتھ کے مندر پر گیا تو مسلم افسروں نے شہر کے دروازے بند کر دئے جب وہ واپس آیا تو مسلمانوں سے جنگ ہوئی چونکہ وہ تمام فوج کے ساتھ باہر گیا تھا۔ آخر مرہٹہ سردار مارا گیا اور ادھر شہاب الدین فخر الدین بھی شہید ہوئے۔ ان کے بعد فخر الدین کے بیٹے شیخ میاں نے مانگرول کو اپنی خود مختار ریاست بنا لیا۔ ۱۷۶۴ء میں جوناگڑھ کے نواب مہابت خاں اول نے مانگرول پر دھاوا بول دیا مگر نواب کو کامیابی نہیں ہوئی اس کے بعد سے مانگرول کی خود مختاری قائم رہی۔

شیخ میاں کے بعد نواب شیخ بدرالدین جانشین ہوئے۔ موصوف مزاج کے بہت تیکھے تھے ایک دفعہ نواب بدرالدین اپنی ریاست سے باہر کسی بزرگ کے مزار پر زیارت کے لئے گئے ہوئے تھے وہاں جانے کے لئے جوناگڈھ ریاست سے گذرنا ہوتا تھا واپسی پر جوناگڈھ میں ان کا قافلہ نے منزل کی تھی۔ جوناگڈھ کے نواب صاحب نے سنا تو ان کے اعزاز میں دعوت کا انتظام کیا۔ بدرالدین قدآور شخص تھے اور ان کا پیٹ بھی بہت بڑا تھا اس لئے کمر سے تلوار باندھتے تو چلنے میں تلوار زور زور سے آگے پیچھے ہلتی رہتی تھی۔ جب یہ جوناگڑھ کے دربار میں پہنچے تو شاہ نواب محمد حامد اول متوفی ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء نے استقبال کیا اور از روئے تمسخر کہا کہ شیخ صاحب تلوار ذرا کس کر باندھئے۔ بدرالدین نے طرح دیدی اور خاموش رہے۔ جب جوناگڈھ سے کوچ کیا اور جوناگڈھ کی سرحد کے ایک مقام وتھلی پر پہنچے (جہاں سے ان کی ریاست شروع ہوتی ہوگی) تو اپنے رسالہ کے سپاہیوں سے اس کو لوٹنے کا حکم دیا اور خوب لوٹا اور بعد میں جوناگڈھ کے قبضہ کے افسر سے کہا کہ اپنے نواب سے جا کر کہنا کہ بدرالدین نے تلوار کس کر باندھ لی ہے۔

نواب بدرالدین کی شادی سومناتھ پٹن کے قاضی خاندان میں عظیم الدین عرف شیخ دین بن قاضی شیخ محمد بن قاضی شیخ مصطفےٰ صدیقی کی لڑکی سلطان بی سے ہوئی تھی۔ شیخ دین مثنوی نگاروں میں سے تھے۔ ان کی مثنوی مانگرولی شاہ کا قصہ، کالی گوری وغیرہ مشہور ہیں۔ یہی خاندان جوناگڈھ کے مشہور فاضل ادیب ونقاد قاضی احمد میاں اختر صاحب جوناگڈھی مرحوم کا ننھیال ہے۔

نواب شیخ بدرالدین کے بعد ان کے فرزند باپو میاں جانشین ہوئے اور باپو میاں کے بعد ۱۸۷۵ء کے آس پاس مانگرول کے نامی گرامی نواب حسین میاں صاحب جانشین ہوئے۔ حسین میاں صاحب نے اپنے عہد میں علوم وفنون ادیب وشاعر وغیرہ کی بڑی سرپرستی کی ہے۔ خود بھی فنون لطیفہ میں بڑا درک رکھتے تھے علم موسیقی میں انہیں یدطولیٰ حاصل تھا۔ بڑے بڑے فن کار ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے جھجکتے تھے۔ ساز طبلہ میں اتنی مہارت رکھتے تھے کہ چار الگ الگ تال دونوں پاؤں اور دونوں ہاتھوں سے دیتے اور ذرا قصور نہ ہوتا۔ اسی طرح غلط سُر و پر استادوں کو فوراً ٹوک دیتے تھے۔ سورت کی مشہور گویا طوائف عیدن بائی نے انہیں کی سرپرستی میں علم موسیقی میں کمال حاصل کیا تھا۔ شاعروں کی سرپرستی میں بھی نواب موصوف نے اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ اگرچہ جوناگڑھ کے مقابلہ میں یہ بہت چھوٹی ریاست تھی مگر مانگرول میں اہل کمال کا جمگھٹا تھا۔ داغ دہلوی، جلال لکھنوی، مشتاق رامپوری وغیرہ مانگرول کو اپنی جھنتوں سے نوار چکے ہیں۔ مشتاق رامپوری حسین میاں صاحب کی داد ودہش کی تعریف سن کر رامپور سے مانگرول آئے۔

مانگرول میں جب یہ شام کے وقت محل پہنچے تو باغ کے دروازہ پر دربان نے انہیں اندر نہیں جانے دیا۔ حسین میاں صاحب روزانہ شام میں اپنے احباب کے ساتھ باغ میں بیٹھتے اور وہاں شراب کا دور چلتا تھا لہٰذا کسی غیر کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مشتاق نے دربان سے پوچھا کہ آخر باریابی کا کیا طریقہ ہونا چاہئے ایسے میں راقم کے بہنوئی شیخ احمد میاں بن نورالدین صدیقی جو حسین میاں صاحب کے بھانجے تھے سات آٹھ سال کی عمر ہوگی کھیلتے ہوئے باغ کے دروازہ پر پہنچ گئے۔ دربان نے کہا کہ ان میاں سے کہو۔ مشتاق نے ایک کاغذ پر یہ قطعہ لکھ کر میاں کو دیا اور کہا کہ سرکار کی خدمت میں پہنچا دو میاں۔ قطعہ ہے:

چھوڑ کر دارالسرور رام پور　　آگیا مشتاق بہ پابوس حضور
دیر سے حاضر یہ خانہ زاد ہے　　اے سلیماں جاہ کیا ارشاد ہے

احمد میاں صاحب نے یہ کاغذ اپنے ماموں صاحب کے ہاتھ میں دیدیا اور کہا باہر کوئی آدمی

کھڑا ہے اس نے دیا۔ قطعہ دیکھتے ہی حسین میاں صاحب نے باریابی کا حکم دیا۔ اس کے بعد مشتاق کو دربار سے تنخواہ مقرر کردی گئی۔

حسین میاں صاحب نے لاولد انتقال کیا لہذا ۱۹۰۸ء میں ان کے بھائی جہانگیر میاں صاحب جانشین ہوئے جہانگیر میاں صاحب جانشینی کے پہلے حکومت برطانیہ میں کلکٹر کے عہدہ پر فائز تھے۔ جہانگیر میاں بڑے دانشمند نواب تھے۔ جب ان کی جانشینی کا جشن منایا گیا تو ان کے دیوان نے ان سے کہا کہ سرکار! قدیم سے ریاست کی یہ روایت ہے کہ جانشینی کے جشن کے وقت شہر مانگرول کے لوگوں کی دعوت کی جاتی ہے لہٰذا حکم دیجیے کہ اس کا انتظام کیا جائے نواب صاحب نے کہا کہ اس دعوت میں کتنا خرچ ہوتا ہے دیوان نے جواب دیا دس ہزار روپیہ خرچ ہوگا۔ نواب صاحب نے کہا تو خزانہ سے یہ رقم نکلوا لاؤ۔ دیوان صاحب نے مذکورہ رقم نواب صاحب کے سامنے پیش کی تو نواب صاحب نے کہا: یہ رقم یہاں چھوڑ جاؤ، اب کھانے پینے کی کوئی دعوت نہیں ہوگی یہ رقم غریب بچوں کی تعلیم کے لیے خرچ کی جائے گی"

نواب صاحب نے عمر بھر تعلیم میں بطور خاص دلچسپی لی۔ اپنے جیب خرچ کی رقم اسی مقصد سے محفوظ کرتے جاتے اور اس میں سے قابل طلبا کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت بھی بھیجا کرتے تھے اور ایک یتیم خانہ اور صنعت وحرفت کا اسکول بھی قائم کیا تھا۔ دینی تعلیم کے بڑے طرفدار تھے جب انگلو اردو ہائی اسکول کے چندہ کے لیے راقم کے والد گئے تو چندہ تو دیا مگر پہلے یہ دریافت کیا کہ اسکول میں قدیم ڈھب کی دینی تعلیم تو نہیں دی جاتی۔ اسی موقع پر جہانگیر میاں صاحب کے پوتے ناصر میاں صاحب خلف عبدالخالق صاحب شام کے وقت والد کو تفریح کے بہانہ سے اپنے ایک شاہی باغ میں لے گئے اور والد کو پانسو روپیہ چندہ عنایت کیا اور کہا کہ میں آپ کی جدوجہد سے بہت متاثر ہوا ہوں اور یہ رقم میری طرف سے چندہ میں شامل کر لیجیے اور میرا نام کسی جگہ ظاہر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ جہانگیر میاں صاحب نے پختہ عمر میں ۱۹۳۲ء کے آس پاس انتقال کیا۔ جہانگیر میاں صاحب کے جانشین ان کے فرزند عبدالخالق صاحب ہوئے۔ عبدالخالق صاحب کرکٹ کے ایک اچھے کھلاڑی تھے۔ انہیں مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ ان کے کتب خانہ میں تقریباً ہر موضوع پر کتابیں ملتی ہیں عبدالخالق صاحب نے جانشینی کے چھ سال کے بعد ہی انتقال کیا۔ ان کے جانشین ان کے فرزند ناصر میاں صاحب ہوئے ناصر میاں صاحب کو کشتی کا بڑا شوق ہے خود اس کرتب سے خوب واقف ہیں۔ ریاستوں کے الحاق کے بعد موصوف پاکستان چلے گئے۔

جہانگیر میاں صاحب کی اولاد میں ان کے بیٹے محمد بدر، عبدالعزیز، محمد صادق، غلام علی بقیدِ حیات ہیں۔ محمد صادق صاحب کی شادی نواب مسعود عالم خاں آف بیلہ کی دختر سے ہوئی ہے۔ علم موسیقی اس خاندان میں موروثی چلا آتا ہے۔ اس خاندان کا ہر فرد اس فن میں بڑا درک رکھتا ہے۔ محمد بدر صاحب تو سوراشٹر کے تان سین کہلاتے ہیں۔ اسلامک کلچر کا مطالعہ بھی وسیع ہے۔ غلام علی صاحب بھی علم و ادب سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔

سخنورانِ گجرات ضمیمہ ۲

گجرات میں اُردو نثر

گجرات کے نثری کارنامے ہنوز پردۂ خفا میں ہیں۔ دکن میں نظم کے ساتھ ساتھ نثری کارنامے بھی منظرِ عام پر آچکے تھے۔ مذہب و تصوف و اخلاق کے سلسلہ میں نفوسِ قدسیہ کے چھوٹے چھوٹے اُردو رسالوں کے علاوہ قصہ کہانی سے متعلق داستانی ادب بھی پیدا ہوگیا تھا مگر گجرات میں عہدِ ولی تک کوئی نثری کارنامہ دستیاب نہیں ہوا ہے۔ ولی کے بعد شاعر میر عبدالولی عزلت پہلے شخص ملتے ہیں جنھوں نے جدتِ طبع سے کام لے کر اپنے اُردو دیوان کا مختصر دیباچہ اُردو میں لکھا ہے۔ دیباچہ کئی لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں تھوڑا حصہ ایسا ہے جہاں قافیہ پیمائی نہیں ہے۔ بعض جگہ ٹھیٹھ ہندی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جیسے "اے سنسار کے کرنہار"، "ہم سے پاپی پن لیویں"، "پتر سید سعد اللہ قدس سرہٗ کا" وغیرہ جہاں جہاں فارسی جیلے فقرے ہیں وہاں فارسی کا اندازِ بیان ظاہر ہوتا ہے۔ یہ دیباچہ اس لئے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ مرزا رفیع سودا نے ۱۱۸۰ھ میں اپنے دیوان کا دیباچہ اُردو میں لکھا تھا جس میں فارسی انداز اختیار کیا گیا ہے اور عزلت نے اس سے قبل ۱۱۷۲ھ میں اس بدعتِ حسنہ کو اختیار کیا تھا۔ نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

مختصر دیباچۂ ہندی مخترع فقیر عزلت عفی اللہ عنہ

"اے سنسار کے کرنہار، سب خوبیاں ازل سے ابد تئیں تجھے ایسی آپ ہی آپ ثابت نہیں کہ ہماری زبانِ قاصر بیان سے تیری بڑائی کا حق ادا ہوسکتا ہو اور اے دو جگ کے ایک کرتار، تیرا منزّہ ذات و صفات ایسا دور باش عقلوں کا نہیں کہ جبرئیلِ اندیشے کا تیری حریمِ قدس

کے دور گردوں سے نسبت نزدیکی کی رکھتا ہو۔ تو ویسا ہے جیسا کچھ آپ کو آپ سراہ چکا ہے۔"

"..... اور اوس کے سب مصرعے (مصرع) سوختگی مضامین سے بزم سخن کی شمع کئے ہیں تا چراغ معنی کے پروانہ صورتوں کی آنکھ ہمارے خیال میں اشکبار ہے اور اس کی ہر بیت بہار معنی کے جنوں میں مصرعوں کے دوھات سے گریبان پھاڑ رہی ہے اور ہر سطر ایک دیوانۂ مطلون جنون کو زنجیر کر سر سوختگی بیاں سے خموشی کے نالے پکار رہی ہے۔" (دیوان عزلت)

منشی لطف اللہ فریدی سورت کے علما میں سے تھے۔ یہ اُردو فارسی کے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے انگریزی زبان میں اپنی سوانح عمری بھی لکھی ہے جو ۱۸۵۸ء میں لندن سے شائع ہو چکی ہے۔ ان کے دو اُردو رسالوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ ایک رسالہ فوائد العجائب کے نام سے ہے۔ یہ حکمت جراحی سے تعلق رکھتا ہے۔ مذکورہ رسالہ مسٹر کاکس (COEKS) کے رسالہ کا ترجمہ ہے۔ انھوں نے اپنی طرف سے اس میں اضافے بھی کئے ہیں۔ فوائد العجائب ۱۸۵۹ء/۱۲۷۶ھ میں سورت کے قادری پریس میں چھپا تھا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کے استاد شاعر محمد منظور شاگرد میاں مجھو نے بھی اُردو نثر میں چند یادگاریں چھوڑی ہیں۔ منظور کا ایک مذہبی رسالہ ردیادہ گوئی ملتا ہے۔ منظور نے دیوان ولی بھی مرتب کیا ہے جس کا تفصیل دیباچہ اُردو میں ہے۔ اس کا سنہ اشاعت ۱۸۷۳ء/۱۲۹۰ھ ہے۔ منظور نے ۱۸۶۰ء میں سورت سے منظور الاخبار کے نام سے ایک اخبار کا بھی اجرا کیا تھا۔ پتہ نہیں چلا کہ مذکورہ رسالہ کب تک نکلتا رہا۔ رسالہ مشن پریس میں چھپتا تھا۔

پیر غلام بابا علم دوست رئیس تھے۔ انھوں نے امام غزالی کی احیاء العلوم کا اردو میں ترجمہ کسی سے کرایا تھا۔ مذکورہ ترجمہ کا نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہوا ہے۔

سورت کے ایک عالم مولوی برکت اللہ کی ایک تصنیف ملتی ہے جو چہار باب اس کا اُردو ترجمہ ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۸۹۵ء/۱۳۱۳ھ ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں سید عبدالرحمٰن عرف جیا صاحب عیدروس نے بھی تاریخ میں ایک کتاب تاریخ سورت کے نام سے یادگار چھوڑی ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۸۸۹ء/۱۳۰۷ ہے۔ اس کا مخطوطہ راقم کے پاس محفوظ ہے۔ جیا صاحب کی زبان پر عبور نہیں تھا۔ گجراتی آمیز اُردو لکھی ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں ایک عالم و شاعر مولانا محمد نور عرف نور محمد سورتی گذرے ہیں۔ اُردو میں ان کا ایک رسالہ مسلم الثبوت فی نسخ الفنوت ملتا ہے۔ یہ مذہبی رسالہ ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۹۰۳ء ہے۔ مولانا سورتی شاعر

بھی تھے۔ ان کا ایک نعتیہ دیوان ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوا ہے۔ مولانا کو عربی زبان پر بھی قدرت حاصل تھی۔ دیوان میں عربی قصیدے بھی ہیں۔ مولانا کی ایک اردو مثنوی تحفۃ الفقر کے نام سے بھی ہے۔ مولانا نے دینی تبلیغ و تعلیم کے لئے اپنی عمر وقف کر دی تھی۔ آخر عمر میں موصوف نے سورت سے قریب مقام رامن میں سکونت اختیار کرلی تھی۔

سخنوران گجرات ضمیمہ ۲

شعراء کی فہرستیں

فہرست شعراء از آئینۂ تاریخ تالیف سید عبدالرحمٰن عرف جیا صاحب عیدروس

سنہ تالیف ۱۸۸۰ء/۱۲۹۷ھ

			بینوا۔
افضل، باچھومیاں	سردار۔ سردار خاں صوبیدار۔	یکتا۔ لعل شانہ گر	بیہوش۔ رمضان علی بریلوی
امیر۔ سید باقر علی	شائق۔ سید غیاث الدین	فہرست شعراء از حدیقہ احمدی۔	بخشش۔ شیخ رضی الدین
اخلاص	شعلہ۔ بڑے آقا	احمد۔ محمد احمد گجراتی معاصر ولی	بریاں
اخگر	شیدا۔ سید عبدالقادر	احمد۔ سید احمد قادری	باقی۔ از متقدمین
آزاد	علوی۔ سید علی عیدروس	ارشاد۔ احمد آبادی	تجرد۔ شاہ عبداللہ
بخشش۔ شیخ احمد	عزلت۔ عبدالولی	اظہر	چتر۔ حاجی میاں کشمیری
بہادر۔ شیخ بہادر	غریب۔ عبدالحکیم	اخگر	حامد۔ شیخ حامد
باقر۔ منشی باقر علی	غنی۔ خواجہ ابراہیم	اختر۔ احمد علی حیدرآبادی	حامد محمد عبید خاں رامپوری
تجسُر۔ شاہ عبداللہ	غضنفر۔ بابا شیر علی	اقفر۔ ارشاد علی برہانپوری	حیدر بخش۔ دکھنی
حسن۔ سید حسن بخاری	غنی۔ نواب عبدالغنی	افق۔ از متقدمین	حزیں۔ سورت
حسن جی	فاضل۔ ڈوسو میاں	اخلاص	خوشنود۔ گجرات
دلکش۔ حافظ داؤد	قطب۔ ملا قطب الدین	افضل	دردمند۔ سورت
سمجھو۔ غلام محمد	منظور۔ شیخ عبداللہ	افضل۔ محمد افضلی	دیر۔ حاجی میاں بن
سرور۔ آقا غلام حسین تبریزی	مشتاق۔ ابن داؤد دلکش	اکرم	عبداللہ دہلوی
سیاح۔ میاں داد خاں	ولی۔ محمد ولی اللہ	بہادر۔ شیخ بہادر	دلکش۔ حافظ داؤد سورت۔

داغ۔ امداد علی۔ نو ہندوستان	ظہور۔ گجرات	نازاں۔ پیر محی الدین خلف۔	بسمل
رفعت۔ سید رفعت اللہ	عمر۔ گجرات	نواب نصیر الدین سورت	بریاں
رحمت۔ رحمت اللہ۔ احمد آباد	عباس۔ بھروچ	وفا۔ گجرات	بلیغ
رقاص۔ گجرات	عاجز۔ گجرات	وصل۔ سورت	بہادر
رضی۔ متقدمین	عاشق۔ گجرات	وحشت۔ ماکلیسر قریب سورت	بہادر
رجبی۔ گجرات	عبدالرحیم۔ قصہ خواں سورت	فہرست شعرا از مخزن شعرا۔	بیتاب
رحمن۔ گجرات	عارف۔ احمد آباد	مولف فائق	بیہوش
رضا۔ گجرات	عزلت۔ سورت	احسن	تجرد
سالس۔ گجرات	غیرت۔ گجرات	احسان	تبسم
سلک۔ متقدمین	فرحت۔ سورت	احمد۔ سید احمد	تسکین
سخنداں۔ گجرات	فیض۔ گجرات	احمد۔ احمد اللہ	ثنار
سجو۔ سورت	فراقی۔ احمد آباد	احمد۔ سید احمد میاں	جولاں
شائق۔ سورت	خفیہ۔ بمبئی	اخلاص	جوش
شرفو۔ کوکنی	تمیز۔ غلام گنج بخش	احقر	حامد
شرفو۔ سورت۔ چابک	قاسم۔ بمبئی	اختر	حجاب
سوار۔	کنتر۔ عبدالحکیم	اخگر	حزیں
شعلہ۔ حسین یاور خاں	کریم	اظہر	حسن
شبیری۔ کرامت علی لکھنوی	لطیف۔ پیر شمس الدین	اضعف	خلیق
شیدا۔ خواجہ سعید بیگ بڑودہ	مطلب۔ گجرات	افروز	خوشتر۔ برہان الدین
شمس۔ حکیم شمس الدین بن عبداللطیف	محمود۔ شیخ محمود	امیر	خوشتر۔ سید قادر میاں
صابر۔ متقدمین	مسکین۔ گجرات	انجم	خوشتر
صوفی۔ متقدمین۔ احمد آباد	ممدوح۔ داماد ملا عبدالغفور	اسحاق	دلکش
ضاحک۔ امیر الدین خلف	(سورت)	باقر	دلبر
نواب معز خان بھروچ	بیندی۔ گجرات	باقی	درویش
طوفان۔ متقدمین۔ سورت	مضطر۔ اورنگ آباد	بخشش	ذاکر

رحمت	علی	لطیف
رسوا	عزلت	مائل
رفعت	عرفی	مجروح
رکھو	علوی	مخلص
زیرک	غالب	محب
سلیمی	غمگین	مسیح
سمجھو	غنی	مرہون
شائق	فاضل	مشتاق۔ محمد حسین
شہ	فائق	مشتاق۔ نجم الدین
شرفو	فدا	ملا فخر الدین
شعلہ	فرحت۔ ابن یاقوت خاں	مقتول
شوق	فرحت	منیر
شیدا	فضل	منظور
شمس	فقیہ	ناداں
صاحب	فہیم	نجف۔ محمد شفیع
صوفی	قطب	نصیری
ضاحک	قطبی	وحشت
طالب۔ محمود بیگ	کاظم۔	وحید
طالب۔ علی اللہ	کامل۔ سید منصور	ولی
ظفر	کامل۔ کمال الدین حسین	ہمرنگ
عابد	کریم	یعقوب
عباس	کمتر	

ہماری مطبوعات

ابتدائی علم شہریت	ایس۔این۔چتوپادھیائے /	4/55
	شریف الحسن نقوی	
اسلامی تہذیب و تمدن	عماد الحسن آزاد فاروقی	14/=
اسلامی سماج	ریوبن لیوی / ڈاکٹر مشیر الحق	60/=
اکبر سے اورنگ زیب تک	ڈبلو ایچ مورلینڈ / جمال محمد صدیقی	21/50
البیرونی کے جغرافیائی نظریات	ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی	11/=
انقلاب ۱۸۵۷ء (تیسری طباعت)	مرتب: پی۔ سی۔ جوشی	75/=
انقلاب فرانس (دوسری طباعت)	جے۔ ایم۔ تھامپسن /	
	ڈاکٹر محمود حسین	140/=
اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء	محمد اطہر علی / امین الدین	28/=
بادشاہ	میکاولی / ڈاکٹر محمود حسین	14/=
برطانیہ کا دستور اور نظام حکومت	محمد محمود فیض آبادی	36/=
تاریخ آصفی	مرزا ابو طالب / ڈاکٹر ثروت علی	10/=
تاریخ اور سماجیات	عائشہ بیگم	10/50
تاریخ تحریک آزادی ہند (حصہ اول)	ڈاکٹر تاراچند / قاضی محمد عدیل عباسی	103/=
(دوسری طباعت)		
تاریخ تحریک آزادی ہند (حصہ دوم)	ڈاکٹر تاراچند / قاضی محمد عدیل عباسی	زیر طبع
تاریخ تحریک آزادی ہند (حصہ سوم)	ڈاکٹر تاراچند / قاضی محمد عدیل عباسی	75/=

تحریک آزادیٔ ہند　ظہور محمد خاں　2/25

تحریک خلافت　قاضی محمد عدیل عباسی　65/=

ہندوستان میں مسلم حکومت کی اساس　اے، بی، ایم، حبیب اللہ / مسعود الحسن　25/=

یورپ کے عظیم سیاسی مفکرین (دوسری طباعت) ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی　89/=

جدید ہندوستان کے معمار　آئی، سی، ایچ، آرر / ڈاکٹر قیام الدین احمد　14/=

جغرافیہ کی ماہیت اور اس کا مقصد　ایس۔ ڈبلیو وولرج / انیس احمد صدیقی　19/=

جدید ہندوستان کے سماجی وسیاسی افکار　ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی　47/=

جنوبی ہند کی تاریخ زمانہ ماقبل تاریخ　آئی۔ سی۔ ایچ۔ آرر　114/=

سے وجیہ نگر کے زوال تک (دوسری طباعت) آر۔ کے۔ بھٹناگر

چولا راجگان　شریمتی / پدمن سیٹھی　60/=

حکومت اور آئین　مترجم ڈاکٹر قیصر شمیم　2/=

حیدر علی (دوسری طباعت)　نریندر کرشن سنہار　72/=

اقتدار حسین صدیقی

خلجی خاندان (دوسری طباعت)　کے۔ ایس۔ لال /　88/=

محمد نسیم مظہر صدیقی

دکن کی قدیم تاریخ　پروفیسر یزدانی　49/=

دکن کے بہمنی سلاطین (تیسری طباعت)　ہارون خاں شیروانی /

رحم علی الہاشمی　88/=

رنجیت سنگھ　نریندر کرشن سنہار / کیلاش چندر چودھری　9/25

ریاست حیدرآباد میں جدوجہد آزادی (۱۸۰۰تا۱۹۰۰)	سید محمد جواد رضوی	20/=
سلاطین دہلی کا سیاسی نظریہ	محمد حبیب ر بیگم افسر عمر سلیم خاں	13/=
سلطنت مغلیہ کا مرکزی نظام حکومت	ابن حسن ر آئی۔اے۔ ظلی	19/=
سویت یونین کا سیاسی نظام	ظفر امام	74/=
سفرنامہ فرنگ مسیر طالبی فی بلاد افرنجی	مرزا ابو طالب اصفہانی ر ثروت علی	32/=
شہیدانِ آزادی (حصہ اوّل)	ڈاکٹر پی۔این۔ چوپڑا ر بھگوت سنگھ	113/=
شہیدانِ آزادی (حصہ دوم)	پی۔این۔ چوپڑا ر سید تفضل حسین	100/=
شیر شاہ سوری اور اس کا عہد	اکار نجن قانون گو ر رام آسرا شرما	135/=
صوبائی خود مختاری کی ابتدا	ایس گوپر ر بشیشور پرشاد	12/50
ظہیر الدین محمد بابر (دوسری طباعت)	ایل۔ایف۔ رش بروک ولیمز ر رفعت بلگرامی	13/=
علی وردی اور اس کا عہد	کالی کنکر دتا ر عبدالاحد خاں خلیل	30/=
قدیم ہندوستان کی تاریخ (دوسری طباعت)	راما شنکر ترپاٹھی	114/=
قدیم ہندوستان میں تعلیم	ڈاکٹر اے۔ایس۔ الٹیکر ر ابو یوسف	35/=
قدیم ہندوستان کی ثقافت و تہذیب تاریخی پس منظر میں (دوسری طباعت)	ڈی۔ڈی کوسمبی ر بال مکند عرش ملسیانی	73/=
قدیم ہندوستان میں شودر (دوسری طباعت)	ڈاکٹر رام سرن شرما ر جمال الدین محمد صدیقی	82/=
مہاتما گاندھی	بی۔ آر۔ نندا ر علی جواد زیدی	60/=
مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال	ڈاکٹر ریاض احمد خاں شیروانی	37/=
مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست (دوسری طباعت)	ڈاکٹر ستیش چندر ر ڈاکٹر قاسم صدیقی	22/=

مغلوں کا نظام مال گزاری (۱۷۰۰ء سے ۱۷۵۰ء تک)	نعمان احمد صدیقی / ایس۔ نبی ہادی	9/=
مراد آباد۔ تاریخ اور صنعت	تاباں نقوی	12/=
منتخب دساتیر کا تقابلی مطالعہ	شجاع الدین فاروقی	65/=
ناوابستگی	پروفیسر رشید الدین خاں / ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ مہدی	37/=
وادیٔ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں (دوسری طباعت)	سر مور / زبیر رضوی	45/=
وجے نگر کے عہد میں نظام حکومت اور سماجی زندگی	ٹی۔ وی مہالنگم / پروفیسر کے۔ نیل کنٹھ شاستری	41/=
ہمایوں نامہ	گلبدن بیگم / عثمان حیدر مرزا	11/=
ہندوستانی سرزمین اور عوام	نارائن گپتا / ایس۔ کے۔ سنگھ	2/=
ہندوستان کا شاندار ماضی (دوسری طباعت)	اے۔ ایل۔ باشم / ایس۔ غلام سمنانی	145/=
ہندوستان کے دورِ وسطیٰ کے مؤرخین	پروفیسر محب الحسن / مسرور علی ہاشمی	45/=
ہندوستانی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	بمل پرساد / محمد محمود فیض	12/25
ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج	ڈاکٹر رفیق زکریا	46/=
ہندوستانی کتبوں کا مطالعہ	ڈی۔ سی۔ سرکار / ملیحہ سمیع الزماں	49/=
ہندوستانی مصوری ایک خاکہ (دوسری طباعت)	انیس فاروقی	130/=
ہندوستانی مصوری عہد مغلیہ میں (دوسری طباعت)	پرسی براؤن / عبید الحق	158/=
ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں (دوسری طباعت)	کنور محمد اشرف / قمر الدین	20/=

Price Rs. 77/-

Printed at : **MAKOFF PRINTERS**
2879, Bulbuli Khanna, Turkman Gate, Delhi-6
Phone : 3288967, 3256407